اقبال

کے

محبوب صوفیہ

اعجاز الحق قدوسی

اقبال اکادمی پاکستان

حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ

کے نام

فہرست مضامین

اقبال کے محبوب صوفیہ رح

نمبر سلسلہ	عنوان	صفحہ
	(۲۵)	
۲۵۷	حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ	۳۶۳
۲۵۸	حضرت شیخ کی عظمت علامہ اقبال کی نظر میں	۳۶۴
۲۵۹	حضرت شیخ کی خود اپنے قول کے متعلق تشریح	۳۶۶
۲۶۰	حالات	۳۶۸
۲۶۱	خاندان شیخ عبدالقدوس کی ردولی میں سکونت	۳۷۲
۲۶۲	حضرت شیخ کے جد امجد	۳۷۲
۲۶۳	شیخ محمد اسماعیل	۳۷۶
۲۶۴	حضرت شیخ کی ولادت	۳۷۸
۲۶۵	دور طالب علمی کی تصانیف	۳۷۹
۲۶۶	جذبۂ عشق ربانی	۳۷۹
۲۶۷	شرح عوارف	۳۸۲
۲۶۸	بیعت	۳۸۳
۲۶۹	عبادات	۳۹۱
۲۷۰	شادی	۳۹۵
۲۷۱	معیشت	۳۹۶
۲۷۲	خلافت سے سرفرازی	۳۹۶
۲۷۳	ردولی سے ہجرت	۳۹۷
۲۷۴	شیخ محمد کی وفات	۳۹۹
۲۷۵	گنگوہ میں آمد	۴۰۰
۲۷۶	بابر اور ابراہیم لودہی کی جنگ	۴۰۱
۲۷۷	حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی پانی پت کے میدان جنگ میں	۴۰۱

ھ

پیش لفظ

اسلامی تصوف کے ماضی کی تاریخ پر اگر وسیع نظر ڈالی جائے تو ہماری نگاہ پہلی صدی ہجری کے نصف اواخر سے آگے نہیں بڑھتی، تاریخ شاہد ہے کہ جب بنی امیہ کے مظالم حد سے زیادہ بڑھے، اور زیاد و حجاج بن یوسف جیسے ظالم پیدا ہوئے جن کے مظالم سے لوگ تنگ آچکے تھے، اور اموی دور کے دوسرے گورنر ملک کو ظلم و ستم کی آماجگاہ بنائے ہوئے تھے، تو اس ظلم و ستم کے رد عمل میں پہلی صدی ہجری کے نصف آواخر میں صوفیائے کرام کا پہلا طبقہ وجود میں آیا یہ وہ وقت تھا کہ ظلم اپنے انتہائی نقطۂ عروج پر پہنچ چکا تھا، انصاف پسند طبیعتیں ان مظالم کو دیکھ کر کانپ کانپ اٹھتی تھیں۔ ہشام بن حکیم بن حزام نے ایک مرتبہ شام کے نبطیوں کو دیکھا کہ انہیں جزیہ ادا نہ کرنے کے جرم میں چلچلاتی دہوپ میں کھڑا کیا گیا ہے وہ اس تکلیف دہ منظر کو برداشت نہ کر سکے اور بے اختیار پکار اٹھے: میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا، آپ فرماتے تھے کہ خدا ان لوگوں کو عذاب دے گا۔ جو دنیا میں لوگوں کو عذاب دیتے ہیں، حجاج بن یوسف جس کے متعلق حضرت عمر بن عبدالعزیز فرمایا کرتے تھے کہ اگر دنیا کے تمام ظالموں کو ایک پلڑے میں رکھا جائے، اور حجاج بن یوسف کو دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو مظالم میں ہمارے زمانے کے ظالم حجاج بن یوسف کے ظلم کا پلڑا جھک جائے گا۔ خواجہ حسن بصری جو طبقۂ اول کے صوفیہ میں بڑے نامور صوفی شمار ہوتے ہیں وہ گیارہ سال تک حجاج کے مظالم کو دیکھ کر

گوشہ گیر رہے - یہاں تک کہ جب اُس کی موت کی خبر سنی تو سجدے میں گر کر کہا کہ : اے اللہ ! میں تجھ سے ڈرتا ہوں اور اُس سے ڈرتا ہوں جو تجھ سے نہیں ڈرتا -

وسط ایشیا میں گو مسلمانوں کی فتوحات کا سیلاب آیا ہوا تھا ، لیکن ان فتوحات میں روح جہاد گم ہو چکی تھی ، ان فتوحات میں رضائے الٰہی کا جذبہ کم اور شان و شکوہ اور اقتدار کی ہوس نمایاں طور پر نظر آتی تھی ، خدا کے خاص بندے جنھوں نے غزوات نبوی ؐ کو دیکھا تھا اور اُن کی روح کو سمجھا تھا ، جب وہ ان فتوحات اور ان جنگوں کو دیکھتے جن کا مقصد سوائے حشمت و شوکت اور اقتدار کے کچھ نہ تھا تو اس انقلاب کو دیکھ کر جو مسلمانوں کی طبیعت میں آیا تھا ، انتہائی تکلیف محسوس کرتے تھے - ان حقیقت پسندوں نے مسلمانوں کی فلاح اس میں دیکھی کہ وہ حکومت وقت سے قطع تعلق کر کے عبادت الٰہی ، توبہ و استغفار میں مشغول ہو جائیں - الغرض اس طرح صوفیہ کا پہلا طبقہ وجود میں آیا - طبقہ اول کے صوفیہ میں حضرت حسن بصری ، حبیب عجمی ، حضرت فضیل بن عیاض اور حضرت ابراہیم ادہم خاص طور پر مشہور ہیں ، طبقہ اول کے صوفیہ کا دور ۶۶۱ء سے ۸۵۰ء تک ہے -

طبقہ اول کے صوفیہ نے اپنے اس جذبے کو تحریک کی صورت نہیں دی ، بلکہ وہ انفرادی طور پر گوشہ گیر ہو کر محض عبادت الٰہی اور توبہ و استغفار میں مشغول ہو گئے ، اور اس دور سیاست کو نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے -

طبقہ اول کے صوفیہ کے کارناموں پر اگر ہم غور کریں تو یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ انھوں نے حکومت سے علیحدگی اختیار کر کے اپنی بیزاری سے حکومت کے غلط رویوں کا آئے

احساس دلایا ۔ اور رفتہ رفتہ اپنی اخلاقی اور روحانی قوت سے اور اپنے مثبت رویوں سے عوام میں اس قدر مقبولیت حاصل کر لی کہ فرمانرواؤں کی طاقت ان کے سامنے ہیچ ہو کر رہ گئی، یہاں تک کہ وہ پہلی صدی ہجری ہی میں ایک ناقابلِ تسخیر طاقت بن گئے۔

چنانچہ جب کبھی ان کو موقع ملتا تو وہ خلفاء کو ان کی بے راہ روی پر برملا ٹوکتے، اور حق گوئی میں کسی چیز کی پروا نہ کرتے تھے۔ امام ابو حنیفہ، امام سفیان ثوری، حضرت فضیل بن عیاض، خواجہ حبیب عجمی اور حضرت ابراہیم ادہم اس دور کی وہ شخصیتیں ہیں کہ جنھوں نے خلفاء کو ان کے غلط رویوں پر سختی سے متنبّہ کیا۔

زمانے نے ایک اور کروٹ لی، بنو امیّہ کا دور ختم ہو کر بنو عباس کی حکومت کی داغ بیل پڑی، عباسیوں کے عہد میں یونانی علوم و فنون مسلمانوں کی توجہ کا مرکز بنے۔ عباسی خلیفہ مامون نے فلسفہ و حکمت کو عربی میں منتقل کر کے، فکر کے لیے نئی راہیں ہموار کیں۔ ان علوم کی وجہ سے عقل نے بے لگام ہو کر مذہب سے بغاوت کی، اسلامی عقائد و فکر کو دھچکا لگا۔ اسلامی پختگیِ فکر، شک اور انکار میں تبدیل ہونے لگی، اسلامی فکر و نظر سے ہٹ کر طرح طرح سے قرآنی آیات کی تاویلات کی جانے لگیں، مذہب کو عقل کا یہاں تک تابع بنایا گیا کہ عقلیت کے اس طوفان میں لوگ مذہب سے بے تعلق ہونے لگے۔

عقلیت کے اس سیلابی دور میں صوفیائے کرام کا دوسرا طبقہ وجود میں آیا۔ اس دور کے صوفیہ میں حضرت بایزید بسطامی، حضرت معروف کرخی، شیخ فرید الدین عطار، حضرت ذوالنّون مصری، حضرت جنید بغدادی وغیرہ مشہور ہیں۔ ان بزرگوں نے عقلیت کے

اِس طوفان کے عوامل و محرکات کا جائزہ لے کر عقل کے اِن اندھیروں میں عشق الٰہی کا چراغ روشن کر کے عقل گزیدہ انسانوں کو یقین و ایمان کی قوت عطا کی۔ اِس دور کے صوفیہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تعلیمات میں سب سے زیادہ عشق الٰہی پر زور دے کر تشکک و انکار کے دھارے کے رخ کو موڑ کر اسلامی عقائد و فکر کو مستحکم کیا ہے۔

فقہ کی تدوین کے بعد صوفیہ کا تیسرا طبقہ وجود میں آیا۔ یہ وہ دور تھا کہ عوام نے مجتہدین کرام کے فقہ کو آخری درجہ دے کر اجتہاد کے دروازے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کردیا تھا، وہ اِس حقیقت کو فراموش کر چکے تھے کہ دنیا جس قدر آگے بڑھتی جائے گی، اُسی قدر نئے مسائل پیدا ہوتے جائیں گے اور وہ اپنے حل کا مطالبہ کریں گے، لیکن کوئی بھی اس دور میں اِس حقیقت پر غور نہ کرتا تھا۔ اِس پر مزید ستم یہ کیا گیا کہ فقہی مسائل کو اپنی خواہشات کے مطابق ڈھال کر ان میں نئی نئی تاویلات کی گئیں، اور فقہ میں حیل کی بنیاد پڑی۔

تیسرے طبقے کے صوفیہ نے اِس خرابی کو شدت سے محسوس کیا، انھوں نے عمل و فکر کو ہم آہنگ کر کے عوام کے داخلی اور خارجی مسائل کو سمجھ کر اسلام، انسانیت اور سلامتی کا درس دیا۔ اِسی کے ساتھ تزکیہ باطن کی طرف خاص توجہ دی، اور عوام میں اخلاقی قدروں کا شعور بیدار کیا، اور ساتھ ہی تصوف میں تالیف و تصنیف کے دریچوں کو کھولا۔

دسویں صدی عیسوی میں تصوف نے باقاعدہ ایک تحریک کی شکل اختیار کی۔ اِسی صدی میں تصوف کی بعض اصطلاحیں ایجاد ہوئیں، اور تصوف کے موضوع پر باقاعدہ کتابیں لکھی گئیں۔

گیارہویں صدی عیسوی میں تصوف کا آفتاب نصف النہار پر پہنچ گیا ، اس دور کے مشائخ میں شیخ ابو القاسم قشیری ، حضرت داتا گنج بخش ، خواجہ عبد اللہ انصاری ، سلطان ابو سعید ابو الخیر وغیرہ وہ اکابر صوفیہ ہیں ، جنھوں نے اسلامی فن تصوف اور تعلیمات تصوف کو مستقل موضوع بنا کر کتابیں لکھیں۔ حضرت داتا گنج بخش نے اپنی مشہور تصنیف کشف المحجوب اسی زمانے میں پاکستان کے قدیم اور مشہور شہر لاہور میں لکھی ، جس کا شمار تصوف کی اعلیٰ ترین کتابوں میں ہوتا ہے ، یہ کتاب اسلامی تصوف کو ہمہ گیر اور مقبول بنانے میں بہت مد و معاون ثابت ہوئی ، بعض بزرگوں نے تو اس کی ہمہ گیری ، مقبولیت اور افادیت کو دیکھتے ہوئے یہاں تک لکھا کہ ”جس کا کوئی پیر نہ ہو ، اس کے لیے کشف المحجوب کافی ہے“۔ چنانچہ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس دور کے صوفیہ نے طریقت کو شریعت کے آئینے میں پیش کر کے علماء کے لیے تصوف میں بڑی کشش پیدا کردی۔

بارہویں صدی عیسوی کے صوفیائے کرام نے اسلامی تصوف کو فلسفے کی شکل دی۔ اسی زمانے میں تصوف کے بعض اہم سلسلوں کی بنیاد پڑی۔ اسی صدی میں امام غزالی نے اپنی معرکتہ الآراء کتاب ”احیاء العلوم“ لکھ کر گلشن تصوف اور اخلاق محمدی کی آبیاری کی۔

اسی صدی میں حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ نے بغداد میں مسند رشد و ہدایت کو زینت بخشی ، آپ کی تصانیف میں فتوح الغیب ، فتح ربانی ، غنیۃ الطالبین اور فیوضات ربانیہ رہروان راہ طریقت کے لیے راہ نما ہیں۔

اسی صدی میں حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردی جیسے عظیم المرتبت صوفی پیدا ہوئے۔

تیرہویں صدی عیسوی میں اسلامی تصوف کی تحریک عالمگیر بن چکی تھی ، اس صدی میں باقاعدہ تصوف کے سلسلے قائم ہوئے ، ساتھ ہی جابجا صوفیائے کرام نے اپنی خانقاہیں قائم کر کے رشد و ہدایت کے چراغ روشن کیے۔

یہ ہے اسلامی تصوف کی اجمالی تاریخ، جسے میں نے "تاریخ مشائخ چشت" سے اختصار کے ساتھ اس لیے پیش کر دیا ہے کہ اس سے اسلامی تصوف کے ارتقا کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

شاعر مشرق علامہ اقبال کے متعلق بعض حلقوں میں اس خیال کا اظہار کیا جاتا ہے کہ وہ تصوف کے مخالف تھے ، اس غلط فہمی کی بنیاد در اصل اس پر مبنی ہے کہ علامہ نے جا بجا اپنی نظم و نثر میں اس تصوف کی مخالفت کی ہے کہ جس کا سرچشمہ قرآن و حدیث نہیں۔ وہ دراصل مسخ شدہ تصوف اور صوفیائے خام کے خلاف تھے ، وہ اس تصوف کے مخالف تھے جس کا خمیر عجمی خیالات و فلسفے کی آمیزش سے تیار کیا گیا تھا ، اور جس نے خالص اسلامی تصوف کے سرچشموں کو گدلا کر دیا تھا ، انھوں نے شیخ محی الدین ابن عربی اور حافظ شیرازی کی اس لیے مخالفت کی کہ ان کے مخلصانہ خیال کے مطابق اول الذکر نے مسئلۂ وحدت الوجود کو فلسفے کی شکل دے کر اسلامی تصوف کا ایک جزو بنا یا ، اور ان کے اس نظریے کی دل آویزی نے مسلمانوں کے دل و دماغ پر اتنا گہرا اثر ڈالا کہ حضرت مجدد الف ثانی سے پہلے تک اکثر اکابر صوفیہ اس نظریے کی رنگینیوں میں گم ہو کر اس سے متاثر رہے۔ شیخ ابن عربی کے فکر رسا نے اس نظریے کو وہ رعنائی اور توانائی بخشی تھی کہ کسی کو اس کے خلاف مجال سخن نہ تھی لیکن شیخ ابن عربی اپنی تصانیف میں اس پر مصر ہیں کہ وحدت الوجود کی بنیاد اسلامی تعلیمات پر ہے انھوں نے اپنے اس دعوی کے ثبوت میں قرآن و حدیث سے متعدد دلائل پیش کیے ہیں ، ان کے ہمعصر اور بعد کے صوفیہ نے ان کے اس نظریے کو نہ صرف قبول کیا،

بلکہ اپنی تعلیمات کا جزو بنا لیا ۔ پھر عربی ، فارسی اور اردو کے نامور صوفی شعراء نے اس فلسفے کو اپنایا ، ان کے شاعرانہ تخیل نے اس فلسفے کو شعر کے سانچے میں ڈھال کر نت نئے گل کھلائے ، عراقی نے سب سے پہلے لمعات میں جو نظم و نثر میں ہے اس فکر کو شعر کے قالب میں ڈھالا ، پھر آخر الذکر حافظ شیرازی نے اپنی شیریں نوائی اور سحر بیانی سے غزل کے روپ میں اس کو دو آتشہ کردیا ، اور بقول علامہ اقبال یہ فلسفہ اس قدر سکر آلود اور خواب آور تھا کہ اس نے مسلمانوں کی زندگی پر نہایت ہی ناخوشگوار اثر ڈالا ، خودی کی نفی نے ذوق عمل اور جد وجہد کی رفتار کو مفقود کردیا ۔ عمل محکم اور سعی پیهم کا تصور ایک خواب و خیال ہو کر رہ گیا ۔ پھر رندی و سرمستی کی تلقین نے جزا و سزا کے تصور کو مضمحل کر دیا بہر حال دونوں خیالات کے بزرگ اپنے پاس دلائل و براہین رکھتے ہیں ۔

علامہ اقبال نظریہ وحدت الوجود کا ماخذ افلاطون کے نظریہ تصورات کو بتاتے ہیں جس کو صوفیہ اعیان ثابتہ سے تعبیر کرتے ہیں ، اور اس نظریے کو مسلک گو سفندی سے تعبیر کرتے ہیں ، اور اس نظریے سے دور رہنے کی تلقین کرتے ہیں وہ افلاطون کے اس فلسفے پر محاکاتی رنگ میں تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں :

راہب دیرینہ افلاطون حکیم
از گروہ گو سفندان قدیم

(۱) افلاطون : ۴۲۷ ق ۔ م میں ایتھنس کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوا ۔ ابتدائی تعلیم کرٹیلاس سے حاصل کی ، پھر سقراط کا شاگرد ہوا ، جس کے نظریات نے اس پر نہایت گہرا اثر ڈالا ، اس کے علاوہ فیثا غورث اور اس کے متبعین کے ان نظریات نے جن کا تعلق ریاضی سے تھا ، اسے بے حد متاثر کیا ، وہ اپنے مرنے تک فلسفے کی تعلیم دیتا رہا افلاطون نے ہی تصورات کا نظریہ پیش کیا تھا ۔

رخش او در ظلمتِ معقول گم
در کہستانِ وجود افگندہ سُم
آنچناں افسونِ نا محسوس خورد
اعتبار از دست و چشم و گوش برد
گفت سرّ زندگی در مُردن است
شمع را صد جلوہ از افسردن است
بر تخیل ہائے ما فرمانروا ست
جامِ او خواب آور و گیتی ربا است
گوسفندی در لباسِ آدم است
حکمِ او بر جانِ صوفی محکم است
فکرِ افلاطون زیاں را سود گفت
حکمتِ او بود را نا بود گفت
منکرِ ہنگامۂ موجود گشت
خالقِ اعیانِ نامشہود گشت
زندہ جاں را عالمِ امکاں خوش است
مُردہ دل را عالمِ اعیاں خوش است
آہوش بے بہرہ از لطفِ خرام
لذّتِ گفتار بر کبکش حرام
قوم ہا از سکر او مسموم گشت
خفت ، از ذوقِ عمل محروم گشت (۱)

---

(۱) کلیاتِ اقبال فارسی (اسرار و رموز - ص ۳۲)

اس حکایت میں علامہ اقبال نے نہایت خلوص سے آن صوفیہ پر تنقید کی ہے کہ جنھوں نے افلاطون کے اس فلسفے کو روح اسلام سے بے نیاز ہو کر اپنایا ، پھر اس کو اس دلکش انداز میں پیش کیا کہ وہ بادی النظر میں عین اسلامی تعلیمات کے مطابق نظر آنے لگا ۔

اسی لیے انھوں نے شیخ محی الدین ابن عربی پر محض اس مسئلہ وحدۃ الوجود کی بنا پر سخت تنقید کی ہے ، ورنہ وہ آن کی صوفیانہ عظمت کے قائل تھے ، اور بقول سید عابد علی عابد مرحوم ؛ آنھوں نے ایران کے مابعد الطبعیات اور اپنے خطبات میں ابن عربی سے استفادہ بھی کیا تھا ۔

حافظ شیرازی کی مخالفت کی بنیاد بھی یہی مسئلہ وحدت الوجود تھا ، شیخ ابن عربی کے نزدیک وحدت الوجود کا ماحصل یہ ہے کہ وجود صرف واحد کا ہے ، دنیا و مافیہا کا کوئی وجود نہیں ، ظاہرا ہمیں جو کچھ نظر آتا ہے وہ فریب نظر ہے ، وجود صرف خدا کا ہے ، باقی ہیچ ہے ، حافظ نے اس فلسفے کو عجب بو قلمونیوں کے ساتھ ایسے انداز میں پیش کیا کہ دلوں میں آتار دیا ۔ حافظ نے وحدۃ الوجود کے فلسفے کو جو دل آویزی بخشی ہے ، اس کے چند نمونے ہم یہاں پیش کرتے ہیں ، فرماتے ہیں :

نہ بندی زاں میاں طرفی کمروار
اگر خود را بہ بینی درمیانہ

ندیم و مطرب و ساقی ہمہ اوست
خیال آب و گل در رہ بہانہ

وجود ما معمائیست ''حافظ''
کہ تحقیقش فسون است و فسانہ

حافظ خودی کے تصور کی اپنے اشعار میں نفی کرتے ہوئے کہتے ہیں :

فکر خود و رائے خود در عالم رندی نیست
کفر ست دریں مذہب خود بینی و خود رائی

تا فضل و عقل بینی بے معرفت نشینی
یک نکتہ ات بگویم خود را مبیں کہ رستی

علامہ اقبال نے ان مضر اثرات کو دیکھ کر جو ان کی رائے میں نظریہ وحدت الوجود سے معاشرے میں مرتب ہو رہے تھے، ان بزرگوں کے بعض نظریوں کی مخالفت کی تھی، وہ صوفیائے خام اور رسمی تصوف کے بھی خلاف تھے، چنانچہ ایک خط میں حضرت اکبر الہ آبادی کو لکھتے ہیں:

یہاں لاہور میں ضروریات اسلامی سے ایک متنفس بھی آگاہ نہیں... صوفیہ کی دکانیں ہیں مگر وہاں سیرت اسلامی کی متاع نہیں بکتی۔[1]

لیکن جہاں تک خالص اسلامی تصوف کا تعلق ہے، وہ نہ صرف اسلامی تصوف کے قائل تھے، بلکہ وہ خود سلسلہ قادریہ میں بیعت تھے، اور ان صوفیائے کرام سے والہانہ عقیدت و شیفتگی رکھتے تھے، جنھوں نے اسلامی تصوف کو اپنے حکیمانہ نظریات سے پروان چڑھایا۔ وہ شریعت کے آئینے میں حقیقت کا جمال دیکھنا چاہتے تھے۔ اور جس آئینہ گر کے آئینے میں یہ جمال ہم آہنگ ہو کر نظر آجاتا، علامہ اس کے والہ و شیدا ہو جاتے، ان صوفیائے کرام میں وہ ان صوفیہ کے بے حد مداح و معترف ہیں جنھوں نے ملت اسلامیہ کے جسد میں نئی روح پھونکی، اور زوال و انحطاط کے دور میں احیائے دین کے نئے راستے تلاش کیے، اور مسلمانوں کی دینی اور سماجی زندگی کو آراستہ کرنے میں عظیم الشان کارنامے انجام دیے۔ جب کبھی امت مسلمہ پر کوئی نازک وقت آیا، انھوں نے بصیرت اور حکمت کے ساتھ نامساعد حالات کا مقابلہ کیا، اور اسلامی

(۱) اقبال نامہ حصہ دوم، ص ۴۸

معاشرے کا صحیح مزاج قائم رکھنے کے لیے انتھک کوششیں کیں ۔ علامہ اقبال نے اپنے شعری اور نثری مجموعوں میں ان کے ناموں کے ساتھ ان کی بارگاہ عالی مرتبت میں خراج عقیدت پیش کر کے ان صوفیائے کرام اور بزرگان عظام کی نشان دہی کی تھی جن سے وہ بہت زیادہ متاثر ہوئے ہیں ، اور جن کی کوششوں نے اسلامی روح ، اسلامی فکر ، اسلامی کردار اور اسلامی سرمایۂ زندگی کو تباہ ہونے سے بچا لیا ۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ وہ شریعت اور طریقت کو ہم آہنگ کر کے اپنی تبلیغی جد وجہد اور روحانی تصرف سے انسانی قلوب پر اثر انداز ہوئے ، اور دنیا کی کایا پلٹ کر رکھ دی ۔

علامہ اقبال کے ان محبوب صوفیائے کرام کی عظمت کا تقاضا تھا کہ ان صوفیائے کرام کا ایک مستقل تذکرہ لکھا جائے ، چونکہ اقبال کے موضوعات میں ابھی تک اس موضوع پر کوئی کام نہیں ہوا تھا ، خدا کا شکر ہے کہ یہ سعادت بھی میرا مقدر ہوئی ۔ آج میں "اقبال کے محبوب صوفیہ" کے نام سے اس تذکرے کو پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں ۔

میں نے اس تذکرے کی تالیف میں کوشش کی ہے کہ ہر بزرگ کے حالات زندگی ، ان کی تبلیغی اور اصلاحی جدوجہد ، ان کی سیرت و اخلاق کے مختلف پہلو، ان کی علمی و دینی خدمات، ان کی تصانیف ، ان کے دور کے وہ عوامل و محرکات جن میں انھوں نے اپنی شمع ہدایت روشن کی ، تفصیل سے آجائیں ، خاص طور پر ان فلسفے یا واقعہ کو جس کی بنا پر علامہ اقبال ان سے متاثر ہوئے ہیں وضاحت سے پیش کیا ہے ۔

میرا خیال ہے کہ اسلامی تصوف کی تعلیمات عقلیت پر مبنی ہونے کے ساتھ ساتھ انسانی نقطۂ نگاہ رکھتی ہیں، ان کا رخ کائنات کی طرف ہے ۔ اور صوفیہ کا پیام آفاقی ہے ، صوفیہ عوام کی مادی ،

روحانی اور ثقافتی بہبود کے لیے ایک اور ایسے نئے معاشرے کی تشکیل چاہتے تھے، جس میں طبقاتی تفاوت، سماجی برائیاں ختم ہوں، مساوات اسلامی کا آفتاب جلوہ گر ہو، اور معاشرے کے ہر فرد کو راحت و سکون میسر ہو، میں نے اسی مقصد کے پیش نظر یہ کتاب لکھی ہے، اور تاریخ و تحقیق کی روشنی میں ان بزرگوں کی تعلیمات کو پیش کیا ہے جو گفتار و کردار، فکرو عمل میں حق پرستی اور سچائی کے علمبردار تھے۔

افادیت اور استناد کے لحاظ سے مآخذ کے حوالے ذیلی حواشی میں دے دیے گئے ہیں، اور مزید معلوماتی اور ضروری حواشی کا اضافہ کتاب کے مناسب اور ضروری مواقع پر کردیا گیا ہے۔ کتاب کی ترتیب صوفیائے کرام کے سنہ وفات کے لحاظ سے رکھی گئی ہے۔

میں جناب محترم سید عبدالواحد صاحب معینی، نائب صدر اقبال اکادمی اور جناب ڈاکٹر محمد معزالدین صاحب، ڈائرکٹر اقبال اکادمی کا بھی سپاس گزار ہوں کہ ان دونوں حضرات کی قدر افزائیوں کی بدولت یہ کتاب منظر عام پر آسکی۔ ورنہ خدا جانے کب تک یہ مسودہ معرض تاخیر میں پڑا رہتا۔

آخر میں میری دعا ہے کہ خدائے تعالیٰ میری اس تالیف کو حسن قبول سے نوازے۔ آمین!

اعجاز الحق قدوسی
۱۲ ربیع الاول ۱۳۹۵ھ مطابق
۲۶ مارچ ۱۹۷۵ء

قدوسی منزل ۵/۲۵۷
لیاقت آباد
کراچی - ۱۹

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱

حضرت علی کرم اللہ وجہہ

بارگاہِ امام المتقین میں علامہ اقبال کا خراجِ عقیدت

باب مدینۃ العلم و العرفان ، امام المتقین حضرت علی کرم اللہ وجہہ سرخیل صوفیائے کرام ہیں ۔ طریقت کے بہت سے سلسلے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے شروع ہوتے ہیں ۔ تمام مسلمان اور صوفیائے کرام حضرت علیؓ کی محبت اور ان کی عقیدت کو اپنا ایمان سمجھتے ہیں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی محبت اور عقیدت کے بغیر کسی صوفی پر علم و عرفان کے دروازے نہیں کھل سکتے ۔

علامہ اقبال نے ''اسرار و رموز'' میں جس سوز و گداز سے حضرت علیؓ کی بارگاہ میں اپنا ہدیۂ عقیدت پیش کیا ہے ۔ اور ان کی عظمت بے پایاں اور جلالتِ شان کی نشان دہی کی ہے۔ اس نظم کا ایک ایک شعر ایمان افزا اور سرمایۂ بصیرت ہے ۔ اور ایک قاری کو ان کی یہ نظم بے حد متاثر کرتی ہے ۔ فرماتے ہیں :

مسلمِ اول شہِ مرداں علیؓ — عشق را سرمایۂ ایمان علیؓ
از ولائے دودمانش زندہ ام — در جہاں مثلِ گہر تابندہ ام

زمزم ار جوشد زخاکِ من ازوست | مے اگر ریزد زتاکِ من ازوست
مرسلِ حق کرد نامش بوتراب | حق یداللہ خواند در اُم الکتاب
ہرکہ دانائے رموزِ زندگی ست | سِرِّ اسمائے علی داند کہ چیست
ذاتِ او دروازۂ شہرِ علوم | زیر فرمانش حجاز و چین و روم

حالات :

آپ کا اسم گرامی علی ، ابوالحسن اور ابو تراب کنیت ، حیدر لقب ، آپ کے والد کا نام جناب ابو طالب ، اور والدہ کا نام فاطمہ تھا۔ حضرت علیؓ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا زاد بھائی تھے ، حضرت علیؓ ، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے دس برس پہلے پیدا ہوئے ، حضرت ابو طالب چونکہ کثیر العیال تھے ، اس لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کی کفالت اپنے ذمے لے لی تھی ، اس لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی بچپن سے حضرت علیؓ کی تربیت فرمائی [1]۔

اسلام:

حضرت علیؓ نے دس سال کی عمر میں اسلام قبول کیا ، اور وہ بچوں میں سب سے پہلے ایمان لائے [2]۔

اسلام قبول کرنے کے بعد حضرت علیؓ تیرہ سال مکۂ معظمہ میں رہے ، چونکہ وہ رات دن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتے تھے ، اس لیے مشوروں کی مجلسوں میں ، تعلیم و ارشاد کے مجمعوں میں ، معبود حقیقی کی عبادت و پرستش میں وہ ہر وقت آپ کے ساتھ موجود رہتے تھے۔

---

(۱) زرقانی ، جلد ، ۱ : ص ۲۸۰ (۲) اسدالغابہ ، تذکرہ حضرت علیؓ

ھجرت :

جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کا حکم ملا ، اور کفار نے عزم کیا کہ وہ نعوذ باللہ رسول اکرم صلی اللہ وسلم کو قتل کردیں تو ہجرت کے لیے روانہ ہونے سے قبل آپ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ وہ آپ کی جگہ آپ کے بستر مبارک پر استراحت کریں، اس وقت حضرت علیؓ کی عمر زیادہ سے زیادہ بائیس تیئیس برس کی تھی یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس بستر پر ایک قتل ہونے والا ہے " حضرت علیؓ کی فدویت و جاں نثاری کا یہ عالم تھا کہ آپ اسی بستر پر سوئے" کفار کو جب یہ معلوم ہوا کہ آپ تشریف لے جاچکے ہیں اور حضرت علیؓ آپ کے بستر پر آرام فرما ہیں تو اپنی غفلت پر سخت برہم ہوئے ، اور حضرت علیؓ کو چھوڑ کر آپ کی تلاش میں سرگرداں پھرنے لگے، تین چار روز کے بعد حضرت علیؓ بھی اُن تمام امانتوں کو اُن مالکوں کو واپس کرکے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھیں ہجرت فرما کر مدینہٴ منورہ تشریف لے گئے[1] ۔

حضرت فاطمہ سے نکاح :

سنہ ۲ ہجری کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو اپنی دامادی کا شرف بخشا اور اپنی محبوب صاحبزادی خاتون جنت حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت علیؓ سے کردیا ۔

غزوات :

حضرت علی کرم اللہ وجہہ اُن تمام غزوات میں شریک رہے ، جو رسول اکرم صلی اللہ وسلم کے زمانے میں پیش آئے ، اور ہر غزوے میں شجاعت و بہادری کے جوہر دکھائے ۔ غزوہٴ بدر ، غزوہٴ اُحد ،

---

(۱) مستدرک حاکم جلد ۳ ص ۱۴ ۔

غزوہ خندق ، فتح مکہ اور دوسرے تمام معرکوں میں شیرِ خدا نے دشمنوں کی صفیں کی صفیں آلٹ دیں ، اور ذوالفقار حیدری نے اپنی شجاعت کا لوہا دشمنانِ اسلام سے منوایا۔

خیبر کے معرکے میں جب وہ کسی سے فتح نہ ہوسکا تو آپ نے حضرت علیؓ کو سپہ سالار مقرر فرمایا۔ اور خیبر آپ کے ہاتھوں فتح ہوا ، اور یہودیوں کا سردار مرحب آپ کے ہاتھ سے مارا گیا۔

حجۃ الوداع :

سنہ ۱۰ ہجری میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری حج کیا۔ یہ حج ، حجۃ الوداع کہلاتا ہے ، حضرت علیؓ اس حج میں شریک تھے۔

خلافت :

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ مسلمانوں کے خلیفہ منتخب ہوئے ، سوا دو برس کی خلافت کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے وفات پائی۔ اور حضرت عمر فاروقؓ مسند آرائے خلافتِ راشدہ ہوئے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے بعد حضرت عثمانؓ نے مسندِ خلافت کو زینت بخشی۔

حضرت علیؓ کی خلافت :

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ مسند آرائے خلافت راشدہ ہوئے ، ۱۲ رجب سنہ ۲۹ھ (۶۵۹ع) کو بعض وجوہ کی بنا پر آپ نے کوفے میں اقامت اختیار کی۔ اور اس طرح دارالحکومت مدینے سے عراق منتقل ہو گیا۔

شہادت :

۲۰ رمضان ۴۰ھ (۶۶۱ع) میں ابن ملجم نے صبح کی نماز کے وقت عین نماز کی حالت میں حضرت علیؓ کو شہید کردیا ، اور یہ فضل و کمال ، رشد و ہدایت کا آفتاب غروب ہو گیا ۔

فضل و کمال :

حضرت علیؓ کی فضل و کمال کی سب سے بڑی بنیاد یہ ہے کہ انھوں نے بچپن ہی سے درسگاہِ رسالت میں تعلیم و تربیت حاصل کی ۔ اس لیے انھوں نے بارگاہِ رسالت میں تعلیم و تربیت پا کر غیر معمولی تجربہ اور فضل و کمال حاصل کیا ۔ آپ کو دربارِ رسالت سے انامدینۃالعلم وعلی بابہا (میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں) کا شرفِ امتیاز بخشا گیا ۔

حضرت علیؓ کو علوم قرآن و تفسیر ، علم ناسخ و منسوخ ، علم حدیث ، فقہ و اجتہاد میں غیر معمولی تبحر اور کمال حاصل تھا ، قضا اور فیصلے میں بھی آپ کی افضلیت اور صلاحیت کو اکابر صحابہؓ تسلیم کرتے تھے ۔ علم اسرار و حکمت میں بھی آپ کو یدطولیٰ حاصل تھا تقریر و خطابت میں بھی آپ غیر معمولی ملکہ رکھتے تھے ، علم نحو کی بنیاد آپ نے رکھی ۔ وہ اُن صحابہ کرامؓ میں تھے جنھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں ہی پورا قرآن زبانی یاد کرلیا تھا ، نہ صرف لفظی طور سے آپ اس کے حافظ تھے ، بلکہ اس کی ایک ایک آیت اور شانِ نزول سے واقف تھے ، طبقات ابن سعد میں ہے کہ ایک موقع پر خود حضرت علی مرتضیٰؓ نے فرمایا کہ میں ہر آیت کے متعلق بتا سکتا ہوں کہ یہ کہاں اور کیوں اور کس کے حق میں نازل ہوئی۔

تصوف :

تصوف جو مذہب کی جان اور اسرارِ شریعت کی روح ہے، آپ نے ان کے حقائق و معارف کو بہت خوبی سے بیان کیا ہے۔ تصوف کے اکثر سلسلے حضرت علی مرتضیٰ رضؓ پر جا کر ختم ہوتے ہیں۔ حضرت جنید بغدادی فرمایا کرتے تھے کہ اصول اور آزمائش و امتحان میں ہمارے شیخ الشیوخ علی مرتضیٰ رضؓ ہیں[1]۔

(۱) یہ تمام تفصیل خلفائے راشدین (مولانا معین الدین ندوی) سے ماخوذ ہے۔

۲

حضرت فضیل بن عیاضؒ

جاوید نامہ میں علامہ اقبال نے جن بزرگوں کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے، ان میں حضرت فضیل بن عیاض بھی ہیں، وہ افلاک کی سیر کرتے ہوئے ایک مقام پر پہنچتے ہیں تو عارف رومی سے پوچھتے ہیں۔

من بہ رومی گفتم ایں صحرا خوش است
در کہستاں شورشِ دریا خوش است
من نیابم از حیات ایں جا نشاں
از کجا می آید آواز اذاں؟

مولانا روم جواب دیتے ہیں:

گفت رومی ایں مقامِ اولیا ست — آشنا ایں خاکداں باخاک ماست
بوالبشر چوں رخت از فردوس بست — یک دو روزے اندریں عالم نشست
ایں فضاہا سوز آہش دیدہ است — نالہ ہائے صبحگاہش دیدہ است
زائرانِ ایں مقامِ ارجمند — پاک مرداں از مقاماتِ بلند
پاک مرداں چوں فضیل و بوسعید — عارفاں مثلِ جنید و بایزید

خیز تا مـارا نماز آیـد بدست
یک دو دم سوز و گداز آید بدست[1]

حضرت فضیل بن عیاض کا تعلق طبقۂ اول کے صوفیہ سے ہے۔ صوفیہ کا طبقۂ اول کا زمانہ ۶۶۱ع (۴۱ھ) سے ۸۵۰ع (۲۳۶ھ) تک مقرر کیا گیا ہے۔ یہ اس وقت وجود میں آیا، جب کہ بنی امیہ کے مظالم حد سے زیادہ بڑھے، اور ان میں حجاج بن یوسف اور زیاد بن مغیرہ جیسے ظالم پیدا ہوئے، جن کے مظالم سے خدا کی مخلوق چیخ اٹھی ان ظالمانہ رویوں کے ردِ عمل میں صوفیہ کا پہلا طبقہ وجود میں آیا ان صوفیہ کا طریقۂ عمل یہ تھا کہ یہ حکومت سے منقطع ہو کر گوشہ گیر ہوگئے۔ اور دعاؤں اور عبادتوں میں مصروف ہوگئے۔ طبقۂ اول کے صوفیہ میں حضرت اویس قرنی، حضرت حسن بصری، حضرت مالک بن دینار، حضرت محمد واسع، حضرت حبیب عجمی اور حضرت خواجہ فضیل بن عیاض خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ بزرگ انفرادی طور پر رات دن عبادت میں مشغول رہتے تھے، اور خلفاء اور امراء کی صحبتوں اور ان کی ملاقاتوں کو بُری نظر سے دیکھتے تھے، خشیت الٰہی کے جذبے سے سرشار تھے، اور کسی اجتماعی فکر کے بغیر انفرادی طور پر عبادت و ریاضت میں زندگی بسر کرتے تھے۔

حالات :

نفحات الانس میں ہے کہ حضرت فضیل بن عیاض کی کنیت ابو علی ہے۔ یہ دراصل کوفے کے رہنے والے تھے، بعضوں نے ان کے بزرگوں کا وطن خراسان بتایا ہے، کہا جاتا ہے کہ حضرت فضیل بن عیاض سمرقند میں پیدا ہوئے، باورد میں بڑے ہوئے[2]، سفینۃ الاولیاء

---

(۱) جاوید نامہ، ص ۶۳
(۲) نفحات الانس (اردو ترجمہ) ص ۳۲ - ۳۳ (۲) سفینۃ الاولیاء، (اردو ترجمہ) ص ۱۲۰ - ۱۲۱

الاولیاء میں ہے کہ وہ خواجہ عبدالواحد بن زید کے مرید ، امام اعظم امام ابوحنیفہ کے شاگرد رشید ہیں ، ابراہیم بن ادہم ، بشر حافی ، سفیان ثوری اور داؤد طائی کے ہمعصر تھے ، معارف و حقائق میں یکتائے روزگار تھے اور طبقۂ اول کے صوفیہ کی طرح یہ بھی عبادت و ریاضت ، گوشہ گیری ، اور خلفاء اور امراء سے قطع تعلق کو اپنا شعار بنائے ہوئے تھے ، وہ ہمیشہ خلفاء اور امرا سے اجتناب کی کوشش کرتے اور اگر مجبوراً کبھی ملنا پڑجاتا تو نہایت جرات و دلیری سے ان کو ان کی غلطیوں پر متنبہ کرتے ۔

سیرالاقطاب ، سیرالمتقدمین اور تذکرۃ الاولیاء میں ہے کہ ابتدا میں حضرت فضیل بن عیاض قزاقی کرتے تھے ، اور قزاقوں کے سردار تھے ، مسافروں کے مال و اسباب کو لوٹ کر لاتے ، اور اس پر گزر بسر کرتے تھے ۔ ایک روز وہ ایک قافلے کو لوٹنے کے لیے گئے ، جب وہ اس قافلے کو لوٹنے لگے تو قافلے میں کے ایک شخص نے قرآن کریم کی یہ آیت پڑھی : الم یان للذین آمنوا ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ (ترجمہ: کیا ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہیں ، وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے قلب اللہ کے ذکر سے خشوع حاصل کریں) اس آیت نے بجلی کی طرح حضرت فضیل بن عیاض کے دل پر اثر کیا ، انھوں نے اس قافلے کو چھوڑا ، ان کے دل کی دنیا بدل گئی ، وہ زار زار روتے ہوئے جنگلوں اور بیابانوں میں پھرنے لگے اتنے میں ایک دوسرا قافلہ ادھر سے گزرا ، اس قافلے کے لوگوں نے جو ان سے ناواقف تھے ، خود ان ہی سے پوچھا کہ یہ بتاؤ کہ اس راستے میں فضیل قزاق جو لوٹ مار کرتا تھا ، اب اس کا کوئی خطرہ تو نہیں؟ حضرت فضیل نے انھیں جواب دیا کہ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ فضیل بن عیاض توبہ کرچکا ہے: پہلے تم اس سے ڈرتے تھے ، اب وہ تم سے ڈرتا ہے ، وہ سچے دل سے توبہ کرچکا ہے ، اب تمھیں کسی خوف و خطرے کی ضرورت نہیں ۔

خزینۃ الاصفیاء میں ہے کہ اس کے بعد خواجہ کوفے گئے اور امام ابو حنیفہ کی خدمت میں رہے۔ وہاں سے بصرہ آئے۔ چاہتے تھے کہ حضرت خواجہ حسن بصری سے بیعت کریں لیکن ان کی وفات ہوچکی تھی۔ پھر وہ حضرت خواجہ عبدالواحد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے بیعت ہوئے[1]۔

ایک دفعہ خلیفہ ہارون الرشید اپنے وزیر فضل کے ساتھ حضرت خواجہ فضیل بن عیاض کے گھر پر حاضر ہوا، اور دروازہ کھٹکھٹایا، اندر سے پوچھا کون ہے؟ وزیر نے جواب دیا امیرالمومنین، خواجہ فضیل نے اندر سے فرمایا کہ امیرالمومنین کو مجھ سے کیا کام، اور میرا ان سے کیا واسطہ؟ وزیر نے کہا کہ ہمیں اندر آنے کی اجازت دیجیے، ورنہ ہم حکماً اندر آجائیں گے، اندر سے جواب آیا کہ میں اجازت تو نہیں دے سکتا، لیکن اگر تم حکماً اندر آنا چاہو تو آؤ، چنانچہ خلیفہ اور وزیر اندر گئے، ان کے آتے ہی حضرت خواجہ فضیل نے چراغ گل کردیا، تاکہ خلیفہ کو نہ دیکھ سکیں، اتفاق سے ہارون کا ہاتھ آپ کے ہاتھ سے چھو گیا، فرمایا کیسا نرم ہاتھ ہے کاش دوزخ کی آگ سے بچا رہے، خلیفہ نے کہا کہ مجھے کچھ نصیحت فرمایئے، حضرت فضیل نے فرمایا تمہارے باپ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے، انہوں نے آپ سے درخواست کی تھی کہ مجھے کسی صوبے کا حاکم بنا دیجیے، آپ نے فرمایا یا عم بک لنفسک یعنی اے چچا! میں تمہیں تمہارے نفس کا امیر بناتا ہوں، ہارون الرشید نے کہا کچھ اور، فرمایا یہ ملک تمہارا گھر ہے، اور اس ملک کے رہنے بسنے والے تمہاری اولاد، ماں باپ کے ساتھ نرمی، بہن بھائیوں پر مہربانی، بچے بچیوں سے نیک سلوک کرو، یاد رکھو اگر کوئی مفلس بڑھیا رات کو بھوکی سو جائے گی تو قیامت کے دن وہ بھی

---

(۱) خزینۃ الاصفیا، جلد اول: ص

تمہاری دامن گیر ہوگی[1]۔

نفحات الانس اور سفینۃ الاولیا میں ہے کہ حضرت فضیل بن عیاض نے محرم ۱۸۷ھ (۸۰۲-۳ع) میں وفات پائی۔ مزار مبارک مکہ شریف میں ہے[2]۔

خلفاء :

حضرت خواجہ فضیل کے پانچ خلفاء جنہوں نے ان کے بعد آن کی شمع رشد و ہدایت کو روشن رکھا ۔ آن کے نام یہ ہیں (۱) حضرت ابراہیم بن ادہم (۲) شیخ محمد شیرازہ (۳) خواجہ بشر حافی (۴) شیخ ابی رجا عطاری (۵) خواجہ عبداللہ سیاری ۔

---

(۱) تاریخ مشائخ چشت ، ص ۷۵ - ۷۶ بحوالہ تذکرۃ الاولیا (عطار) آردو ترجمہ ، ص ۸۴ - ۸۵

(۲) نفحات آلانس (آردو ترجمہ) ص ۴۲ ، سفینۃ الاولیا (آردو ترجمہ)

۳

حضرت بایزید بسطامیؒ

حضرت بایزید بسطامیؒ کے متعلق علامہ اقبال کا تاثر:-

حضرت بایزید بسطامیؒ، اُن صوفیائے کرام میں سے ہیں کہ جن سے علّامہ نے اپنی غیر معمولی محبت و عقیدت کا اظہار کیا ہے، ان کے فقر کو ایک مثالی اور قابل تقلید نمونہ قرار دیا ہے۔ بالِ جبریل میں فرماتے ہیں :

شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنیدؒ و بایزیدؒ تیرا جمالِ بے نقاب[1]

اسرار و رموز میں ان کی عشق رسولؐ کی سرشاری اور اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بایزیدؒ نے محض اس لیے خربوزہ کھانے سے اجتناب کیا کہ انہیں معلوم نہ تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح خربوزہ کھایا

---

(۱) بالِ جبریل، ص ۱۵۴

تھا آن کے عشق اور اتباع رسولؐ کو قابلِ نمونہ و مثال قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں :

کیفیتہا خیزد از صہبائے عشق — ہست ہم تقلید از اسمائے عشق
کاملِ بسطام در تقلید فرد — اجتناب از خوردنِ خربوزہ کرد
عاشقی محکم شو از تقلیدِ یار — تا کمندِ تو شود یزداں شکار
لشکرے پیدا کن از سلطانِ عشق — جلوہ گر شو بر سر فارانِ عشق

تاخدائے کعبہ بنوازد ترا
شرح انی جاعلؑ سازد ترا[1]

جاوید نامہ میں صبر و رضا کی تلقین کرتے ہوئے حضرت بایزید بسطامی کے ایمان کامل کی تشریح پیر روم کی زبان سے اس طرح بیان کرتے ہیں :

کارِ مردان است تسلیم و رضا — برضعیفاں راست ناید ایں قبا
تو کہ دانی از مقامِ پیر روم — می ندانی از کلام پیرِ روم

بود گبرے در زمانِ بایزید
گفت او را یک مسلمانِ سعید
خوشتر آں باشد کہ ایماں آوری
تا بدست آید نجات و سروری
گفت ایں ایماں اگر ہست اے مرید
آنکہ دارد شیخ عالم بایزید
من ندارم طاقتِ آں ، تابِ آں
کاں فزوں آمد زکوششہائے جاں[2]

---

(۱) اسرار و رموز ، ص ۲۳ — (۲) جاوید نامہ ، ص ۱۴۱ - ۱۴۲

حالات :

حضرت بایزید بسطامی (رح) کا اسم گرامی طیفور بن عیسیٰ بن آدم بن سروشان ہے، آپ کے دادا بُت پرست تھے، جنھوں نے اس خاندان میں سب سے پہلے اسلام قبول کیا ۔

ڈاکٹر عبدالرب صاحب سابق ڈائرکٹر اقبال اکادمی نے اپنی کتاب[۱] میں لکھا ہے کہ حضرت بایزید بسطامی[۲] (رح) طہران اور نیشاپور کے درمیان موضع بسطام میں پیدا ہوئے، ان کا قیاس ہے کہ حضرت بایزید بسطامی (رح) ۱۶۱ھ (۷۷۷ع) میں پیدا ہوئے ہوں گے، ڈاکٹر موصوف کا قیاس ہے کہ آنھوں نے متاہل زندگی بسر کی، اور ان کے بیوی بچے بھی تھے، آنھوں نے لکھا کہ ۱۰ سال کی عمر میں وہ وطن سے نکلے ۔ اس سفر میں ان کی ملاقات تیئں سو صوفیہ سے ہوئی، بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ ان کی ملاقات حضرت امام جعفر صادق[۴] سے بھی بتائی جاتی ہے، لیکن یہ ممکن نہیں، اس لیے کہ امام جعفر صادق[۴] نے ۱۴۸ھ (۷۶۵ع) میں وفات پائی ۔

ہمعصر :

نفحات الانس میں ہے کہ حضرت بایزید بسطامی حضرت احمد خضرویہ[۱] ، یحییٰ بن معاذ[۲] کے ہمعصر تھے، اور ان دونوں بزرگوں نے

---

(۱) The life, thought and historical importance of Abu Yazid al Bistami The Academy for Pakistan Affairs, Dacca 1971).

(۲) ڈاکٹر عبدالرب نے ان کا پورا نام ابو یزید البسطامی لکھا ہے۔

(۳) حضرت احمد خضرویہ : کی کنیت ابو حامد تھی، بلخ کے رہنے

(باقی صفحہ ۱۵ پر)

حضرت بایزید بسطامی سے روحانی استفادہ بھی کیا تھا ۔ ڈاکٹر عبدالرب نے اپنی کتاب میں حضرت بایزید سے استفادہ کرنے والوں میں ابو موسیٰ دیبولی کا بھی اضافہ کیا ہے ۔ جو آرمینیہ سے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے ۔

طریقۂ طیفوری :

ڈاکٹر عبدالرب نے اپنی کتاب میں لکھا کہ حضرت بایزید کے زمانے تک کوئی سلسلۂ طریقت نہیں تھا ۔ حضرت بایزید پہلے شخص ہیں ، جنھوں نے سلسلۂ طیفوریہ کی بنیاد رکھی ۔ علامی ابو الفضل نے آئین اکبری میں طریقت کے ان سلسلوں کے نام دیے ہیں ۔ جنھوں نے اس برّصغیر پاک و ہند میں روحانی خدمات انجام دی ہیں ، اس فہرست میں سلسلۂ طیفوریہ کا نام بھی درج ہے ۔

تعلیم :

حضرت بایزید بسطامی نے رشد و ہدایت کا سلسلہ اس زمانے میں شروع کیا جب یونانی فلسفہ مسلمانوں میں ہمہ گیر بن رہا تھا ۔ عقل اور مذہب میں ایک کشمکش جاری تھی مذہب کے عقائد و فکر کو

بقیہ حواشی (صفحہ ۱۴)

والے تھے ۔ خراسان کے مشہور مشائخ شمار ہوتے تھے ، اور حضرت بایزید سے بسطام میں ملے تھے ، احمد خضرویہ نے ۲۴۶ھ (۸۶۰ع) میں وفات پائی ۔ نفحات الانس ، (آردو ترجمہ) ص ۶۲

(۲) حضرت یحییٰ بن معاذ : کی کنیت ابو زکریا ہے ، یہ طبقۂ اول کے صوفیہ سے تعلق رکھتے ہیں ، یحییٰ بن معاذ نے ۱۵۸ھ (۷۷۴ع) میں وفات پائی۔ نفحات الانس (آردو ترجمہ) ص ۶۳ - ۶۴

عقل کی کسوٹی پر پرکھا جارہا تھا ، بے راہ رو عقل اس سعی میں مصروف تھی کہ مذہبی عقائد و فکر کی ایسی تاویلات کی جائیں کہ اس کا رشتہ فلسفے سے جڑ سکے ، قرآن حکیم کے طریقہ استدلال کو بدل کر فلسفے کی دقیقہ سنجیوں میں گم کیا جارہا تھا ۔ حضرت جنید بغدادی ان بزرگوں میں ہیں ، جنھوں نے اس وضعیت اور عقلیت کے طوفانوں کے مقابل میں عشق الٰہی اور محبت رسول[ص] کے چراغ کو روشن کیا ، اور عقل بے راہ رو کا مداوا عشق الٰہی کے تریاق سے کیا ۔ انہوں نے اپنی تعلیمات میں عشق الٰہی اور اتباع رسول[ص] پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔

علامہ اقبال بھی حضرت بایزید بسطامی[7] کے مسلک عشق سے بےحد متاثر نظر آتے ہیں ، وہ حاصل زندگی عشق کو بتاتے ہوئے جاوید نامہ میں فرماتے ہیں -

زندگی را شرع و آئین است عشق

اصل تہذیب است دیں ، دین است عشق

ظاہر او سوز ناک و آتشیں

باطن او نور رب العالمیں

از تب و تاب درونش علم و فن

از جنون ذو فنونش علم و فن

دیں نگردد پختہ بے آداب عشق

دیں بگیر از حجت ارباب عشق

اسرار و رموز میں فرماتے ہیں کہ جب خودی محبت سے مستحکم ہوتی ہے تو فرماں دہ عالم بن جاتی ہے :

از محبت چوں خودی محکم شود قوتش فرمانده عالم شود

پیام مشرق میں عقل و عشق کا مقابلہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

عقلے کہ جہاں سوزد ، یک جلوہ بیبا کش
از عشق بیاموزد ، آئین جہانتابی
عشق است کہ در جانت ہر کیفیت انگیزد
از تاب و تب رومی ، تا حیرت فارابی
ایں حرف نشاط آور می گویم و می رقصم
از عشق دل آساید ، با ایں ہمہ بیتابی

وہ موجودہ دور کی عقلیت کے سیلاب پر افسوس کناں ہوتے ہوئے کہتے ہیں :

عشق پامال خرد گشت و جہاں دیگر شد
بود آیا کہ مرا رخصت آہے بخشند

زبور عجم میں فرماتے ہیں :

عشق اگر فرمان دہد از جان شیریں ہم گزر
عشق محبوب است، و مقصود است و جاں مقصود نے

عشق سے آن کا مقصود محبت الٰہی ہے ، محبت الٰہی کے لیے وہ محبت اور اتباع رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی لازمی قرار دیتے ہیں ۔

اسرار و رموز میں فرماتے ہیں :

مومن از عشق است و عشق از مومن است
عشق را ناممکن ما ، ممکن است
عشق صید از زور بازو افگند
عقل مکار است و دامے می زند

وہ عقل و عشق کا موازنہ کرتے ہوئے عشق کو عقل پر فضیلت دیتے ہوئے فرماتے ہیں ۔

عقل سفاک است او سفاک تر
پاک تر، چالاک تر، بیباک تر
عقل در پیچاک اسباب و علل
عشق چوگان باز میدان عمل
عقل را سرمایه از بیم و شک است
عشق را عزم و یقین لاینفک است
آن کند تعمیر تا ویران کند
این کند ویران، که آبادان کند
عقل چون باد است ارزان درجهان
عشق کمیاب و بہائے او گران
عقل محکم از اساس چون و چند
عشق عریان از لباس چون و چند
عقل می گوید که خود را پیش کن
عشق گوید امتحان خویش کن
عقل باغیر آشنا از اکتساب
عشق از فضل است و با خود در حساب
عقل گوید شاد شو، آباد شو
عشق گوید، بنده شو، آزاد شو
عشق را آرام جاں حرّیت است
ناقہ اش را ساربان حرّیت است[1]

وہ عشق کو ایک ہمہ گیر طاقت بتاتے ہوئے ایک ایسی توانائی قرار دیتے ہیں کہ جس کے ذریعے سے عمل کو فروغ حاصل ہوتا ہے اور ثابت‌قدمی، صبر و استقامت کو تقویت پہنچتی ہے، وہ عشق کو نورِ حیات قرار دیتے ہیں۔ ان کے ذیل کے اشعار میں اس

(۱) اسرار و رموز، ص ۱۲۵ - ۱۲۶

خیال کی ترجمانی ملتی ہے ، فرماتے ہیں ۔

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رَو
عشق خود ایک سیل ہے ! سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
عشق دمِ جبرئیل ، عشق دل مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول ، عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام ، عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہِ حرم ، عشق امیر جنود
عشق ہے ابن السبیل ، اس کے ہزاروں مقام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نور حیات ، عشق سے نارِ حیات[1]

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لبِ بام ابھی[2]

صدق خلیل[۴] بھی ہے عشق ، صبر حسین[۴] بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق[۳]

ایک حلقے کی جانب سے قدیم صوفیہ اور علامہ اقبال پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے عشق کی تعلیم دے کر تعقل ،

(۱) بال جبریل : ص ۱۲۷-۱۲۸ ۔ ۲- بانگ درا ص ۳۱۸
(۳) بال جبریل ص-۱۵۳

تفکر اور تدبر کے تمام راستے بند کردیے ہیں، حالانکہ قرآن حکیم میں ہمیں جابجا تفکر اور تدبر کی دعوت دی گئی ہے، وہ عشق کو ایک رجعت پسندانہ خیال قرار دیتے ہیں۔ جس نے عقل و فکر کی راہیں بند کر کے دنیا کی موجودہ ترقیات پر بہت برا اثر ڈالا ہے، لیکن اس حلقے کے افراد کا یہ اعتراض نہایت ہی غلط فہمی اور سطحیت پر مبنی ہے، علامہ اقبال جس عشق کی دعوت دیتے ہیں، اس کا ماخذ خود قرآن حکیم اور حدیث شریف ہے قرآن حکیم میں ہے، والذین امنوا اشد حبا للہ (اور جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ اللہ کے ساتھ شدید محبت رکھتے ہیں)۔ حدیث شریف میں جن تین چیزوں کے ذریعہ سے حلاوت ایمان حاصل ہوتی ہے۔ ان میں سب سے پہلی چیز اللہ اور اس کے رسول کی محبت ہے، جسے سب چیزوں پر اولیت دی گئی ہے۔ قرآن کریم اور احادیث نبوی میں اس جذبے کو حُبّ سے تعبیر کیا گیا ہے، علامہ اقبال اور تمام صوفیائے کرام اسی جذبے سے قلب کو گرمانا چاہتے ہیں اور اس کو اس کے مترادف لفظ عشق سے تعبیر کرتے ہیں، علامہ اقبال اور تمام صوفیہ اس تعقل اور تفکر کو محمود ٹھراتے ہیں جو حقیقت اشیا کے معلوم کرنے کے بعد خدا شناسی کی طرف رہبری کرتا ہے۔ وہ اس عشق کو عقل کا امام قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بت کدہ تصورات[1]

وہ اس تعقل و تفکر کو ناجائز اور حرام قرار دیتے ہیں، جن سے بے لگام عقل انسانوں کے دل و دماغ میں خدا کے خلاف بغاوت پیدا کرتی ہے۔ فرماتے ہیں:

قلب را از صبغۃ اللہ رنگ دہ — عشق را ناموس و نام و ننگ دہ
طبع مسلم از محبت قاہر است — مسلم از عاشق نباشد کافر است[2]

---

(۱) بال جبریل، ص ۱۵۳ (۲) اسرار و رموز، ص ۶۹-۷۰

علامہ، عشق الٰہی کے لیے محبت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی لازمی قرار دیتے ہوئے ہمیں اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ دنیا اور آخرت اور ملت کی ساری کامرانیاں عشق رسول[ص] پر منحصر ہیں ۔ فرماتے ہیں :

در دل مسلم مقام مصطفیٰ است — آبروئے ما ز نام مصطفیٰ است[۱]

ہر کہ عشق مصطفیٰ سامان اوست — بحر و بر در گوشۂ دامان اوست

سوز صدیق[رض] و علی[رض] از حق طلب — ذرۂ عشق نبی از حق طلب

زانکہ ملت را حیات از عشق اوست — برگ و ساز کائنات از عشق اوست[۲]

وہ ایک جگہ عشق رسول[ص] کو محبت الٰہی پر بھی ترجیح دیتے ہوئے اس نکتے کو واضح فرماتے ہیں کہ اگر ہم اس نکتے پر غور کریں کہ ہمیں معرفت الٰہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہی سے حاصل ہوئی ہے تو خدا سے بھی نبی محبوب تر ٹھہرتا ہے : کہتے ہیں :

معنی حرفم کنی تحقیق اگر — بنگری بادیدۂ صدیق[رض] اگر

قوت قلب و جگر گردد نبی — از خدا محبوب تر گردد نبی[۳]

علامہ جس عشق سے قلوب کو گرمانا چاہتے ہیں ، اس کی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

عشق را ازتیغ و خنجر باک نیست

اصل عشق از آب و باد و خاک نیست[۴]

---

(۱) اسرار و رموز ص ۲۰ — (۲) پیام مشرق ، ص ۸

(۳) اسرار و رموز ص ۱۱۷ — (۴) اسرار و رموز ص ۱۹

وہ ایمان و یقین محکم کا ذریعہ عشق کو قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں :

صدقِ خلیل بھی ہے عشق ، صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق[1]

شطحیات :

وہ الفاظ جو صوفیائے کرام کی زبان سے عالم سکر و مستی میں نکلتے ہیں ، اور بظاہر شریعت کے خلاف ہوتے ہیں ، ایسے کلمات کو اصطلاحِ تصوف میں شطحیات کہا جاتا ہے - اکابر صوفیہ کی شطحیات مشہور ہیں، ان کے صحیح مفہوم کو متعین کرنا ، اہل بصیرت کا کام ہے- حضرت بایزید بسطامی کی بھی بعض شطحیات مثلاً سبحانی ما اعظم شانی وغیرہ مشہور ہیں ، ڈاکٹر عبدالرب صاحب نے اپنے مقالے میں لکھا ہے کہ : وہ سات مرتبہ بسطام سے اپنی شطحیات کی بنا پر نکالے گئے ، لیکن نفحات الانس میں حضرت حصری کا بیان ہے کہ حضرت بایزید بسطامی پر شطح کی حالت نہ تھی ، اور وہ شرعی اوامر و نواہی کو بڑی اہمیت دیتے تھے ، شیخ الاسلام فرماتے ہیں کہ بہت سے جھوٹ حضرت بایزید سے منسوب کیے گئے ہیں[2]-

وفات :

ڈاکٹر عبدالرب سابق ڈائرکٹر اقبال اکادمی نے اپنے مقالے میں حضرت بایزید بسطامی کی وفات ۲۳۴ھ (۸۴۸-۴۹ع) میں بتائی ہے ، صاحبِ نفحات الانس نے آپ کا سنہ وفات ۲۶۱ھ (۸۷۴-۷۵ع) کو زیادہ صحیح بتایا ہے -

---

(۱) بال جبریل ، ص ۱۵۳
(۲) نفحات الانس فارسی ، طبع نولکشور ، ص ۵۹ - ۶۰

۲۰۴۲۹

تصانیف :

حضرت بایزید بسطامی کے ملفوظات کو ابوالفضل محمد السلگی (متوفی) ۴۸۶ھ (۱۰۹۳ع) نے النور من کلمات ابی الطیفور کے نام سے جمع کیا ہے[1]۔

(۱) کتاب ڈاکٹر عبدالرب

۴

حضرت جنید بغدادیؒ

علامہ اقبال کی محبت و عقیدت :

حضرت جنید بغدادی ان بزرگوں میں سے ہیں کہ جن سے علامہ اقبال کو غیر معمولی محبت و عقیدت تھی ، اور جنھیں وہ اپنی شاعری میں بطور نمونہ و مثال پیش کرتے ہیں ۔ بال جبریل میں ان کی ایک نظم ذوق و شوق کے عنوان سے ہے ، اس میں فقر جنید کو سراہتے ہوئے فرماتے ہیں :

شوکت سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید و بایزید تیرا جمالِ بے نقاب[1]

ارمغان حجاز میں حضرت جنید کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں :

دگر بمدرسہ ہائے حرم نمی بینم
دل جنید و نگاہِ غزالی و رازی[2]

(۱) بال جبریل ، ص ۱۵۳ (۲) ارمغان حجاز ، ص ۲۷۱

حالات :

حضرت جنید بغدادی کی کنیت ابو القاسم ، اور آپ کا لقب قواریری اور زجاج و خراز ہے ، قواریری اور زجاج آپ کو اس لیے کہتے ہیں کہ آپ کے والد شیشے کی تجارت کرتے تھے ، اور خراز آپ کو اس لیے کہا جاتا ہے کہ آپ خود موزہ دوزی کا کام کرتے تھے ، حضرت جنید کا آبائی وطن نہاوند تھا ، لیکن وہ بغداد میں پیدا ہوئے[۱]۔

تربیت روحانی :

حضرت جنید بغدادی نے روحانی تربیت حضرت سری سقطی،[۲] حارث محاسبی[۳] اور محمد قصاب[۴] سے حاصل کی تھی ۔

---

(۱) نفحات الانس (اردو ترجمہ) ص ۹۰-۹۱

(۲) حضرت سری سقطی: حضرت سری بن المغلس السقطی کی کنیت ابوالحسن ہے ، یہ طبقۂ اول کے صوفیہ میں شمار ہوتے ہیں ، حضرت جنید کے استاد ہیں ، اور خود حضرت معروف کرخی کے شاگرد ہیں ، حضرت سری سقطی نے منگل کے دن ۳ رمضان ۲۵۳ھ (۸۶۷-۶۸ء) میں وفات پائی ۔ نفحات الانس اردو ترجمہ ص ۶۰-۶۱ ۔

(۳) حارث محاسبی: حارث بن اسدالمحاسبی کی کنیت ابو عبداللہ ہے ، آپ کا شمار طبقۂ اول کے صوفیہ میں ہوتا ہے ، بصرے کے رہنے والے تھے ، لیکن بعد میں بغداد میں سکونت اختیار کر لی تھی ، حارث محاسبی نے ۲۴۳ھ (۸۵۷-۵۸ء) میں وفات پائی ۔ (نفحات الانس۔اردو ترجمہ ، ص ۵۷)

(۴) شیخ محمد قصاب: ابو العباس قصاب کے شاگرد ہیں ، دامغان میں رہتے تھے (نفحات الانس (اردو ترجمہ) ص ۳۲۸)

شیخ فریدالدین عطار ان کی محامد و اوصاف کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں -

مقتدائے اہل تصوف بود ، واورا سید الطائفہ گفتہ اند ، ولسان القوم خوانده اند واعبدالمشائخ نوشتہ اند ، وطاؤس العلماؑ و سلطان المحققین و در شریعت و حقیقت باقصی الغایت بود ، و در زہدو عشق بے نظیر ، و در طریقت مجتہد ، و بیشتر از مشائخ بغداد در عصر او وبعد ازوے مذہب او داشتہ اند ، وطریق او طریق صحو بود - ... و او را تصانیف عالی است در اشارات و حقائق و معانی -

ترجمہ

حضرت جنید بغدادی ، اہل تصوف کے پیشوا تھے ، ان کو سید الطائفہ لسان القوم کہتے تھے ، اعبدالمشائخ ، طاؤس العلماؑ اور سلطان المحققین لکھتے تھے ، شریعت اور حقیقت کی انتہا پر تھے ، زہد و عشق میں بے نظیر تھے ، اور طریقت میں مجتہد کا درجہ رکھتے تھے ، ان کے زمانے میں اور ان کے بعد بغداد کے مشائخ ان کا مذہب رکھتے تھے ۔ ان کا طریقہ "صحو" تھا ، ... اشارات و حقائق و معانی میں ان کی تصانیف بہت بلند ہیں[1] -

حضرت سری سقطی جو حضرت جنید کے ماموں بھی تھے ، اور مرشد بھی ۔ ان سے کسی نے پوچھا کہ کیا کبھی مرید اپنے پیر سے بڑھ سکتا ہے ؟ فرمایا ہاں ، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ جنید

(۱) تذکرۃ الاولیا (شیخ فریدالدین عطار) مطبوعہ لیدن ، ص ۵-۶

اپنے مرتبے میں مجھ سے بلند ہے۔

صاحب کشف المحجوب حضرت داتا گنج بخش ہجویری[7] نے آن کو طریقت میں شیخ المشائخ اور شریعت میں امام الائمہ لکھا ہے۔

شیخ ابو جعفر حداد کہا کرتے تھے کہ عقل اگر مرد ہوتی تو جنید کی شکل میں ہوتی ۔ حضرت جنید بغدادی نے اس دور میں اپنا چراغ رشد و ہدایت روشن کیا ، جب کہ مسلمانوں میں یونانی فلسفے کا رواج ہوا ، بے لگام عقل نے مذہب سے بغاوت اختیار کی ، اعتقاد کی بنیادیں ہل گئیں ، دینی وجدان اور صحیح فکر و نظر گم ہونے لگا ۔ اور عقلیت کے اس سیلاب نے مسلمانوں کی دینی زندگی پر نہایت برا اثر ڈالا ، مذہبی عقاید کو عقل کے سانچوں میں ڈھال کر بے سروپا تاویلات کا باب کھولا گیا ، قرآنی آیات کی تاویلات کی گئیں ، جن سے مذہب کی حقیقی روح گم ہونے لگی ۔

حضرت جنید بغدادی اور ان کے ہمعصر صوفیہ نے اس فتنے کے خلاف آواز اٹھائی اور عقل کے مقابلے میں عشق الٰہی پر زور دیا ، اور خود بھی عشق الٰہی سے سرشار ہوکر زندگی بسر کی ۔ اور اس طرح فلسفے کے برے اثرات کا مداوا قلبی کیفیات کے ذریعے سے کیا ، اور اپنی تعلیمات میں محبت الٰہی پر سب سے زیادہ زور دیا ہے ۔

تعلیمات :

حضرت جنید بغدادی کی تعلیمات میں ہمیں جس تصوف کی طرف رہبری ملتی ہے وہ حقیقی اور اسلامی تصوف ہے ، جس کا سرچشمہ قرآن و حدیث ہے ۔ فرماتے ہیں کہ :

> این راہ کسے یابد کہ کتاب بردست راست
> گرفتہ باشد ، و سنت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

بردست چپ ، و در روشنائی دو شمع می ردد تا نہ در مغاک شبہت افتد ، نہ در ظلمت بدعت[1]

ترجمہ

(تصوف کی) یہ راہ صرف وہی پا سکتا ہے ، جس کے سیدھے ہاتھ میں قرآن اور بائیں ہاتھ میں حدیث سنت رسول مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہو ، ان دونوں چراغوں کی روشنی میں راستہ طے کرے ، تا کہ نہ تو شبہے کے گڑھوں میں گرے ، اور نہ بدعت کے اندھیرے میں پھنسے۔

محبت الٰہی کی عملی راہ غریبوں سے محبت اور خدمت خلق ہے - سیرالاولیا[2] میں ہے کہ حضرت جنید بغدادی فرمایا کرتے تھے کہ میں نے مدینے کی گلیوں میں حق کو پایا ہے ، لوگوں نے پوچھا کیسے؟ فرمایا

روزے در بازار مدینہ می رفتم - شکستگانے دیدم ازغایت شکستگی کہ صفت نتواں کرد ، برایشاں رحم آمد ، خواستم کہ با ایشاں باشم و موانست بگیرم ، صحبت ایشاں بودم ، پنداشتم کہ خدا باشکستگان است[2]

ترجمہ

ایک روز میں مدینے کے بازار میں چلا جا رہا تھا کہ چند

---

(۱) تذکرہ الاولیا (شیخ فریدالدین عطار) مطبوعہ لیدن ، ص ۸
(۲) سیرالاولیا ، ص ۵۵۹ - ۵۵۸

خستہ حال لوگوں کو دیکھا کہ جن کی پریشانی کی
کیفیت بیان میں نہیں آ سکتی ، مجھے ان پر رحم آیا
اور میں نے چاہا کہ میں بھی ان کے ساتھ رہوں اور
ان سے موانست اختیار کروں ۔ چنانچہ ان کی صحبت
میں رہا اور سمجھ گیا کہ خدا شکستہ حالوں کے
ساتھ ہے -

خیرالمجالس میں ہے کہ حضرت جنید بغدادی نے ایک
رات بارگاہ خداوندی میں عرض کیا کہ اے اللہ! مجھے یہ بتا
دے کہ بہشت میں میرا ساتھی اور مصاحب کون ہوگا؟ آواز آئی
کہ فلاں چرواہا ، حضرت جنید بغدادی اس چرواہے سے جا کر
ملے ، اور کئی دن تک بغور اس کے حالات کا مشاہدہ کرتے رہے،
کئی دن کے مشاہدے کے بعد اس سے فرمایا کہ تم پانچ وقت
نماز باجماعت ادا کرتے ہو ، اس کے سوا مجھے تمہارا کوئی کام
ایسا نظر نہیں آیا کہ تم خدائے تعالیٰ کی نظر میں اس قدر مقبول
ہو ، کیا تمہیں یہ اعلیٰ مرتبہ کسی باطنی معاملے کے سبب سے
ملا ہے؟ چرواہے نے جواب دیا کہ اے خواجہ جنید! میں ایک
جاہل آدمی ہوں ، میں نہیں جانتا کہ باطن کس کو کہتے ہیں -
اور معاملہ کیا ہوتا ہے؟ لیکن مجھ میں دو باتیں ہیں ، ایک یہ کہ
اگر اللہ تعالیٰ ان سب پہاڑوں کو سونا کر دے ۔ اور میرے
قبضے میں دے دے ، پھر یہ پہاڑ میرے پاس سے جاتے رہیں تو مجھے
ان کے جانے کا ذرا بھی رنج و غم نہ ہوگا - دوسری بات یہ ہے
کہ اگر کوئی مجھ پر ظلم کرے یا احسان و وفا کرے تو میں اس
جفا و وفا کو اس کی طرف سے نہیں جانتا ۔ بلکہ یہ سب اللہ کی
طرف سے جانتا ہوں -

ایک شخص سے حضرت جنید بغدادی نے پوچھا کہاں سے آ رہے
ہو؟ جواب دیا حج کر کے آیا ہوں ، دریافت کیا واقعی ، جواب ملا

جی ہاں ۔ فرمایا جس وقت تم حج کے ارادے سے باہر نکلے تھے ، کیا گناہوں کے تج دینے کا ارادہ بھی کیا تھا؟ جواب ملا نہیں، ایسا تو کوئی اردہ نہیں کیا تھا ۔ فرمایا پھر تم حج کے لیے نکلے ہی نہ تھے ، پھر پوچھا سفر میں جب منزل پر منزل طے کر رہے تھے ، کیا مقامات حق بھی ساتھ ساتھ طے کیے تھے؟ جواب ملا نہیں ۔ فرمایا تو تم نے سفر حج کی منزلیں طے نہیں کیں ۔ پھر دریافت کیا ، جب تم نے روز مرہ کا لباس اتار کر احرام باندھا تھا، تو کیا صفات بشریہ سے بھی مفارقت کی تھی؟ جواب ملا نہیں، فرمایا تو پھر تم نے احرام باندھا ہی نہیں ، پھر پوچھا جب تم عرفات میں کھڑے ہوئے ، تو معرفتِ حق سے بھی بہرہ مند ہوئے تھے؟ جواب دیا نہیں ، فرمایا پھر تو تم نے عرفات میں وقوف کیا ہی نہیں ۔ فرمایا جب تم مزدلفہ گئے تھے تو نفسانی خواہش سے ہمیشہ کے لیے دست کش ہو گئے تھے؟ جواب ملا نہیں ، فرمایا ، پھر تم مزدلفے گئے ہی نہیں ۔ فرمایا خانۂ کعبہ کا طواف کرتے وقت جمالِ حق کا پرتو بھی دیکھا تھا؟ کہا نہیں ۔ فرمایا تو تم نے طوافِ کعبہ کیا ہی نہیں ۔ پھر پوچھا صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے وقت تمہیں اس کے مرتبے و مقام کا فہم و ادراک بھی ہوا تھا یا نہیں؟ جواب دیا نہیں؟ فرمایا تم نے سعی بھی نہیں کی ۔ پھر ارشاد فرمایا منیٰ میں جب تم نے قربانی کی تھی ، تو اس کے ساتھ اپنی نفسانی خواہشات کو بھی قربان کیا تھا؟ جواب دیا نہیں ، فرمایا تم نے قربانی بھی نہیں کی ۔ پھر دریافت کیا ، جب تم نے سنگ ریزے پھینکے تھے تو نفسِ امارہ اور ہوا و ہوس کو بھی کچلا تھا یا نہیں؟ جواب دیا نہیں فرمایا تم نے سنگ ریزے بھی نہیں پھینکے۔ پھر ارشاد ہوا تم نے حج کے آداب و شرائط کو ملحوظ ہی نہیں رکھا ، واپس جاؤ ، اور ان آداب و

شرائط کے ساتھ فریضۂ حج ادا کرو ۔[1]

حضرت جنید بغدادی نے ۲۹۷ھ (۹۱۰ع) میں وفات پائی ، وفات سے کچھ پہلے روتے ہوئے فرمایا کہ اب جب کہ میری عمر کا صحیفہ لپٹا جا رہا ہے ، میں اپنی ستر سالہ طاعت و عبادت کو ایک بال میں لٹکا ہوا دیکھ رہا ہوں ہوا اس کو ہلا رہی ہے ، کہا نہیں جا سکتا کہ یہ توڑنے والی ہوا ہے یا ملانے والی ہوا ہے

---

(۱) رسالہ زندگی ۔ لاہور ص ۲۴ تا ۳۰ جنوری ۱۹۷۲ جلد ۱۰ شمارہ ۲۲ ۔ ص ۱۹

۵

حضرت حسین بن منصور حلاج

علامہ اقبال کا منصور کے متعلق اظہار خیال :

حضرت منصور کے متعلق اُن کے نعرۂ اناالحق کی وجہ سے صوفیائے کرام میں اختلاف ہے۔ شیخ عمر و بن عثمان مکی ، ابو یعقوب اور علی بن عثمان سہیل اصفہانی جیسے متقدمین صوفیہ نے ان کا انکار کیا ہے ، اور ان کو مہجور قرار دیا ہے ، لیکن شیخ ابوبکر شبلی ، ابوالعباس بن عطا ، شیخ عبداللہ خفیف ، شیخ ابو القاسم نصرآبادی ، شیخ ابو سعید ابو الخیر ، شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری ، اور حضرت داتا گنج بخش ہجویری ، اور دوسرے متاخرین صوفیہ ان کے معتقد ہیں ، اور ان کو بزرگ مانتے ہیں ، ان بزرگوں کا کہنا ہے کہ معاملے کا مہجور ، مہجور نہیں ہوتا ، منصور کو جو کچھ جھیلنا پڑا وہ غلبۂ شوق ، جذبۂ عشق اور مراتب و مدارج کو ضبط نہ کرنے کی وجہ سے تھا ، وہ عالم بیخودی اور فرط عشق میں ''اناالحق'' کہہ بیٹھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً علامہ اقبال بھی منصور کے

منکرین میں تھے۔ چنانچہ ایک خط میں حضرت اکبرالہ آبادی کو لکھتے ہیں :

> پہلے عرض کر چکا ہوں کہ کون تصوف میرے نزدیک قابل اعتراض ہے۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ نئی بات نہیں ، حضرت علاالدولہ سنجانی[۱] لکھ چکے ہیں ، حضرت جنید بغدادی لکھ چکے ہیں ۔ میں نے تو محی الدین اور منصور حلاج کے متعلق وہ الفاظ نہیں لکھے جو حضرت سنجانی اور جنید نے ان دونوں بزرگوں کے متعلق ارشاد فرمائے ہیں ۔ ہاں ان کے عقائد اور خیالات سے بیزاری ظاہر کی ہے ۔ اگر اسی کا نام مادیت ہے تو قسم بخدائے لایزال مجھ سے بڑھ کر مادہ پرست دنیا میں کوئی نہ ہوگا[۲]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہ مطالعے اور تفکر نے بعد میں منصور کے متعلق علامہ کی رائے میں تبدیلی پیدا کر دی تھی ۔

(۱) **حضرت علاؑ الدولہ سنجانی :** سنجانی سہو کتابت ہے ، یہ لفظ سمنانی ہے ، ان بزگ کا پورا نام ابوالمکارم رکن الدین احمد بن احمد البیا بانکی السمنانی ہے۔ یہ سمنان کے بادشاہوں کے خاندان سے تھے، ۶۸۷ھ (۸۹-۱۲۸۸) میں بغداد میں شیخ نورالدین عبدالرحمٰن کسرتی کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کی اور خرقۂ خلافت حاصل کیا ، اور رجب ۷۳۶ھ (۱۳۳۶ع) کو بُرج احرار صوفی آباد میں ۷۷ سال کی عمر میں واصل الی اللہ ہوئے ، (نفحات الانس (اردو ترجمہ) ص ۶۸ھ

(۲) اقبال نامہ ، حصہ دوم خط بنام حضرت اکبر الہ آبادی ، ۱۱ جون ۱۹۱۸ع ، ص ۵۳ - ۵۵

ڈاکٹر ابو سعید نورالدین اپنی کتاب اسلامی تصوف اور اقبال میں لکھتے ہیں کہ :

صوفیہ کی فنا کے سلسلے میں یہاں ایک اور اہم نکتہ پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ منصور حلاج نے اتحاد بذات حق کا دعویٰ کر کے جو ''اناالحق'' کہا تھا ، اس کے متعلق علامہ اقبال کہتے ہیں کہ مشہور فرانچ مستشرق ملسینون نے منصور حلاج کے جو اقوال وار شادات جمع کیے ہیں ، ان کا بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قول ''اناالحق'' سے مراد ہر گز یہ نہیں تھا کہ وہ خدا کے ساتھ متحد ہو گئے تھے ، بلکہ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ میں تخلیقِ حق (Creative truth) ہوں ، ہمعصر صوفیہ نے ان کے اس قول کو وحدت الوجودی رنگ دے دیا[1] ۔

اس کے علاوہ منصور حلاج کے دوسرے اقوال سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ خدا کی وراثیت کے قائل تھے- بنا بریں ان کے قول کی تفسیر اس طرح کرنی چاہیے کہ انسانی خودی وہ حقیر قطرہ نہیں ہے ، جو انجام کار دریا میں مل جائے ، بلکہ وہ قطرہ ہے جو اپنی ہستی کو زیادہ پائیدار صورت میں استوار کرے ، اور اس بات کا اقرار کرے کہ اس کی ہستی حق ہے[2] -

بال جبریل میں تو علامہ نے منصور کی یہاں تک ہمنوائی

(۱) اسلامی تصوف اور اقبال، ص ۳۱۲

Reconstruction of Religious thought in Islam, P. P. 96

کی ہے کہ فرماتے ہیں :

نگہ پیدا کر اے غافل تجلی عین فطرت ہے
کہ اپنی موج سے بیگانہ رہ سکتا نہیں دریا
رقابت علم و عرفاں میں غلط بینی ہے منبر کی
کہ وہ حلاج کی سولی کو سمجھا ہے رقیب اپنا[1]

علامہ اقبال کی اس وضاحت کے بعد ہم منصور کے حالات کی طرف رجوع کرتے ہیں منصور کی ذات اکثر صوفیہ کے نزدیک ایک محبوب ترین ہستی رہی ہے۔ شیخ ابو سعید ابو الخیر نے منصور کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ :

حسین منصور حلاج قدس اللہ روحہ بڑے مرتبے پر فائز ہیں ، ان کے زمانے میں مشرق میں ان جیسا کوئی نہیں ہوا۔

حضرت شبلی[2] جیسے بزرگ عارف نے جس دار پر منصور

---

(۱) بال جبریل ۔ ص ۳۸
(۲) شبلی : ابو بکر شبلی کا نام جعفر بن یونس ہے آپ چوتھے طبقے کے صوفیہ سے تعلق رکھتے ہیں ، مصر کے رہنے والے تھے ، بغداد میں آئے اور خیر نساج کی مجلس میں توبہ کی ، خیر نساج نے ان کو حضرت جنید بغدادی کے پاس بھیجا ، سالکی مذہب رکھتے تھے ، حضرت جنید ان کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ ہر قوم کا ایک تاج ہوتا ہے ، اور اس قوم کا تاج شبلی ہیں حضرت ابو بکر شبلی نے ستاسی سال کی عمر میں ۳۲۴ھ (۹۳۵-۳۶ ع) میں وفات پائی (نفحات الانس اردو ترجمہ ص ۲۹۲-۲۰۳)

کو چڑھایا گیا ۔ اس دار کے نیچے کھڑے ہو کر کہا الم ننھٰک علی العالمین (کیا ہم نے تم کو عالم پر اس راز کے آشکارہ کرنے سے نہیں روکا تھا ، پھر انھوں نے کہا کہ میں بھی وہی کہتا ہوں جو وہ کہتا تھا ، لیکن دیوانگی نے مجھے چھوڑا لیا ، اور عقل نے اسے گرا دیا)۔

دسویں صدی ہجری کے مشہور صوفی و عالم حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ نے منصور اور ان کے دار پر چڑھائے جانے پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا:

> نادانوں نے منصور حلاج کو سولی پر چڑھایا اور مار ڈالا ، اگر میں اس وقت وہاں ہوتا تو ان کو ہرگز قتل نہ ہونے دیتا ......فرمایا انسان جو خلاصۂ موجودات ہے ، جب وہ خبر حق دیتا ہے تو وہ کیوں دار کا مستحق قرار پاتا ہے[1]

حالات :

حسین حلاج بن منصور البیضاوی جو منصور حلاج کے لقب سے عالم میں مشہور ہوئے ان کی کنیت ابوالمغیث تھی ، ۲۴۴ھ (۵۹-۸۵۸ع) کے قریب بیضا (فارس) نواح طور میں پیدا ہوئے ، حلاج ان کو اس لیے کہتے ہیں ایک دن وہ اپنے ایک دوست دھنیے کی دکان پر تشریف لے گئے ، اس کو کسی کام سے بھیجا ، اور روئی کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے رہے ، روئی ایک طرف اور بنولے ایک طرف ہوتے رہے ، اس وقت سے وہ حلاج کہلائے۔

(۱) لطائف قدوسی ، ص-۴۸-۴۹-لطیفہ ٦۵

شیخ فریدالدین عطار نے تذکرۃ الاولیا میں لکھا ہے کہ
پہلے وہ تستر میں آئے ، اور دو سال تک شیخ سہل بن عبداللہ[1] کی
خدمت میں رہے ، پھر بغداد گئے ۔ پھر بصرہ گئے ، اور عمرو بن عثمان
کی خدمت میں رہ کر تعلیم و تربیت حاصل کی ، تقریباً اٹھارہ ماہ
اُن کی خدمت میں رہے ۔

شادی :

یہیں منصور نے ابو یعقوب اقطع کی بیٹی سے شادی کی ، کسی
وجہ سے اُن کے استاد عمرو بن عثمان منصور[2] اُن سے ناراض ہو گئے۔

حضرت جنید بغدادی کی خدمت میں :

اس کے بعد منصور بغداد آئے ، اور حضرت جنید بغدادی کی
خدمت میں رہنے لگےحضرت جنید نے ان کو سکوت اور خلوت اختیار
کرنے کے لیے فرمایا ۔ منصور بہت دن تک ان کی خدمت میں رہے ۔

---

(۱) **سہل بن عبداللہ :** کی کنیت ابو محمد ہے تستر کے رہنے والے
تھے ، دوسرے طبقے کے صوفیہ سے تعلق رکھتے ہیں ۔ حضرت
سہیل بن عبداللہ نے محرم ۲۸۳ھ (۸۹۶ع) میں وفات پائی
(نفحات الانس ، اردو ترجمہ ، ص ۷۶)

(۲) **عمر و بن عثمان :** کی کنیت عبداللہ ہے ۔ یہ دوسرے طبقے کے
صوفیہ میں شمار ہوتے ہیں حسین منصور کے استاد ہیں ، اپنی
نسبت جضرت جنید سے کرتے تھے ، اور خراز کی صحبت میں بھی
رہے تھے ، اُنھوں نے بغداد میں ۲۹۶ھ (۹۰۸-۹ع) میں وفات
پائی (نفحات الانس اردو ترجمہ ص ۹۵)

نفحات الانس میں ہے کہ منصور حضرت نوری[1] کی خدمت میں بھی رہے تھے۔

سفر حجاز:

پھر حجاز گئے اور ایک سال تک حجاز میں رہے ، اس کے بعد بغداد واپس آئے ، اور صوفیہ کی ایک جماعت کے ساتھ حضرت جنید سے ملاقات کی اس ملاقات میں حضرت جنید سے چند مسائل پوچھے ، لیکن حضرت جنید نے کچھ جواب نہ دیا۔ صرف اتنا فرمایا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم جلد ہی اپنے خون سے دار کی لکڑیوں کو سرخ کرو گے ، منصور نے جواب دیا کہ جس دن میں اپنے خون سے دار کی لکڑیوں کو سرخ کروں گا ، اس دن آپ اہل فتوی کا لباس پہنیں گے۔

حضرت جنید نے جب منصور کے سوالات کے جوابات نہ دیے ، تو وہ ناراض ہو کر اور بغیر اجازت تستر چلے آئے اور ایک سال وہاں رہ کر غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ لوگوں نے حسد کی بنا پر ان کی مخالفت شروع کی یہاں تک کہ ان کے استاد عمر و بن عثمان نے بھی ان کی مخالفت میں خوزستان اور دوسرے شہروں میں خطوط لکھے ، اور ان شہروں کے لوگوں کی نظر سے ان کو گرا دیا۔

---

[1] نوری : حضرت ابوالحسن نوری کا نام محمد بن محمد اور احمد زیادہ صحیح ہے ، ان کا شمار طبقۂ دوم کے صوفیہ میں ہوتا ہے ان کا آبائی وطن شہر بغشور تھا ، جو ہرات و مرو کے درمیان ہے۔ حضرت سری سقطی ، محمد بن علی قصاب اور احمد بن الحواری کی خدمت میں رہے ، حضرت نوری نے ۲۹۵ھ (۸-۹۰۷ء) میں وفات پائی (نفحات الانس ، اردو ترجمہ ، ص ۸۹)

منصور نے دل گرفتہ اور ملول ہو کر جامۂ تصوف اُتار دیا ، قبا پہننے لگے اور دنیا کے کاموں میں لگ گئے - پھر پانچ سال تک غائب رہے ، اس عرصے میں وہ خراسان ، ماوراءالنہر اور سیستان کے حصول میں رہے ، پھر اہواز آئے ، اور اہل اہواز کو اپنا پیام سنایا ، اور وہاں کے عوام و خواص میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کی ، لوگ ان کو حلاج الاسرار کہتے تھے ، پھر دوبارہ انھوں نے جامۂ تصوف پہن لیا ، اور حرم کا ارادہ کیا ، جب مکۂ معظمہ پہنچے یعقوب نہرجوری نے ان کو جادوگر ٹھہرایا ، یہاں تک کہ مختلف ممالک میں گھومتے رہے ، اقصائے عالم میں لوگ ان کے معتقد ہو گئے اہل ہند ان کو اپنے خطوط میں ابوالمغیث ، اہل چین ابوالمعین ، اہل خراسان ابوالمہر ، اہل فارس ابو عبداللہ ، اہل خوزستان حلاج الاسرار ، اور اہل بغداد مصطلم لکھتے تھے- اور اہل بصرہ ان کو مخثبر کہتے تھے-

یہاں تک کہ پھر وہ ایک بار مکۂ معظمہ میں رہے ، اور دو سال تک حرم محترم کی مجاورت اختیار کی اور واپس ہوئے -

احول میں تغیر:

کہتے ہیں کہ مکۂ معظمہ سے واپس آنے کے بعد منصور کے احوال میں تغیر پیدا ہوا اور ایک دوسری ہی کیفیت ان میں محسوس ہونے لگی - وہ جو باتیں کرتے تھے ، لوگ ان کے سمجھنے سے قاصر رہتے تھے ، یہاں تک کہ لوگوں نے ان کی یہ عجیب و غریب باتیں سن کر انھیں شہر سے نکال دیا - آخر میں ان کی عجیب و غریب باتوں نے لوگوں کو ان کے خلاف زبان درازی پر مجبور کر دیا اور ان کی باتیں خلیفۂ وقت تک پہنچائیں انھوں نے خلیفہ سے کہا کہ منصور اناالحق کہتا ہے -

کارنامۂ بزرگان ایران میں ہے کہ : حلاج دارالحفظ واسط میں علوم کے حاصل کرنے میں مشغول ہوگئے۔ اور بارہ سال کی عمر میں انھوں نے قرآن مجید حفظ کرلیا ، اور سہل بن عبداللہ تستری کے مرید ہوگئے ، جنھوں نے ان سے چلّہ کھنچوایا ، پھر وہاں سے بصرہ گئے ، اور حضرت حسن بصری کے مدرسے میں شریک ہوگئے ، اور ابو عبداللہ عمرو بن عثمان مکی سے خرقۂ تصوف حاصل کیا ، وہیں یعقوب اقطع بصری کی لڑکی سے شادی کی ۔ پھر وہ ۲۶ سال کی عمر میں ۲۷۰ھ میں پہلی بار حج کے لیے مکۂ معظمہ گئے ، وہاں سے اہواز آئے ، یہیں ان کی صوفیانِ قشری سے مخالفت ہوئی ، یہیں انھوں نے صوفیانہ عبا و قبا کو اتار کر پھینک دیا اور کہا کہ یہ نمود و نمائش ہے ، وہاں سے خراسان آئے ، اور پانچ سال خراسان میں رہے پھر اہواز آئے اس کے بعد بغداد گئے ، پھر دوسری مرتبہ حج کے لیے مکۂ معظمہ حاضر ہوئے ۔ اسی سفر میں ان پر شعبدہ باز ہونے کی تہمت لگائی گئی[1] ۔

علماء کا فتویٰ :

علماء نے ان کے نعرۂ اناالحق پر جو بظاہر شریعت کے خلاف تھا منصور کے قتل کا فتویٰ دیا ۔ خلیفہ نے کہا کہ جب تک کہ حضرت جنید کے اِس فتوے پر دستخط نہ ہوں گے ، میں اس فتویٰ کو معتبر نہ مانوں گا چنانچہ حضرت جنید جبّہ و دستار پہن کر مدرسے میں آئے اور فتویٰ پر لکھا نحن نحکم بالظاہر (ہم ظاہر پر حکم لگاتے ہیں) اور یہ ظاہرحال میں قابلِ کشتنی ہے ، اور فتویٰ ظاہر پر دیا جاتا ہے ، باطن کا حال خدا جانتا ہے ۔ اس طرح منصور کی وہ پیشگوئی پوری ہو گئی جو انھوں نے حضرت جنید کے

---

(۱) کارنامۂ بزرگان ایران ، ص ۷۹

جواب میں کی تھی کہ میں جس دن دار کی لکڑیوں کو اپنے خون سے سرخ کروں گا اس دن آپ اہل فتویٰ کا لباس پہنیں گے ۔

قید و بند :

منصور کو قتل سے پہلے جیل میں رکھا گیا وہ قید میں ایک سال رہے جیل کے دروازے پر مخلوق کا ہجوم رہنے لگا جو اُن سے مختلف مسائل پوچھتے تھے آخر ملنے والوں پر پابندی لگا دی گئی - پانچ مہینے تک اُن کے پاس کوئی نہیں گیا سوائے عطا ور عبداللہ بن خفیف کے، عطا نے ان کو سمجھایا کہ اے شیخ اپنے اس قول سے معذرت کیجیے تا کہ آپ اس قید سے چھٹکارا پائیں منصور نے جواب دیا کہ جس نے کہا ہے اسی سے کہو کہ وہ معذرت کرے عطا ، منصور کا یہ جواب سن کر رو دیے اور کہا ہم خود منصور کی سپاہ کے ایک لشکری ہیں ۔

قتل :

آخر خلیفہ نے اس خیال سے کہ فتنہ پیدا نہ ہو اُن کے قتل کا حکم دیا جس وقت ان کو دار پر چڑھانے کے لیے لے گئے ، اس وقت ایک لاکھ آدمیوں کا ہجوم ساتھ تھا وہ حق حق ''اناالحق'' کے نعرے لگاتے جاتے تھے - اسی درمیان ایک درویش نے ان سے پوچھا کہ عشق کیا ہے؟ منصور نے جواب دیا کہ عشق کا جلوہ تم آج دیکھو گے ، کل دیکھو گے اور پرسوں دیکھو گے چنانچہ ایسا ہی ہوا پہلے روز اُن کو قتل کیا گیا ، دوسرے روز ان کی لاش کو جلایا گیا ، تیسرے روز ان کی خاک کو ہوا میں اڑایا گیا[1]

---

(۱) منصور کے یہ تمام حالات تذکرۃالاولیا (تالیف شیخ فریدالدین عطار مطبوعہ لیدن ص ۱۳۵-۱۴۴ سے ماخوذ ہیں

منصور ۲۴ ذیقعدہ ۳۰۹ھ (۹۲۲ع) کو بغداد محلہ باب الطاق میں دار پر چڑھائے گئے[1] سفینۃالاولیا میں آن کے قتل کی تاریخ ۲۵ ذی الحجہ[1]، نفحات الانس میں ۲۴ ذیقعدہ مذکور ہے خزینۃالاصفیا میں ہے کہ منصور نے ستانوے سال کی عمر میں وفات پائی[2]

صاحب کارنامہ بزرگان ایران نے حضرت منصور کے قتل کی تفصیلات دیتے ہوئے لکھا کہ: منصور سیاحت کی غرض سے ہندوستان اور ماوراءالنہر گئے۔ اور اس سیرو سیاحت کے بعد بغداد آئے، اور تیسری مرتبہ حج کے لیے مکہ معظمہ گئے، اور عرفات میں قیام کے وقت انھوں نے دعا کی کہ اے خدا مجھے رسوا کر تاکہ لوگ مجھے برا بھلا کہتے رہیں۔

جب وہ مکے سے بغداد آئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ارشاد و تلقین میں ایسی باتیں کہنے لگے، جن کا اظہار خلاف مصلحت تھا، یہاں تک کہ بعض الفاظ ان کی زبان سے ایسے نکلے کہ جن کو سن کر لوگ کہنے لگے کہ انھوں نے خدائی کا دعوی کیا ہے۔ جب یہ چرچا عام ہوا تو ایک دن جامع مسجد بغداد میں منصور نے لوگوں سے کہا کہ مجھے قتل کردو تاکہ مجھے بھی آرام ملے اور تمھیں اس کا بدلہ ملے۔

۲۹۶ھ میں بغداد کی شورش کے زمانے میں اہواز چلے آئے اور چھپ کر زندگی گزارنے لگے، آخر وہ لوگوں کے ہاتھ آگئے، اور لوگ ان کو پکڑ کر بغداد لے گئے، اور انھیں قید کردیا گیا،

---

(۱) سفینۃالاولیا ص ۱۳۲ طبع نولکشور وخزینۃالاصفیا

(۲) فٹ نوٹ مقالات الشعرا مرتبہ سید حسام الدین راشدی ص ۳۳۲-۳۳۳ بحوالہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ص ۱۲۷

نو سال وہ جیل خانے میں رہے ، آخر ابو عمر حمادی نے جو اس وقت بغداد کے قاضی تھے ، منصور کے قتل کا فتویٰ دیا ۔ اور اس فتویٰ کی بنا پر خلیفہ مقتدر کے وزیر ابو محمد حامدبن عباس نے خلیفہ سے سے ان کے قتل کا حکم حاصل کرلیا ۔ آخر ۲۲ یا ۲۳ ذی قعدہ ۳۰۹ھ کو انہیں دار پر چڑھایا گیا ، پھر مثلہ کیا گیا ۔ لاش کو جلا کر اس کی راکھ کو دریائے دجلہ میں بہا دیا گیا ۔[۱]

آخری الفاظ :

منصور کی زبان پر آخری الفاظ یہ تھے حسب الواحد افراد الواحد پھر یہ آیت پڑھی : یستعجل بها الذین لا یومنون بها والذین آمنوا مشفقون منها و یعلمون انها الحق[۲]

---

(۱) کارنامہ بزرگان ایران ، ص ۸۲ - ۸۳

(۲) تذکرۃ الاولیا ۔ طبع لیدن ص ۱۴۴

۶

حضرت ابوسعید ابوالخیر

علامہ اقبال کی عقیدت

علامہ اقبال نے جاوید نامہ میں جن پاک مردوں کا تذکرہ کیا ہے اُن کے وہ اشعار ہم حضرت فضیل بن عیاض کے تذکرے میں نقل کر آئے ہیں اس لیے یہاں علامہ کے صرف ایک شعر پر اکتفا کیا جاتا ہے:

پاک مردان چوں فُضیل و بو سعید
عارفاں مثلِ جنید و بایزید

حالات

شیخ ابوسعید بن فضل اللہ بن ابی الخیر بابا طاہر[1] کے معاصر تھے،

---

(۱) بابا طاہر عریان ہمدانی: خیال کہ یہ چوتھی صدی ہجری کے آواخر میں پیدا ہوئے بابا طاہر صوفی اور اہلِ دل شاعر تھے، بابا طاہر نے ہمدان ہی میں وفات پائی، اور وہیں مدفون ہوئے، ان کی رباعیاں نہایت پُرسوز اور درد ناک ہوتی تھی، تاریخ ادبیات ایران (شفق) ص ۱۱۳ - ۱۱۵)

یہ بروز یکشنبہ یکم ماہ محرم ۳۵۷ھ (۹۶۷-۶۸ع) میں مہنہ شہر مشہور بہ ''میہنہ'' نواح خاوران خراسان میں پیدا ہوئے ، مرو میں ابو عبداللہ حصری[1] سے تحصیل فقہ کی اور شیخ ابو الفضل حسن سرخسی[2] ، ابو العباس احمد قصاب اور حضرت ابوالحسن خرقانی سے اکتساب فیض کیا ، اور حضرت ابو عبدالرحمٰن سلمی (متوفی ۴۱۲ھ) سے خرقۂ خلافت حاصل کیا ۔

شاعری :

حضرت ابو سعید ابوالخیر فارسی زبان کے شعرا میں صف اول کے شاعر شمار کیے جاتے ہیں ، وہ گیارہویں صدی عیسوی کے اکابر مشائخ میں ہیں ، شیخ ابو سعید نے رباعیوں میں اپنے صوفیانہ خیالات کی نشر و اشاعت کی انھوں نے فارسی رباعیات کا بیش بہا ذخیرہ چھوڑا ہے ، شعرالعجم میں مولانا شبلی نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ :

> سب سے پہلے صوفیانہ خیالات حضرت سلطان ابو سعید ابوالخیر نے ادا کیے ، وہ شیخ بو علی سینا کے معاصر تھے ، ان سے اور شیخ سے اکثر مراسلت رہتی تھی ، شیخ مشکل مسائل ان سے دریافت کرتا تھا اور وہ جواب دیتے تھے یہ مراسلات آج بھی موجود ہیں[3]

---

(۱) ابو عبداللہ خصری : بصرہ کے رہنے والے تھے ، فتح موصلی کے شاگرد تھے (نفحات الانس (اردو ترجمہ) ص ۱۳۰

(۲) شیخ ابو الفضل بن حسن سرخسی : ابو النصر سراج کے مرید اور شیخ ابو سعید ابو الخیر کے پیر ہیں نفحات (اردو ترجمہ) ص ۳۱۳

(۳) شعر العجم

تصوف حضرت ابو سعید ابوالخیر کے اخلاق و گفتار و کردار میں جلوہ گر تھا، نہایت منکسرالمزاج تھے خوش زبان اور شیریں بیان تھے، خدمت خاق ان کا شعار تھا، مال، دولت مندوں سے لے کر درویشوں میں تقسیم کرتے تھے، کینہ جوئی کو سخت ناپسند کرتے تھے شیخ فریدالدین عطار نے ان کی عظمت بزرگانہ کو ظاہر کرتے ہوئے لکھا کہ:

آں فانی مطلق، آں باقی بر حق، آں محبوب الٰہی، آں معشوق نامتناہی آں نازنین مملکت، آں بستانِ معرفت آں عرش فلک سیر، قطب عالم ابو سعید ابوالخیر قدس اللہ سرہ بادشاہ عہد بود بر جملہ اکابر و مشائخ[1]

حضرت سلطان ابو سعید کے علم و فضل کے متعلق لکھا کہ

اورادرانواع علوم بکمال بود، وچنیں گویند کہ در ابتدا سی ہزار بیت عربی خوانده بود، و در علم تفسیر و حدیث وفقہ و علم طریقت حظی وافر داشت... و در فقر و فنا وذل و تحمل شانی عظیم داشت[2]

تعلیم تصوف:

تصوف کے رموز و نکات کو نہایت دل اویز طریقے سے بیان کرتے ایک دفعہ لوگوں نے آن سے کہا کہ فلاں شخص پانی پر چلتا ہے، فرمایا یہ کوئی خاص بات تو نہیں مرغ اور مولا بھی تو پانی پر چلتے ہیں - پھر لوگوں نے کہا فلاں شخص ہوا

(۱) تذکرۃالاولیا (عطار) ص ۳۲۳ (۲) ایضاً ص ۳۲۳

میں اُڑتا ہے ، فرمایا یہ بھی کوئی خاص بات نہیں ۔ چیل اور مکھی بھی ہوا میں اُڑتی ہے ، پھر لوگوں نے کہا کہ فلاں شخص ایک لمحے میں ایک شہر سے دوسرے شہر چلا جاتا ہے ، شیطان بھی ایک دم میں مشرق سے مغرب چلا جاتا ہے ۔ تصوف میں ایسی باتوں کی زیادہ قدر نہیں ، مرد تو وہ ہے کہ لوگوں میں بیٹھے معاملات کرے شادی کرے اور معاشرے میں ملا جلا رہے اور ایک لمحے کے لیے بھی خدا سے غافل نہ ہو[1]

ایک دفعہ کسی نے پوچھا تصوف کی حقیقت کیا ہے ؟ فرمایا جو کچھ کہ تو سر میں رکھتا ہے ، اُسے نکال دے ، اور جو کچھ ہاتھ میں ہو ، اُسے ڈال دے ، اور جو کچھ تمہارے پاس آئے ۔ تو آپے سے باہر نہ ہو ، اللہ بس، اور اس کے ماسوا ہوس ہے، اور نفس منقطع ہے۔[2]

تصوف کا مسلک صلح کل ہے ، حضرت سلطان ابوسعید ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ ہر ایک سے خواہ وہ کسی مذہب و مسلک سے تعلق رکھتا ہو، نہایت خندہ پیشانی اور محبت سے پیش آتے تھے۔ اور اُن کو نہایت شفقت و محبت سے اسلام کی خوبیاں سمجھاتے تھے ، چنانچہ ایک دفعہ آپ اپنے مریدوں کے ساتھ عیسائیوں کے ایک گرجا میں گئے ، عیسائیوں کو آپ کی آمد سے نہایت مسرت و حیرت ہوئی، اور آپ کا یہ طریقۂ کار اتحاد و اُلفت کا سبب بنا۔[3]

اُس زمانے میں کہ شیخ ابو سعید نیشا پور میں تھے، ایک روز حیرہ کے قبرستان میں اپنے مریدوں کے ساتھ تشریف لے گئے، ایک شیخ کی قبر پر دیکھا لوگ شراب پی رہے ہیں، اور دف بجارہے ہیں، آپ کے

---

(۱) نفحات الانس (اُردو ترجمہ) ص ۳۳۵ - (۲) ایضاً ، ص ۳۳۶

(۳) تاریخ ادبیات ایران (شفق) ص ۱۱۷

مریدوں کو سخت غصہ آیا ، اور اُن کے مارنے کے لیے دوڑے، لیکن شیخ نے اس سے اُن کو روکا ، اور خود اُن کے پاس گئے ، اور اُن کے لیے دعائے خیر کی، وہ لوگ آپ کے اس طرز عمل سے بے حد متاثر ہوئے ، اور دوڑ کر آپ کے گھوڑے کے قدموں میں گرے، اور تائب ہو کر تمام شراب گرادی ، دف توڑ دیے ، اور تمام لوگوں کی زندگی کا رخ بدل گیا۔[1]

شاعری کا نمونہ

حضرت شیخ ابوسعید ابوالخیر کی شاعری کا اصل مرکز و محور عشق حقیقی ہے، انھوں نے عشق حقیقی کی آگ سے دلوں کو گرمایا ، ہم ان کی چند رباعیاں تبرکاً پیش کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

غازی برہ شہادت اندر تگ و پوست
غافل کہ شہید عشق فاضل ترازوست
در روز قیامت ایں بداں کے مانند
کیں کشتۂ دشمن است و آں کشتۂ دوست

دل جز رہ عشق تو نپوید ہرگز
جز الفت و درد تو نجوید ہرگز
صحرائے دلم عشق تو شورستاں کرد
تا مہر کسے دگر نہ روید ہرگز

کارنامۂ بزرگان ایران میں ہے کہ حضرت ابو سعید ابو الخیر

---

(۱) تاریخ ادبیات ایران (شفق) ص ۱۱۷

نے مقدمات علوم یعنی صرف ، نحو اور لغت کی تعلیم اپنے وطن میہنہ میں پائی ، پھر فقہ کی تعلیم کے لیے مرو گئے ، اور پانچ سال امام ابو عبداللہ خضری کے حلقہ درس میں شریک ہو کر فقہ کی تعلیم حاصل کی ، ان کی وفات کے بعد امام ابوبکر قفال مروزی سے مزید فقہ کی تعلیم حاصل کی ، پھر سرخس آئے ، اور امام ابو علی زاہد بن احمد سے تفسیر اور حدیث کی تعلیم حاصل کی ، وہیں ان کی ملاقات لقمان سرخسی مجذوب سے ہوئی ، وہ ان کو پیر ابوالفضل محمد بن حسن سرخسی کی خدمت میں لے گئے جنھوں نے حضرت ابو سعید ابوالخیر کو تصوف کی تعلیم سے بہرہ ور کیا پھر وہ ریاضتوں اور مجاہدوں کے بعد پیر ابوالفضل کے حکم سے نیشا پور تشریف لے گئے ، اور وہاں ابو عبدالرحمٰن محمد بن حسین بن محمد سلمی نیشا پوری سے خرقہ خلافت حاصل کیا ، اور اپنے وطن میہنہ آئے ، اور وہاں خانقاہ قائم کر کے رشد و ہدایت میں مصروف ہو گئے ، پیر ابوالفضل کی وفات کے بعد انھوں نے آمل میں حضرت ابو العباس احمد بن محمد بن عبدالکریم قصاب سے خرقہ خلافت حاصل کیا ۔[1]

وفات :

حضرت سلطان ابو سعید ابوالخیر نے میہنہ میں ۴ شعبان ، شب جمعہ ۴۴۰ھ (۱۰۴۹ء) میں وفات پائی ، مرض الموت میں ان سے کسی نے پوچھا کہ آپ کے جنازے کے سامنے قرآن مجید کی کون سی آیتیں پڑھیں ؟ فرمایا کہ قرآن مجید کی آیتیں اس سے بلند ہیں کہ

---

(۱) کارنامہ بزرگان ایران ، ص ۱۳۸ تا ۱۴۰

مجھ جیسے گنہگار پر پڑھی جائیں، میرے لیے تو یہ شعر ہی کافی ہوں گے

بہتر از این در جہان ہمہ چہ بود کار
دوست بر دوست رفت، یار بیار
آن ہمہ اندوہ بود، وایں ہمہ شادی
آن ہمہ گفتار بود، ایں ہمہ کردار!

(۱) تاریخ ادبیات ایران (شفق) ص ۱۱۷

۷

حضرت داتا گنج بخش

بارگاہ حضرت داتا گنج بخش میں علامہؒ اقبال کا خراج عقیدت

برصغیر پاک و ہند کے سب سے پہلے اور سب سے جلیل القدر عالم و صوفی و درویش حضرت داتا گنج بخش ہیں، جو سلطان مسعود بن محمود غزنوی (۴۲۲-۴۳۲ھ) کے آخری عہد حکومت میں لاہور تشریف لائے، اور اس شہر میں تشریف فرما ہو کر رشد و ہدایت کا چراغ روشن کیا انہوں نے اپنے مواعظ، ملفوظات، تصانیف اور فیضان ظاہری و باطنی سے اس برصغیر پاک و ہند میں اسلام کا نور دور دور تک پھیلا دیا، اسلامی تصوف کے سرچشمے جو عجمی خیالات و اثرات کی آمیزش سے گدلے ہوچکے تھے، آپ نے اس کو نتھارا اور خالص اسلامی تصوف کی طرف اہل عرفان کا رخ موڑا۔ گیارہویں صدیں عیسوی کی تصوف کی تاریخ میں حضرت داتا گنج بخش ہجویریؒ کو نہایت اہمیت حاصل ہے، انہوں نے ایک طرف تصوف کے متعلق عوام کی غلط فہمیوں کو دور کیا، دوسری طرف اسلامی تصوف کی راہیں کھول دیں، حضرت داتا گنج بخش نے تصوف کو اسلامی شریعت سے قریب لانے کی انتھک کوشش کی، اور حقیقی تصوف کو عوام تک پہنچانے میں ان کا بڑا حصہ ہے۔

علامہؒ اقبال حضرت داتا گنج بخش ہجویری سے بہت زیادہ

متاثر ہیں، وہ ان کی بارگاہ میں اپنے جذباتِ عقیدت کو پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

سیدِ ہجویر مخدومِ امم
مرقدِ او پیرِ سنجر را حرم
بند ہائے کہسار آساں گسیخت
در زمینِ ہند تخمِ سجدہ ریخت
عہدِ فاروق از جمالش تازہ شد
حق از حرفِ او بلند آوازہ شد
پاسبانِ عزتِ ام الکتاب
از نگاہش خانۂ باطل خراب
خاکِ پنجاب از دم او زندہ گشت
صبح ما از مہرِ او تابندہ گشت
عاشق و ہم قاصدِ طیارِ عشق
از جبینش آشکار اسرارِ عشق[1]

حالات :

آپ کا اسم گرامی علی، ابوالحسن کنیت اور داتا گنج بخش لقب ہے آپ کے والد محترم کا نام نامی سید عثمان ہے، آپ کا سلسلۂ نسب حضرت امام حسنؓ سے جا ملتا ہے۔[2]

آپ کو ہجویری اور جلابی اس لیے کہتے ہیں کہ مدتوں غزنی کے نواحی محلوں یا گاؤں میں آپ کا قیام رہا۔

آپ کی ولادت باسعادت ۴۰۰ھ (۱۰۰۹-۱۰ء) میں ہوئی۔[2]

(۱) اسرار و رموز، ص ۵۷ - ۵۸ (۲) بزم صوفیہ، ص ۱

تعلیم و تربیت :

آپ کی ابتدائی زندگی اور تعلیم کے متعلق تفصیل تذکروں اور تاریخوں میں بہت کم ملتی ہے، لیکن کشف المحجوب میں آپ نے اپنے جن اساتذہ کا تذکرہ کیا ہے، ان میں حضرت ابوالعباس بن محمد شقانی ہیں حضرت ہجویری ان کے فضائل و مناقب کو ان الفاظوں میں بیان فرماتے ہیں:

مرا با وے آنسے عظیم بود وے را بر من شفقتے صادق و در بعضے علوم استاد من بود ... شرع را بنزدیک وے تعظیم بیشتر بود۔[1]

(ترجمہ)

مجھے ان سے بے حد انسیت تھی اور وہ مجھ پر غیر معمولی شفقت فرماتے تھے اور بعض علوم میں میرے استاد تھے... شریعت کی بیحد تعظیم فرماتے تھے۔

کشف المحجوب میں ایک جگہ آپ نے اپنے دوسرے استاد ابو جعفر بن مصباح صیدلانی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ:

وہ رؤسائے متصوف میں تھے تحقیق میں ان کی زبان اچھی تھی حسین بن منصور سے بہت محبت رکھتے تھے میں نے ان کی بعض تصانیف ان سے پڑھیں۔[2]

ان کے علاوہ آپ کے جن اساتذہ کا تذکرہ ہمیں کشف المحجوب میں ملتا ہے ان میں شیخ ابوالقاسم بن علی بن عبداللہ گرگانی ہیں

---

(۱) بزم صوفیہ، ص ۳۱ (۲) کشف المحجوب

حضرت ہجویریؒ نے ان کے متعلق لکھا کہ؛

مرا باوے اسرار بسیار بود اگر باظہار آیات وے مشغول گردم از مقصود بمانم[1]

(ترجمہ)

مجھے ان کے ساتھ بڑا راز و نیاز تھا اگر میں ان نشانیوں کے ظاہر کرنے میں مشغول ہوجاؤں تو اصل مقصد فوت ہوجائے گا۔[2]

بیعت :

حضرت داتا گنج بخش نے جن بزرگ سے روحانی تعلیم و تربیت حاصل کی وہ حضرت شیخ ابوالفضل محمد بن حسن ختلی علیہ الرحمہ ہیں یہ بزرگ سلسلہ جنیدیہ میں منسلک تھے حضرت داتا گنج بخش ہجویری نے ان کے حالات کو قلم بند کرتے ہوئے لکھا کہ؛

وہ (شیخ ابوالفضل) اوتاد کی زینت اور عابدوں کے شیخ تھے میں طریقت میں آن ہی کا پیرو ہوں وہ علم تفسیر اور روایات کے عالم تھے اور تصوف میں حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک رکھتے تھے اور حضرت حصری رحمتہ اللہ علیہ کے مرید اور راز دار تھے ابو عمر قزوینی اور ابوالحسن سالبہ کے ہمعصر تھے ساٹھ سال تک گمنامی کی حالت میں گوشہ گیر ہو کر خلقت سے دور رہے آن کا قیام زیادہ تر کوہ لگام میں رہتا تھا انھوں نے اچھی عمر پائی ان کی ولایت کی بہت سی

---

(۱) کشف المحجوب (۲) ایضاً

دلیلیں ہیں لیکن ظاہری لباس اور رسوم صوفیہ کی نہ
رکھتے تھے میں نے ان سے زیادہ پُر رعب کسی کو نہ
دیکھا فرمایا کرتے تھے الدنیا یوم ولنا فیھا صوم[1]

مرشد کی وفات :

کشف المحجوب میں آپ نے اپنے شیخ حضرت ابوالفضل محمد بن حسن ختلی کی وفات کا تفصیلی تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا کہ:

جس روز آپ (حضرت ابوالفضل محمد بن حسن ختلی) کی وفات ہوئی آپ بیت الجن میں تھے یہ پہاڑی پر ایک گاؤں ہے جو دمشق اور مانیازر کے درمیان ہے اس وقت آپ کا سر میری گود میں تھا اور میرے دل میں ایک دوست کی طرف سے کچھ رنج تھا۔ آپ نے مجھ سے فرمایا اے بیٹے! اپنے اعتقاد کا مسئلہ تم کو بتاتا ہوں اگر تم اس کے مطابق اپنی اصلاح کرلو گے تو سب رنجوں سے نجات پاجاؤ گے وہ یہ ہے کہ خدا ہر جگہ اور ہر وقت اچھوں اور بُروں کو پیدا کرتا ہے اس لیے تمھیں ان کے کسی فعل پر رنجیدہ نہ ہونا چاہیے، اور نہ دل میں کسی تکلیف کو جگہ دینی چاہیے اس کے سوا کوئی وصیت نہیں فرمائی اور جاں بحق ہوئے۔[2]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لاہور تشریف لانے کے بعد دوبارہ

---

(۱) کشف المحجوب ، ذکرائمہ متاخرین ، نفحات الانس (اردو ترجمہ) ص ۳۳۶

(۲) کشف المحجوب ۔ ذکرائمہ متاخرین و نفحات الانس (اردو ترجمہ) ص ۳۳۶

آپ اپنے مرشد کی خدمت میں گئے تھے اس وقت یہ واقعہ پیش آیا اور مرشد کے وصال کے بعد آپ پھر لاہور تشریف لے آئے۔

سیر و سیاحت :

قدیم صوفیہ کے دستور کے مطابق تزکیہ باطن اور روحانی کمال کے لیے آپ نے اسلامی ممالک شام - بغداد - عراق - ایران آذر بائیجان - طبرستان - خوزستان - کرمان - ماوراء النہر اور ترکستان وغیرہ کی خوب سیاحت کی، اور ہر مقام کے اولیائے عظام اور صوفیائے کرام کی صحبتوں سے مستفیض ہوئے۔[1]

ریاضتیں اور مجاہدے:

راہ سلوک و معرفت میں جو ریاضتیں اور مجاہدے آپ نے کیے، ان کا تذکرہ جا بجا آپ نے کشف المحجوب میں فرمایا ہے، کشف المحجوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

> ایک مرتبہ راقم علی بن عثمان جلابی کسی مشکل میں گرفتار ہوا، اس سے نکلنے کے لیے میں نے مختلف ریاضتیں کیں... پھر میں حضرت بایزید بسطامی کے مزار پر تین مہینے تک حاضر رہا۔ روز غسل کرکے بیٹھتا تھا مگر وہ مشکل حل نہ ہوتی تھی،لہٰذا میں نے خراسان جانے کی ٹھانی ۔ ایک گاؤں میں پہنچا تو ایک خانقاہ میں تصوف کے کچھ مدعیوں کی ایک جماعت نظر آئی، میں موٹا اور کھردرا لباس پہنے ہوئے تھا، ہاتھ میں عصا اور

(۱) حضرت داتا گنج بخش (پروفیسر شیخ عبدالرشید) ص ۲۲

پانی کا برتن تھا اس جماعت نے مجھے بنگاہِ تحقیر دیکھا اور ان میں سے کسی نے مجھے نہیں پہچانا میری ظاہری حالت دیکھ کر وہ لوگ کہنے لگے کہ یہ شخص ہمارے گروہ کا نہیں اور واقعی میں ان میں سے نہ تھا لیکن وہاں رات گزارنا میرے لیے ضروری تھا ان لوگوں نے مجھے خانقاہ کے نچلے حصے میں ٹھہرایا اور وہ خود اوپر کی منزل میں ٹھہرے کھانے کے وقت ایک سوکھی روٹی مجھ کو دی ، ان کے لذیذ کھانوں کی خوش بو برابر میری ناک میں آتی رہی ، وہ چھت پر سے مسلسل طنز آمیز فقرے مجھ پر کستے رہے ، جب وہ کھانا کھاچکے تو خربوزے کھانے لگے ، اور ازراہ تمسخر چھلکے مجھ پر پھینکتے رہے ، اور طنز کی باتیں کرتے رہے ، مگر وہ جتنا زیادہ طنز کرتے تھے اتنا ہی میرا دل ان سے خوش ہوتا تھا ، اس طرح ملامت سننے سے میری وہ مشکل حل ہوگئی ، اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ مشائخ جاہلوں کو اپنے یہاں کیوں جگہ دیتے ہیں ، اور ان کی بے تمیزیاں کیوں گوارا کرتے ہیں ۔

مسلسل طویل عرصے تک سفر میں رہنے کے باوجود ہمیشہ نماز باجماعت پڑھتے ، اور نماز جمعہ کے لیے بالالتزام کسی شہر میں قیام فرماتے ۔ اپنے مرشد کی طرح صوفیوں کی ظاہری نمود و نمائش سے متنفر تھے اور ان ظاہری رسوم کو معصیت اور ریا سے تعبیر فرماتے تھے۔

ازدواجی زندگی :

آپ کی ازدواجی زندگی کے متعلق ہمیں کوئی روایت نہیں ملتی ، کشف المحجوب کے بعض اندراجات سے ایسا معلوم ہوتا ہے

کہ آپ نے شادی نہیں کی ، کشف المحجوب میں ہے کہ

میں کہ علی بن عثمان جلابی ہوں ، حق تعالیٰ نے گیارہ سال تک شادی کی آفت سے محفوظ رکھا ۔ پھر تقدیر سے آزمائش میں ڈالا گیا ، میرا ظاہر و باطن ایک پری صفت عورت کا اسیر ہوا بغیر اس کے کہ میں نے اس کو دیکھا ہو ، ایک سال تک اس کے خیال میں غرق رہا ، قریب تھا کہ میرا دین برباد ہوجائے کہ حق تعالیٰ نے کمال لطف و فضل سے میرے بدبخت دل کو بچالیا ، اور مجھے اس مصیبت سے نجات دی ۔

لاہور میں تشریف آوری :

حضرت داتا گنج بخش سلطان مسعود بن محمود غزنوی کے آخیر دور حکومت میں اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ مختلف ممالک اسلامیہ کی سیاحت کرتے ہوئے لاہور تشریف لائے ، یہ وہ زمانہ تھا کہ ایک طرف سلاجقہ فرمانرواؤں نے اور دوسری طرف ہندو راجاؤں کی مزاحمت نے غزنوی سلطنت کو پارہ پارہ کر رکھا تھا ۔

فوائد الفواد میں ہمیں آپ کی لاہور تشریف لانے کی تفصیلات ملتی ہیں ۔ حضرت خواجہ نظاالدین محبوب الٰہی فرماتے ہیں کہ :

شیخ حسین زنجانی اور شیخ علی ہجویری دونوں ایک ہی پیر کے مرید تھے ، اور ان کے پیر اپنے عہد کے قطب تھے ۔ حسین زنجانی عرصے سے لہاور (لاہور) ہیں مقیم تھے ۔ کچھ دنوں کے بعد ان کے پیر نے خواجہ علی ہجویری سے کہا کہ لہاور میں جا کر قیام کرو ، شیخ علی ہجویری نے کہا کہ

وہاں شیخ حسین زنجانی موجود ہیں ۔ لیکن ان کے پیر نے پھر فرمایا کہ تم لہاور جاؤ ، جب علی ہجویری اپنے پیر کے ارشاد کی تعمیل میں لہاور آئے ، تو رات تھی ، صبح کو شیخ حسین زنجانی کا جنازہ باہر لایا گیا ۔

لاہور آکر حضرت داتا گنج بخش نے اس جگہ قیام کیا ، جہاں آج آپ کا مزار پُر انوار زیارت گاہ خاص و عام ہے ۔ یہاں آکر انھوں نے ایک مسجد بنوائی ۔ پھر کچھ دن تک درس دیتے رہے ، پھر تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے ۔

داراشکوہ نے سفینۃ الاولیا' میں لکھا ہے کہ : حضرت علی ہجویری لاہور میں دن کے وقت تعلیم دیتے ، اور رات کو طالبان حق کو ہدایت کیا کرتے ، ان کی رہبری سے ہزاروں جاہل عالم بن گئے ، کافروں نے اسلام قبول کیا ، گمراہوں نے ہدایت کی راہ پائی ، دیوانے ہوش مند ہو گئے ، جن کا علم ناقص تھا ، کامل ہوئے ، فاسق و فاجر پارسا بن گئے ، ان دنوں لاہور ان علما' کا مرکز تھا ۔ جنھوں نے حضرت علی ہجویری کی تعلیم سے فیض پایا تھا ۔

تبلیغِ اسلام :

بہت سے لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ۔ جن میں سے ایک رائے راجو جو سلطان مودود بن مسعود غزنوی کی طرف سے لاہور کا نائب تھا ، اسلام لانے کے بعد آپ نے اس کا نام ''شیخ ہندی'' رکھا ، اسی کی اولاد سے آپ کے مزار کے خدام و مجاورین ہیں ۔[1]

---

(۱) آب کوثر ، ص ۸۶

تصوف کی اصلاح :

یہی وہ زمانہ تھا کہ تصوف کے سرچشمے قرآن و حدیث سے ہٹ کر صوفیائے خام کے ہاتھوں گدلے ہورہے تھے، صوفیائے خام نے اسلامی تصوف کو مسخ کر کے اس کے اصلی خدو خال کو بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ آپ نے اس قسم کے صوفیہ کے خلاف آواز اٹھائی اور تصوف کو خالص اسلامی صورت میں نکھار کر پیش کیا۔ آپ تصوف میں دینی اصولوں پر بڑی شدت سے عامل تھے، آپ نے حسین فارسی اور ابو سلمان حلولی کے فرقوں کو جنھوں نے تصوف میں بڑی بے راہ روی اختیار کی تھی، ملحد اور لعنتی کہا ہے، کشف المحجوب میں ''گروہ حلولیہ'' کے ضمن میں ان دونوں فرقوں کے متعلق فرمایا کہ :

> میں نہیں جانتا فارسی کون اور ابو سلمان کون ہے۔ اور انھوں نے کیا باتیں کہی ہیں ۔ جو شخص توحید کے خلاف عقیدہ رکھتا ہو، اس کا دین اسلام میں کوئی مقام نہیں، چونکہ اصل دین ہے، وہ تصوف جو اس کا نتیجہ اور اس سے مشتق نہ ہو، مستحکم نہیں ہوسکتا ۔[۱]

لاہور کی زندگی :

لاہور میں حضرت داتا گنج بخش نے زندگی کیسے گزاری ؟ افسوس ہے کہ اس کی تفصیلات ہمیں تذکروں اور تاریخوں میں نہیں ملتیں، پروفیسر شیخ عبدالرشید نے اپنے رسالے ''حیات و تعلیمات

---

(۱) تذکرہ صوفیائے پنجاب۔ تالیف اعجازالحق قدوسی ص ۵۱، بحوالہ کشف المحجوب

حضرت داتا گنج بخش“ میں آپ کی لاہور کی زندگی کے ضمن میں آپ کے حالات زندگی آپ کی کتاب کشف الاسرار سے نقل کیے ہیں کہ حضرت علی ہجویری لکھتے ہیں کہ : میں ایک بزرگ حسام الدین سے ملا ، اور ان کی پارسائی سے بےحد متاثر ہوا ؛ میں نے التجا کی کہ میری روحانی ترقی کے لیے کچھ ارشاد فرمایے ؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہر دم لوگوں کی دل جوئی اور تسکین میں مصروف رہو ، تاکہ وہ اپنا غم بھول جائیں …… کسی کے جذبات کو ٹھیس نہ لگاؤ …… حاصل کیا ہوا علم ضائع نہ کرو …… ہر وقت اپنے مرشد سے لو لگائے رکھو ۔[1]

کشف الاسرار میں ایک اور شخص کریم اللہ کا بھی ذکر ہے ، جو بہت مالدار آدمی تھا ، اور جس کا سب کچھ یعنی زن و فرزند اور دولت تباہ ہوگئی تھی ، آپ نے اس کا یہ واقعہ اپنے مریدوں کو سمجھانے کے لیے بیان کیا کہ وہ دنیاوی سازو سامان کو ناپائیدار سمجھیں ۔

علامہ اقبال کی ایک روایت :

علامہ اقبال نے مثنوی اسرار و رموز میں حضرت داتا گنج بخش کا ایک واقعہ نظم کیا ہے کہ جب وہ لاہور میں مقیم تھے ، ہم اپنے الفاظ میں اس واقعے کو اختصار کے ساتھ یہاں درج کرتے ہیں ، فرماتے ہیں کہ :

ایک نوجوان کُرد سے حضرت داتا گنج بخش کی خدمت میں لاہور حاضر ہوا ، اور اس نے عرض کیا کہ میں دشمنوں کی یلغار میں گھرا ہوا ہوں ، مجھے دشمنوں میں زندگی بسر کرنے کا کوئی

---

(۱) حیات و تعلیمات حضرت داتا گنج بخش ۔ مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ ، لاہور

طریقہ بتائیے؟ آپ نے فرمایا اے زندگی کے راز اور آغاز و انجام سے ناواقف! زندگی کا راز یہ ہے کہ دشمنوں کے اندیشہائے دور دراز سے بےنیاز ہوکر اپنی خوابیدہ قوتوں کو محسوس کرو، اس کو مثالاً یوں سمجھو کہ اگر پتھر اپنے آپ کو شیشہ سمجھنے لگے، تو وہ رفتہ رفتہ شیشہ ہوجائے گا، اور یقیناً گر کر ٹوٹے گا، اگر کوئی مسافر اپنے میں خود کمزوری محسوس کرنے لگے، تو وہ یقیناً رہزنوں کے ہاتھوں لٹے گا۔ تم کب تک اپنے آپ کو پانی اور مٹی سمجھتے رہو گے، اپنی مٹی سے شعلۂ طور پیدا کرو۔ یاد رکھو جس نے مقام خودی کو پہچان لیا۔ فضل حق اس کے شامل حال ہوگا۔ خواہ اس کا دشمن کتنا ہی قوی کیوں نہ ہو، اگر تم اپنے آپ کو خودی سے مزیّن کرلو گے تو ایک جہان کو شکست دے سکتے ہو، یاد رکھو فنا اس کا مقدر ہے، جو اپنی خودی کو فراموش کردیتا، اور بقا اس کی تقدیر ہے، جو اپنے اندر خودی کو بیدار کرتا ہے، تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ خود سے غفلت اور بیگانگی موت ہے۔ جس میں خودی کا جذبہ مُردہ ہوگیا تو وہ مرچکا، تمھیں کیا معلوم کہ موت و حیات میں کیا فرق ہے، خودی کے عرفان میں تمھیں حضرت یوسفؑ کی طرح ہونا چاہیے تاکہ ابتری سے شہنشاہی کے مرتبے کو پہنچو۔ اپنی خودی کو پہچانو، اور عاقبت اندیش انسان بنو۔ تاکہ تم بھی مردانِ حق اور حاملِ اسرار لوگوں میں جگہ پاسکو۔[1]

ممکن ہے کہ یہ روایت تمثیلی ہو، لیکن چوں کہ یہ روایت بہت سی بصیرتیں اپنے اندر رکھتی ہے، اس لیے ہم نے اس کو نقل کر دیا۔

---

(۱) کلیات اقبال فارسی (اسرار و رموز) ص ۵۱ تا ۵۳

تصانیف :

حضرت داتا گنج بخش متعدد کتابوں کے مصنف تھے ، ان میں سے کشف المحجوب آپ کی سب سے زیادہ مقبول اور مشہور تصنیف ہے ، کشف المحجوب میں آپ نے اپنی جن دوسری تصانیف کا تذکرہ کیا ہے ۔ ان میں (۱) منہاج الدین (۲) کتاب انضا و البقا (۳) اسرار الخرق و المئونات (۴) کتاب البیان لاہل العیان (۵) بحر القلوب (۶) الرعایۃ لحقوق اللہ (۷) رسالہ در شرح کلام حلاج اور رسالہ الایمان ہیں ۔ کشف المحجوب میں آپ نے اپنے ایک دیوان کا بھی تذکرہ کیا ہے ، جو اب نایاب ہے ۔[1]

کشف المحجوب کی پہلی فصل میں آپ نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہ آپ نے اس کتاب کے شروع میں اپنا نام کیوں لکھا ۔ واضح کیا ہے کہ کس طرح آپ کا مجموعۂ اشعار رائیگاں ہوا ۔ فرماتے ہیں کہ :

> کتاب کے اولین حصے میں جو میں نے اپنا نام لکھا ہے ، اس سے دو چیزیں مراد ہیں ، ایک نصیب خاص ، اور دوسری نصیب عام جو کچھ نصیب عام سے تعلق ہے ، اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کم علم لوگ اس موضوع کی کوئی کتاب دیکھتے ہیں تو اس میں اصل مصنف کا کئی ایک جگہ نام نہیں پاتے ، تو اسے اپنی طرف منسوب کر کے کتاب کی مقصدیت کو فوت کر دیتے ہیں ، کیونکہ مصنف کا اپنے نام کی اشاعت سے بقائے دوام مقصود ہوتا ہے ۔ اور خواہش رکھتا ہے کہ اس کی کتاب سے مستفید ہونے والے اسے نیک دعاؤں

---

(۱) تذکرہ صوفیائے پنجاب ۔ ص ۵۱

سے یاد کریں - میرے ساتھ یہ واقعہ ہوچکا ہے ، ایک دفعہ کسی نے میرے اشعار کا مجموعہ طلب کیا، میرے پاس اس کی نقل نہیں تھی ، اس نے اسے واپس نہیں کیا ، اور آغاز کتاب سے میرا نام محو کر کے میری تمام کاوشوں کو رائیگاں کر دیا ، خدا اس پر رحم کرے - میں نے منہاج الدین کے نام سے ایک اور کتاب تالیف کی تھی ، جو تصوف کے موضوع سے متعلق تھی ، ایک پست احساس مدعی علم نے اس پر سے میرا نام مٹا کر خود سے منسوب کیا ، اور لوگوں میں مشہور کیا کہ وہ اس کی تالیف ہے ، عوام و خواص اس کی اس حرکت پر ہنستے رہے ، نوبت یہاں تک پہنچی کہ خدا نے اسے مردود قرار دیا اور اس کا نام محو کردیا گیا۔

کشف المحجوب

کشف المحجوب فارسی زبان میں تصوف کی پہلی کتاب ہے ، جو پاکستان کے مشہور اور قدیم شہر لاہور میں حضرت داتا گنج بخش ہجویری نے لکھی ، یہ کتاب ہر دور میں اپنی غیر معمولی مقبولیت کی وجہ سے بے نظیر سمجھی گئی ، کشف المحجوب پر سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی نے تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ:

> کشف المحجوب از تصنیف شیخ علی ہجویری است قدس اللہ روحہ العزیز ، اگر کسے را پیرے نباشد ، چوں ایں کتاب را مطالعہ کند پیدا شود ، و من ایں کتاب را تمام مطالعہ کردہ ام[1] -

---

(۱) بزم صوفیہ ، بحوالہ درر نظامی -

ترجمہ: (کشف المحجوب حضرت شیخ علی ہجویری قدس اللہ روحہ العزیز کی تصنیف ہے، اگر کسی کا پیر نہ ہو تو جب اس کتاب کا مطالعہ کرے گا (تو یہ کتاب) اس کے پیر کا کام دے گی۔ میں نے اس تمام کتاب کا مطالعہ کیا ہے۔)

مولانا جامی نے نفحات الانس میں کشف المحجوب کی غیر معمولی افادیت اور اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرمایا:

علی بن عثمان بن ابی علی الجلابی الغزنوی قدس سرہ، کنیت وے ابوالحسن است، عالم و عارف بودہ، مرید شیخ ابوالفضل بن حسن ختلی است، و بصحبت بسیارے از مشائخ دیگر رسیدہ است۔ صاحب کتاب کشف المحجوب است کہ از کتب معتبرہ مشہورہ دریں فن است، و لطائف و حقائق بسیار در آں کتاب جمع کردہ است[1]۔

ترجمہ: (علی بن عثمان بن ابی علی الجلابی غزنوی قدس سرہ کی کنیت ابوالحسن ہے، جو عالم و عارف تھے، اور شیخ ابوالفضل بن حسن ختلی کے مرید ہیں، اور بہت سے دوسرے مشائخ کی صحبت میں بھی رہے ہیں۔ کتاب کشف المحجوب کے مصنف ہیں، جو اس فن کی معتبر کتابوں میں مشہور ہے، اور اس میں آپ نے بہت سے لطائف و حقائق جمع کیے ہیں۔)

دار شکوہ نے کشف المحجوب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

حضرت علی ہجویری را تصنیف بسیار است۔ اما کشف المحجوب مشہور و معروف است، و ہیچ کس را بر آں سخن نیست، و مرشدے است کامل۔ در کتب تصوف بخوبی آں در زبان فارسی کتابے تصنیف نشدہ[2]۔

---

[1] نفحات الانس بضمن تذکرہ حضرت ہجویری۔

[2] سفینۃ الاولیاء، ص ۲۸۲

(ترجمہ) : حضرت علی ہجویری کی بہت سی تصانیف ہیں، لیکن کشف المحجوب مشہور و معروف ہے، کسی کو اس پر لب کشائی کا موقع نہیں، یہ کتاب رہروانِ طریقت کے لیے مرشد کامل ہے؛ تصوف کی کتابوں میں فارسی زبان میں اس خوبی کی کوئی دوسری کتاب تصنیف نہیں ہوئی۔)

پروفیسر نکلسن نے کشف المحجوب کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ انھوں نے کشف المحجوب کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا کہ :

(یہ وہ کتاب ہے کہ جس سے پہلی مرتبہ یہ برِ صغیر پاک و ہند اسلامی تصوف سے متعارف ہوا۔)

یہ کتاب حضرت داتا گنج بخش نے اپنے ساتھی ابوسعید ہجویری کے ایک استفسار پر جو آپ کے ساتھ غزنی سے لاہور آئے تھے تصنیف کی، آقائی عبدالحی حبیبی کا قیاس ہے کہ کشف المحجوب کی تالیف ۴۸۱ھ اور ۵۰۰ھ کے درمیان ہوئی۔ کشف المحجوب پچیس ابواب پر مشتمل ہے، ہر باب چند فصلوں میں منقسم ہے، دیباچے میں حقیقی تصوف اور اس کی اہمیت کا بیان ہے۔

وفات :

آپ کے اکثر تذکرہ نگار اس پر متفق ہیں کہ حضرت داتا گنج بخش نے ۴۶۵ھ میں وصال فرمایا۔ اور یہی تاریخ وفات لاہور میں آپ کے مقبرے پر بھی درج ہے۔ مشہور محقق آقائے عبدالحی حبیبی نے اپنے مدلل و مبسوط مقالے میں جو اورنٹیل کالج میگزین جلد ۳۶ میں شائع ہوا ہے، کشف المحجوب کی داخلی شہادت کی بنا پر حضرت ہجویریؒ کی تاریخ وفات کا تعین ۴۸۱ھ (۸۹-۱۰۸۸ء) اور ۵۰۰ھ (۷-۱۱۰۶ء) کے درمیان کیا ہے۔

فضائل و مناقب :

حضرت داتا گنج بخش ہجویری کی جلالت شان اور علوئے مرتبت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ خواجۂ بزرگ حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ نے آپ کے مزار مبارک پر چلہ کھینچا تھا، چلہ پورا کرنے کے بعد جب رخصت ہونے لگے تو یہ شعر پڑھا:

گنج بخش ہر دو عالم مظہر نور خدا
ناقصاں را پیر کامل ، کاملاں را رہنما

عام روایت ہے کہ اسی وقت سے آپ کا لقب داتا گنج بخش مشہور ہو گیا۔ پروفیسر شیخ عبدالرشید نے اپنے رسالے "داتا گنج بخش" میں بحوالۂ کشف الاسرار لکھا کہ آپ اپنی زندگی میں "گنج بخش" کہلاتے تھے، خود کشف الاسرار میں آپ یہ گلہ کرتے ہیں کہ لوگ مجھے "گنج بخش" کہتے ہیں، حالاں کہ میں نادار آدمی ہوں۔

حضرت داتا گنج بخش کا مزار لاہور میں بھاٹی گیٹ کے باہر واقع ہے، آپ کا مزار سفید سنگ مرمر کے چبوترے پر ہے۔ وسط میں حضرت داتا گنج بخشؒ کی قبر ہے، اور پہلوؤں میں شیخ احمد سرخسی کی اور ابو سعید ہجویری کی قبریں ہیں، یہ وہی ابو سعید ہجویری ہیں، جن کی فرمائش پر آپ نے کشف المحجوب لکھی تھی۔[1]

---

[1] یہ تمام تفصیل "حیات و تعلیمات حضرت داتا گنج بخش" (پروفیسر شیخ عبدالرشید) ص ۲۶ تا ۲۸ سے ماخوذ ہے۔

۸

حضرت اویس قرنی رح

تجھے نظارے کا مثل کلیم سودا تھا
اویس طاقت دیدار کو ترستا تھا

عشق کو عشق کی آشفتہ سری کو چھوڑا
رسم سلمان و اویس قرنی کو چھوڑا

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بوذر رض و دلق اویس رض و چادر زہرا رض

—:o:—

علامہ اقبال کے اردو مجموعہ کلام میں ہمیں حضرت اویس قرنی رح کے متعلق جو اشعار ملتے ہیں ، وہ علامہ کی حضرت اویس قرنی رح سے غیر معمولی عقیدت کے مظہر ہیں -

حضرت اویس رح کا شمار تابعین اور طبقہ اول کے صوفیہ میں ہوتا

ا حضرت اویس قرنی کے حالات ، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بعد آنے چاہییں تھے ، ہم معذرت خواہ ہیں کہ یہ حالات سہواً اپنی جگہ درج نہ ہوسکے -

ہے، وہ عاشق رسول تھے، آنھوں نے اپنے قول و عمل سے محبت النبیؐ اور عشق رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے قلوب کو گرمایا، ان کی پوری زندگی سے توبہ و استغفار کی کیفیت ظاہر ہوتی تھی۔

حالات:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت اویسؓ کے متعلق فرمایا کہ اویس احسان و مہربانی کے اعتبار سے بہترین تابعین میں سے ہیں بعض مرتبہ آپ یمن کی جانب رخ کر کے فرمایا کرتے تھے کہ میں یمن کی جانب سے رحمت کی ہوا آتی ہوئی پاتا ہوں۔

ایک روز رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے صحابہؓ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ قرن میں اویس نامی ایک شخص ہے، قیامت کے دن وہ بقدر قبیلہؓ ربیعہ و مضر کی بھیڑوں کے میری امت کے لوگوں کی شفاعت کرے گا۔ پھر آپ نے حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ: تم اس کو دیکھو گے، وہ ایک شخص ہے درمیانے قد اور بالوں والا، اس کے بائیں پہلو پر بمقدار درہم ایک سفید داغ ہے، مگر وہ برص کا داغ نہیں، اس کے ہاتھوں اور ہتیلیوں پر بھی اس قسم کے نشانات ہیں، جب تم اس کو دیکھو تو میرا سلام پہنچانا، اور کہنا کہ میری امت کے حق میں دعا کرے۔ صحابہؓ کرامؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم سے پوچھا کہ وہ کون شخص ہے، اور کہاں مقیم ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اللہ کا ایک بندہ ہے، پھر صحابہؓ کے اصرار پر فرمایا کہ وہ اویس قرنیؓ ہے، جب صحابہ رضؓ نے عرض کیا کہ آپکے پیراہن کا حقدار کون ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ اویس قرنی۔

حضرت اویس قرنی اگرچہ عہد رسالت ماب صلی اللہ علیہ و آلہ

و سلم میں موجود تھے ، لیکن آپ کے دیدار سے مشرف نہ ہو سکے ، اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی والدہ مؤمنہ ، اور ضعیف و نابینا تھیں، ان کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا ، اور اویس اونٹوں کو چرا کر اُن کے لیے معاش حاصل کرتے تھے ، وہ اس مجبوری سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکے ۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے وفات کے بعد جب حضرت عمررض حضرت علی رض کے ساتھ حج کے ارادے سے مکہ معظمہ پہنچے تو آپ نے خطبے میں ارشاد فرمایا : اے اہل نجد! تم لوگ کھڑے ہو جاؤ ، چناں چہ وہ لوگ کھڑے ہو گئے ، پھر آپ نے پوچھا کہ تم میں سے کوئی قرن کا رہنے والا ہے ؟ انھوں نے کہا ہاں ، پھر انھوں نے چند لوگوں کو پیش کیا ، آپ نے اُن سے حضرت اویس قرنی رح کے متعلق دریافت کیا ، ایک نے اُن میں سے کہا کہ میں اُن سے پوری طرح تو واقف نہیں ، البتہ اویس نامی ایک دیوانہ ہے ، جو آبادیوں سے دور ایک وادی میں اونٹ چراتا ہے ، خشک روٹی اس کی غذا ہے ، وہ دنیاوی خوشی اور غم سے متاثر نہیں ہوتا ، جب لوگ ہنستے ہیں تو وہ روتا ہے ، اور جب لوگ روتے ہیں تو وہ ہنستا ہے ۔

بہرا سم حج ادا کرنے کے بعد حضرت عمررض اور حضرت علی رض دونوں حضرت اویس قرنی سے ملنے کے لیے قرن پہنچے ، جب وہ وہاں پہنچے تو حضرت اویس قرنی نماز میں مشغول تھے ، نماز ختم کرنے کے بعد وہ اُن سے ملے تو سلام کے بعد ان دونوں حضرات نے اپنا تعارف کرایا ، حضرت اویس قرنی نے انھیں اپنے ہاتھ اور پہلو کے نشان دکھائے ، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ و سلم کا سلام پہنچا کر اُن کو آپ کا پیغام پہنچایا تھوڑی دیر کے بعد حضرت اویس قرنی رح نے اُن سے کہا کہ اب تم واپس جاؤ ، قیامت قریب ہے ، اس دن پھر

تم سے ملاقات ہوگی ۔ میں اس دن کے لیے تیاری کر رہا ہوں ۔

اہل قرن کو جب یہ حالات معلوم ہوئے تو وہ حیران ہوئے ، اور ان کی بےحد تعظیم و تکریم کرنے لگے ، لیکن کچھ دن کے بعد وہ وہاں سے کوفے کی طرف چلے گئے اور جنگ صفین میں شہید ہوئے ۔

عشق رسول ؐ:

اگر چہ حضرت اویس قرنیؒ حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی خدمت میں کبھی حاضر نہیں ہوئے ، لیکن آن کا قلب جذبۂ عشق رسول ؐ سے سرشار تھا ، ان کی محبت رسول کا اندازہ اس سے کیجیے کہ جب غزوۂ احد میں آپ ؐ کے دندان مبارک شہید ہوئے ، اور حضرت اویس قرنی کو اس کی خبر ملی تو وہ نہایت غمگین ہوئے ، اور انہوں نے ایک ایک کر کے اپنے تمام دانت توڑ ڈالے ۔

حضرت اویس قرنی کی زندگی کے بعض پہلو ایسے ہیں جن میں ہمیں عملی تصوف کے نمایاں پہلو ملتے ہیں ۔

ان کی زندگی دنیاوی جاہ و حشم سے پاک تھی وہ حصول معیشت کے لیے جد و جہد کرتے ۔ اور اپنی روزی اونٹ چرا کر حاصل کرتے تھے۔ استغنا کا یہ عالم تھا کہ حضرت شیخ فریدالدین عطار نے اپنے تذکرے میں لکھا کہ جب حضرت عمرؓ ان سے ملاقات کے لیے گئے تو انہوں نے آپ سے کہا کہ آپ کچھ دیر یہاں قیام فرمائیں میں آپ کے لیے کچھ لے کر آتا ہوں ۔ آپ نے ان کو اپنی جیب سے دو درہم نکال کر دکھائے اور کہا یہ میرے اونٹ چرانے کا معاوضہ

ہے یہ دو درم میرے لیے کافی ہیں ۔

دریائے فرات کے کنارے ایک دن ہرم بن حبان حضرت اویس سے ملنے کے لیے آئے ، وہ اس وقت وضو کر رہے تھے ، ہرم نے سلام کیا تو آپ نے کہا وعلیکم السلام یا ابن حبان ، ابن حبان نے پوچھا آپ نے مجھے کیسے پہچانا؟ حضرت اویس نے فرمایا میری روح نے تمھاری روح کو پہچان لیا ، پھر ہرم نے آپ سے عرض کیا کہ مجھ سے آپ کوئی رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی حدیث بیان فرمایئے؟ حضرت اویس قرنی رح نے جواب دیا میں نے آپ کو دیکھا نہیں لیکن دوسروں سے آپ کی حدیث سنی ہے ، میں محدث اور مفتی بننا نہیں چاہتا ، خود میرے اندر ایک شعلہ ہے ، اسی کو میں برداشت نہیں کر سکتا ، پھر حضرت اویس قرنی رح نے پوچھا اے ابن حبان تم یہاں کیسے آئے؟ انھوں نے جواب دیا کہ میں اس لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں کہ آپ سے انس و راحت حاصل کروں ، حضرت اویس قرنی نے فرمایا میں ہرگز نہیں جانتا کہ جس نے خدا کو پہچان لیا ہو ، وہ ماسوا سے انس و راحت حاصل کر سکتا ہے پھر ہرم بن حبان نے کہا کہ مجھے کچھ وصیت کیجیے ، فرمایا سوتے میں موت کو اپنے سرہانے اور بیداری میں اپنے سامنے سمجھو ، گناہ کو حقیر مت خیال کرو ، اگر اس کو حقیر خیال کرو گے تو نعوذ باللہ خدائے تعالیٰ کی حقارت ہوگی ۔

ربیع بن خیثم سے روایت ہے کہ میں ایک دفعہ اویس قرنی کی تلاش میں نکلا جب میں ان کے پاس پہنچا تو وہ فجر کی نماز ادا فرما رہے تھے ، نماز سے فارغ ہو کر تسبیح پڑھنی شروع کی یہاں تک کہ ظہر کی نماز کا وقت آگیا ، اسی طرح وہ دو نمازوں کے درمیان تسبیح پڑھتے ، اور نماز کا وقت آنے پر نماز ادا فرماتے اسی طرح پورے تین دن گزر گئے ، نہ انھوں نے کچھ کھایا اور نہ

وہ سوئے ، چوتھی رات کو ذرا سی دیر کے لیے وہ سوئے ، لیکن فوراً بیدار ہو کر مناجات کرنے لگے خداوندا! میں ایسی آنکھوں سے جو زیادہ سوئیں اور ایسے پیٹ سے جو زیادہ کھائے پناہ مانگتا ہوں ۔

حضرت اویس قرنی(رح) کی اس عارفانہ زندگی سے پتا چلتا ہے کہ تصوف میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے ، وہ حب الٰہی اور جذبۂ عشق رسول ؐ سے سرشار تھے ، اور ہمیشہ ذکر خداوندی میں مصروف رہتے تھے ۔[1]

—:o:—

[1] یہ تمام حالات اسلامی تصوف اور اقبال ، ص ۷۶ تا ۸۰ بحوالۂ کشف المحجوب اور تذکرۃ الاولیاء (عطار) ۔ اردو ترجمہ ص ۱۴ تا ۱۶ سے ماخوذ ہیں ۔

۹

حجۃ الاسلام امام غزالیؒ

امام غزالی کے متعلق علامہ اقبال کا تاثر:

علامہ اقبال نے جن صوفیائے کرام سے اپنی بے پایاں محبت اور عقیدت کا اظہار کیا ہے ، اُن میں مشہور صوفی و عالم امام غزالیؒ بھی ہیں ، اُن کی آہِ سحر گاہی کو وہ ایک نمونہ و مثال بنا کر پیش کرتے ہوئے یوں نغمہ‌زن ہیں :

عطارؒ ہو ، رومیؒ ہو ، رازی ہو ، غزالی ہو
کچھ کام نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی

ایک اور جگہ ارمغان حجاز میں امام غزالی کی عالمانہ عظمت ، اور اُن کے مراتب عالی کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

دگر بمدرسہ ہائے حرم نمی بینم
دلِ جنید و نگاہِ غزالی و رازی

حضرت امام غزالی کو اسلامی تصوف کی تاریخ میں جو عظمت حاصل ہے ، وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں ۔ الغزالی میں علامہ شبلی حضرت امام غزالی کی شان میں رقم طراز ہیں کہ :

حضرات صوفیہ اور فلاسفۂ اسلام کے سرگروہ مولانا روم ،

شیخ الاشراق ابن رشد اور شاہ ولی اللہ صاحب ہیں ، ان بزرگوں کی تصنیفات در حقیقت و در اصل (امام غزالی) کے خیالات کا آئینہ ہیں . . . نبوت ، وحی ، الہام ، حالات بعدالموت ، معاد قضا و قدر ، خیر و شر کی جو حقیقت امام رازی ، شیخ الاشراق ابن رشد ، شاہ ولی اللہ نے بتائی ہے . . . امام غزالی ہی سے سُن کر کہا ہے ۔[1]

امام غزالی ہی نے تصوف کو ایک باقاعدہ فن کی حیثیت دی ، اُن سے قبل کے مشائخ مثلاً امام قشیری ، ابو طالب مکّی وغیرہ نے جو کچھ لکھا تھا ، اس کو انھوں نے پورے طور پر اخذ کر کے تصوف کے فلسفے کو نہایت جانکاہی سے مدوّن کیا ، اُن کے علم و عمل اور قلم سے گلشن اخلاق میں نئی بہار آئی ۔ اور وہ سدا بہار پھول کھلے کہ جن کی خوشبو سے آج تک مشام جاں معطر ہے ۔

حالات :

امام ابو حامد محمد بن محمد بن احمد غزالی ، ۴۵۰ھ (۱۰۵۸-۵۹ء) میں طوس میں پیدا ہوئے ، انھوں نے طوس اور نیشا پور میں تعلیم و تربیت حاصل کی اور تصوف میں ان کی نسبت شیخ بو علی فارمدی سے ہے ، یہ وہ زمانہ تھا جب ملک شاہ سلجوقی کی حکومت تھی ، تاریخوں میں ہے کہ ملک شاہ نہایت عدل پرور بادشاہ تھا اور رعایا کی فلاح و بہبود کا خیال رکھتا تھا ، اس کی وفات کے بعد اس کے تین بیٹے برکیارق ، محمد اور سنجر سلطنت کے مدعی ہوئے ، اور ان میں خوں ریزیوں کا ایسا ہولناک سلسلہ شروع ہوا کہ شہروں پر تباہیاں آئیں اور دیہاتوں میں خاک اڑنے لگی ، ملک سے امن رخصت ہوا ، فتنہ و فساد پھیلا ، ادھر خلافت بغداد کے اقبال کا

---

[1] الغزالی ، ص ۲۶۱ - ۲۶۰ (مطبوعہ نامی پریس کانپور) ۔

آفتاب غروب ہورہا تھا ، بغداد کی عظمتیں ختم ہو رہی تھیں ، اخلاقی انحطاط کا یہ عالم تھا کہ عوام ، اُمرا ، وزرا سب اخلاقی گراوٹوں میں مبتلا تھے ، اِس طرف اندلس میں مسلمانوں کا سیاسی اقتدار رخصت ہو رہا تھا ۔ یہ تھا وہ ماحول جس میں امام غزالی پیدا ہوئے ، پلے اور بڑھے جب کہ مسلمانوں کی اخلاقی حالت نہایت زبوں تھی ، اخلاقی گرفت ڈھیلی پڑ رہی تھی ، اور سماجی نظام کا ڈھانچہ بگڑ چکا تھا ۔

حضرت امام غزالی نے نہایت بصیرت کے ساتھ اُس بگاڑ کا جائزہ لیا جو پوری قوم میں رونما ہوچکا تھا ۔ اُن کے نزدیک اس پستی اور نکبت کا سبب اخلاقی گراوٹ تھی ، وہ مسلمانوں کی سیاسی زندگی کے ہر گوشے سے واقف تھے ، بغداد میں وہ دربار خلافت میں بھی باریاب رہے تھے ، سلاجقہ کے درباروں کا رنگ انھوں نے دیکھا تھا اور اسلامی دنیا کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا ، وہ پوری خرابیاں ان کی نظر میں تھیں ، جس نے پوری قوم کے روحانی مزاج کے قوام کو بگاڑ کر رکھ دیا تھا یہ تھا وہ ماحول جس میں انھوں نے رشد و ہدایت کا چراغ روشن کیا تھا ، اُن کی زندگی کی جدوجہد کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ انسانوں کے رشتے کو خدا سے جوڑا جائے ، عشق رسول ؐ سے دلوں کو گرمایا جائے اسلامی عقائد و فکر کو جن پر اوہام اور اغراض و مفاد کے پردے ڈال دیئے گئے تھے ان کو اجاگر کیا جائے ، ہر طبقے کے اخلاق میں جو پستی پیدا ہو رہی تھی اُن کی خرابیوں کو واضح کر کے ہر گروہ کو اخلاق محمدی ؐ کے جمال سے آراستہ کیا جائے ۔

امام غزالی تعلیم کی تکمیل کے بعد ابتداً درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے اُن کے درس میں تین سو مدرسین اور ایک سو اُمرا اور رؤسا حاضر ہوتے تھے ، درس کے علاوہ وعظ بھی فرمایا کرتے

تھے امام غزالی کے وعظوں کو شیخ صاعد بن الفارس قلم بند کیا کرتے تھے ایک دن وعظ کہہ رہے تھے اتفاقاً اُن کے چھوٹے بھائی احمد غزالی جو ایک صاحبدل اور پاک باطن درویش تھے آ نکلے اور امام غزالی کا وعظ سن کر یہ شعر پڑھے

و اصبحت تھدی و لا تھدی
و تسمع وعظاً و لا تسمع
فیا حجر الشحر حتی متی
تسن الحدید و لا تقطع

(ترجمہ) ''تم دوسروں کو ہدایت کرتے ہو، لیکن خود ہدایت نہیں پکڑتے، اور وعظ سناتے ہو، لیکن خود نہیں سنتے۔ اے سنگ نسان! کب تک تو لوہے کو تیز کرتا رہے گا لیکن خود نہ کاٹے گا''۔

حضرت امام غزالی اپنے چھوٹے بھائی سے یہ اشعار سن کر اس قدر متاثر ہوئے کہ مجاہدوں اور ریاضتوں میں مشغول ہو گئے، ایک زمانے تک بیابانوں میں پھرتے رہے۔

حضرت ابراھیم خلیل اللہ کے مزار پر حاضری اور عہد:

یہاں تک کہ ۴۹۹ھ (۱۱۰۵-۶ء)- میں وہ حضرت ابراھیم خلیل اللہ کے مزار پر حاضر ہوئے اور وہیں عہد کیا کہ آئندہ وہ کسی بادشاہ کے دربار میں نہ جائیں گے، کسی بادشاہ کا عطیہ نہ لیں گے۔ کسی سے مناظرہ اور بحث نہ کریں گے۔[1]

---

[1] یہ تمام تفصیل تاریخ مشائخ چشت (پروفیسر خلیق احمد نظامی) ص ۱۰۴-۱۰۳ سے ماخوذ ہے۔

احیاء العلوم الدین:

ابن اثیر کے بیان کے مطابق اسی زمانے میں امام غزالی نے اپنی معرکہ آراء ''کتاب احیاء العلوم'' تصنیف کی ۔

علامہ شبلی نے اپنی کتاب الغزالی میں احیاء العلوم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا : احیاء العلوم کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کے پڑھنے سے دل پر عجیب اثر ہوتا ہے ہر فقرہ نشتر کی طرح دل میں چبھ جاتا ہے ہر بات جادو کی طرح تاثیر کرتی ہے ۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ یہ کتاب جس زمانے میں لکھی گئی خود امام صاحب تاثیر کے نشے میں سرشار تھے بغداد میں ان کو تحقیق کا شوق پیدا ہوا ، تمام مذاہب کو چھانا کسی سے تسلی نہیں ہوئی ۔ تصوف کی طرف رخ کیا لیکن وہ قال کی چیز نہ تھی بلکہ سرتاپا حال کا کام تھا ۔ آخر سب چھوڑ چھاڑ ایک کملی پہن بغداد سے نکلے اور دشت پیمائی شروع کی سخت مجاہدات اور ریاضات کے بعد بزم راز تک رسائی پائی یہاں پہنچ کر ممکن تھا کہ اپنی حالت میں مست ہو کر تمام عالم سے بے خبر بن جاتے لیکن افادہ عام پر نظر پڑتی دیکھا تو آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے امیر و غریب عام و خواص عالم و جاہل رند و زاہد سب کے اخلاق تباہ ہو چکے ہیں اور ہوتے جاتے ہیں علماء جو دلیل راہ بن سکتے تھے طلب جاہ میں مصروف ہیں یہ دیکھ کر ضبط نہ کر سکے اور اسی حالت میں یہ کتاب لکھی [1] ۔

خود امام غزالی نے اس کتاب کی وجہ تصنیف پر روشنی ڈالتے ہوئے احیاء العلوم کے دیباچے میں لکھا کہ :

میں نے دیکھا کہ مرض نے تمام عالم کو چھا لیا ہے ، اور سعادت آخروی کی راہیں بند ہو گئی ہیں ، علماء جو دلیل راہ

1۔ الغزالی ، ص ۶۳-۶۴ ۔

تھے ، زمانہ ان سے خالی ہوتا جارہا ہے ، جو رہ گئے وہ نام کے عالم ہیں ، جن کو ذاتی اغراض نے اپنا گرویدہ بنالیا ہے ، اور جنھوں نے تمام عالم کو یقین دلایا ہے ۔ کہ علم صرف تین چیزوں کا نام ہے ، مناظرہ (جو فخر و نمود کا ذریعہ ہے) وعظ و پند (جس میں عوام کی دل فریبی کے لیے رنگین اور مسجّع فقرے استعمال کیے جائیں) فتوی دینا ، جو مقدمات کے فیصل کرنے کا ذریعہ ہے ۔ باقی آخرت کا علم تو تمام عالم سے ناپید ہوگیا ہے ، اور لوگ اس کو بھُلا چکے ہیں ۔[1]

حضرت امام غزالی نے یہ کتاب ۱۱۱۱ھ (۱۶۹۹ء) کے شروع میں مکمل کی ۔ علامہ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ تاریخ میں اس امر پر وضاحت سے روشنی ڈالی ہے کہ امام غزالی نے تصوف کی اصطلاحات کا مفہوم متعین کیا اور ان کی وضاحت کی ۔ وہ لکھتے ہیں کہ :

امام غزالی نے احیا میں دونوں طریقوں کو جمع کیا ہے ، چنانچہ ورع اور اقتدار کے احکام لکھنے کے ساتھ ارباب حال کے آداب اور طریقے بتائے اور ان کی مصطلحات کی شرح کی ، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تصوف بھی ایک باقاعدہ علم بن گیا ، حالاں کہ پہلے اس کا طریقہ صرف عبادت کرنا تھا ۔

مختصر یہ ہے کہ ان کی تصنیف احیاالعلوم حکمت و موعظت کا وہ گنجینہ ہے کہ جس نے عام و خاص عارف و جاہل غرض کہ سب میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کی ، انھوں نے ہر طبقے کی مطلوبہ بھلائیوں اور ناپسندیدہ برائیوں کو صاف صاف نمایاں کرتے ہوئے ، اس پر زور دیا ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں اخلاقی اصولوں

---

[1] تاریخ مشائخ چشت ، ص ۱۰۵ بحوالہ دیباچہ احیاءالعلوم ۔

کی پابندی کی جائے ۔ تاکہ خدا اپنی زمین پر اپنے بندوں کی زندگی میں جو پاکیزگی ، جو حسن ، جو خیر و صلاح اور جو ترقی و فلاح دیکھنا چاہتا ہے ، وہ رونما ہو ، اور بگاڑ کی ان تمام صورتوں کا خاتمہ ہو ، جو اس زمین کو ویران کرنے والی ہیں - مثلاً انھوں نے بادشاہوں کے کردار پر کھل کر تنقید کی ہے ، اور ان کی گمراہیوں کے ایک ایک سرچشمے کی نشان دہی کی ہے ، ان کی اس بے لاگ تنقید نے ایک طرف عوام میں جرات و ہمت کا شعور پیدا کیا کہ وہ ہر خوف سے بے نیاز ہو کر بادشاہوں کے کردار پر بے لاگ تنقید کریں ، دوسری طرف امام موصوف کی تنقید نے بادشاہوں کو خواب غفلت سے چونکایا ، اور ان میں حسن اخلاق اور حسن عمل کی صلاحیتوں کو آجاگر کیا ۔

چنانچہ وہ ”احیا“ میں سلاطین کے دربار میں نہ جانے پر شرعی نقطۂ نظر سے تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ : انسان کو سلاطین کے دربار میں ہر قدم پر گناہ کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے - پہلا مرحلہ تو یہ ہے کہ شاہی مکانات بالکل مغصوب ہوتے ہیں ، اور زمین مغصوبہ پر قدم رکھنا گناہ ہے ۔ پھر دربار میں جا کر سر جھکانا اور ہاتھ کو بوسہ دینا ہوتا ہے ، اور ظالم کی تعظیم کرنا گناہ ہے ، دربار میں ہر طرف جو چیزیں نظر آتی ہیں یعنی پردہ ہائے زرنگار ، ریشمیں لباس ، زریں ظروف یہ سب حرام ہیں ، ان کو دیکھ کر چپ رہنا معصیت ہے ، آخر میں بادشاہ کی جان و مال کی سلامتی کی دعا مانگنی پڑتی ہے ، اور یہ گناہ ہے ۔

سلاطین کی ملازمت اور ان کے تحائف کے قبول نہ کرنے کا سبب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ :

ہمارے زمانے میں سلاطین کی آمدنی یا تو کل کی کل حرام ہے یا اس کا اکثر حصہ حرام ہے ، اور حرام کیوں نہ ہو ۔ حلال

آمدنی زکوٰۃ ، خمس ، فے بمالِ غنیمت ہے ، ہو ان چیزوں کا اس زمانے میں وجود ہی نہیں ، صرف جزیہ رہ گیا ہے ، وہ ایسے ظالمانہ طریقوں سے وصول کیا جاتا ہے کہ جائز اور حلال نہیں رہتا ۔

نصیحت الملوک

حضرت امام غزالی نے محمد بن ملک شاہ کو جو سنجر کا بڑا بھائی تھا ، جو پند و موعظت لکھ کر بھیجے ، اُن کا یہ ہدایت نامہ ''نصیحت الملوک'' کے نام سے مشہور ہے ، اس ہدایت نامے میں انھوں نے اس پر عقائد دینی کو واضح کرنے کے بعد آسے حکومت کے فرائض سے آگاہ کیا ہے ، اس نصیحت نامے میں انھوں نے اس کو لکھا کہ : قیامت میں سب سے زیادہ عذاب جس کو دیا جائے گا وہ ظالم بادشاہ ہوں گے ، حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ اگر ایک خارشتی بکری کی خبر گیری مجھ سے رہ گئی ، تو قیامت میں مجھ سے باز پرس ہوگی ۔

پھر آسے لکھا کہ اے بادشاہ دیکھ حضرت عمرؓ کو باوجود اس کے کہ وہ عدل و انصاف میں نہایت احتیاط برتتے تھے ، خدا کے ہاں مواخذے کا کس قدر ڈر تھا ، اور تیرا یہ عالم ہے کہ تجھ کو اپنی رعایا کی کچھ پروا نہیں ، اور تجھے کچھ پتا نہیں کہ اہلِ ملک کا کیا حال ہے ۔ تجھے صرف اس کو اپنے لیے کافی نہ سمجھنا چاہیے کہ تو لوگوں پر ظلم نہیں کرتا ، بلکہ تیری ذمہ داری یہ بھی ہے کہ تیرے ملازم ، عہدہ دار ، حاکم کسی پر ظلم نہ کریں ۔

اے بادشاہ ! اگر تو دنیا کی لذت کی غرض سے لوگوں پر ظلم

۱۔ احیاء العلوم ۔ باب خامس

کرتا ہے ، تو تجھے غور کرنا چاہیے کہ دنیاوی لذات کیا ہیں ؟ اگر تو کھانے کا زیادہ حریص ہے تو تو جانور ہے ، اگر لباس میں حریر و دیبا کا خواہش مند ہے تو تو مرد نما عورت ہے ، اور اگر اپنے غیض و غضب کا محکوم ہے تو آدمی کی صورت میں درندہ ہے۔

اسی طرح انھوں نے اپنے دور کے آمراء و وزراء کو بھی خطوط لکھے تھے ، جن میں انھوں نے ان کو عدل و انصاف کی طرف توجہ دلائی تھی[1]۔

اسلامی حکومت کے قیام کی جد و جہد:

اسپین کی حکومت کے زوال کے درد ناک حالات سے امام غزالی بے حد متاثر تھے ، چنانچہ موحدین کی سلطنت امام غزالی ہی کی تحریک پر وجود میں آئی ، جب محمد بن عبداللہ تومرت بانئ سلطنت موحدین امام غزالی کی خدمت میں حاضر ہوا تو امام صاحب نے اس سے خواہش ظاہر کی کہ کوئی اسلامی سلطنت وجود میں آنی چاہیے ، وہ آپ کے اس خیال سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اپنے وطن واپس آکر ایک اسلامی سلطنت قائم کرنے کا ارادہ کیا ، مقدمہ ابن خلدون میں ہے کہ : جیسا کہ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ (محمد بن عبداللہ تومرت) ابو حامد غزالی سے ملا ، اور ان سے اپنے دلی خیالات میں مشورہ کیا ، امام صاحب نے اس کی تائید کی ، کیونکہ اس زمانے میں اسلام تمام دنیا میں ضعیف ہورہا تھا ، اور کوئی ایسا سلطان موجود نہ تھا ، جو تمام امت کو فراہم کرسکے ، اور دین اسلام کو قائم رکھے ، لیکن پہلے امام صاحب نے اس سے پوچھ لیا کہ تمہارے پاس اتنا سر و سامان اور جمعیت ہے یا نہیں ، جس سے قوت اور حفاظت ہوسکے ۔

---

[1] یہ تمام تفصیل تاریخ مشائخ چشت ص ۱۱۷ سے ماخوذ ہے ۔

کیمیائے سعادت :

یوں تو حجتہ‌الاسلام امام غزالی کی اور کئی تصانیف جواہرالقرآن ، تفسیر یاقوت‌التاویل ، مشکوٰۃالانوار ، المنقذ من الضلال وغیرہ ہیں ۔ لیکن احیاءالعلوم کے بعد ان کی جس کتاب نے غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل کی ، وہ ''کیمیائے سعادت'' ہے ، یہ کتاب اخلاقی اور دینی مضامین پر مشتمل ہے ، اور اُن کی مشہور کتاب ''احیاءالعلوم'' کا عطر و خلاصہ ہے ، جو اپنی افادیت کے اعتبار سے نہایت اہم ہے ، ''کیمیائے سعادت'' کو امام صاحب نے فارسی میں پانچویں صدی ہجری کے آخر میں لکھا ۔

وفات :

حضرت امام غزالی نے ۵۰۵ھ (۱۱۱۱-۱۲ء) میں طوس میں وفات پائی[1]۔

تاریخ دعوت و عزیمت میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے حضرت امام غزالی کے حالات تحریر کرتے ہوئے لکھا کہ : امام غزالی کا نام محمد ، کنیت ابو حامد اور والد کا نام بھی محمد تھا ۔ وہ طوس کے ضلع طاہران میں ۴۵۰ھ میں پیدا ہوئے ، امام غزالی نے اپنے وطن میں شیخ احمدالراذکانی سے فقہ شافعی کی تعلیم حاصل کی ، پھر جرجان میں امام ابوالنصر اسماعیلی سے تعلیم حاصل کی ، اس کے بعد نیشا پور میں امام‌الحرمین کے حلقۂ درس میں شریک ہوگئے ، ان کی جودت و طباعی اور علمی فضیلت کو دیکھ کر اُن کے استاد امام‌الحرمین اُن کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ : غزالی علم کا بحر ذخّار ہیں ۔

---

[1] حضرت امام غزالی کے یہ حالات نفحات‌الانس (اُردو ترجمہ) ص۔ ۴۰۰۔ سفینتہ‌الاولیاء (اردو ترجمہ) ص۲۱۲ اور تاریخ مشائخ چشت و تاریخ ادبیات ایران (شفق) سے ماخوذ ہیں ۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد امام غزالی نظام الملک کے دربار میں پہنچے، نظام الملک ان کے ساتھ نہایت اعزاز و اکرام سے پیش آیا، اور ان کو مدرسہ نظامیہ کا صدر مدرس مقرر کیا، جو اس وقت کا سب سے بڑا اعزاز تھا۔ ۴۸۴ھ (۹۲-۱۰۹۱ء) میں انھوں نے مدرسہ نظامیہ میں درس شروع کیا، یہاں تک کہ ان کی درسگاہ مرجع خلائق بن گئی ان کی علمی عظمت و شکوہ کی انتہا یہ تھی کہ امراء و وزراء تو کیا خود بارگاہِ خلافت کی شان و شوکت ماند پڑ گئی۔

اس عروج کی انتہا پر پہنچنے کے بعد وہ چاہتے تو اس شان و شکوہ کی منزل کو اپنا کر اسی کے ہو رہتے۔ لیکن انھوں نے دیکھا کہ پورا مسلم معاشرہ زوال پذیر ہے، ہر طرف گمراہیاں بڑھ رہی ہیں، یونانی فلسفے نے عقل کو بے لگام بنادیا ہے، مذہب کے بنیادی اصولوں کو یونانی فلسفے سے قریب تر لانے کے لیے ایسی دور از کار اور لایعنی تاویلیں کی جارہی ہیں، جو شارع علیہ السلام کے منشاء کے بالکل خلاف ہیں۔ اخلاقی قدریں گر رہی ہیں، علماء اپنے فرائض منصبی کو بھلا کر طلب جاہ و ہوس اقتدار میں گم ہیں، شخصی حکومتیں اور ان کے امراء عوام کو اپنے مظالم کی چکی میں پیس رہے ہیں، عوام کے حقوق کی پامالی، حکام کی مردم آزاری اہل کارانِ دولت کی رشوت ستانی نے عوام کے خون کو چوس لیا ہے اور انھیں ایک چلتی پھرتی لاش بنادیا ہے، اسی کے ساتھ انھوں نے عوام کی معاشرتی زندگی پر نظر ڈالی، اور انھیں اپنی معاشرتی زندگی میں طرح طرح کی برائیوں میں مبتلا پایا۔

یہ تھے وہ عالم اسلامی کے زبوں حالات جنھوں نے امام غزالی کو بے حد متاثر کیا، انھوں نے خود بھی اپنی ذات کا جائزہ لیا، وہ خود "المنقذ من الضلال" میں لکھتے ہیں کہ: میں نے اپنی تدریس کو دیکھا تو وہ بھی خالص لوجہ اللہ نہ تھی بلکہ اس کا

باعث و محرک بھی محض طلب جاہ و حصول شہرت تھا، تب مجھے یقین ہو گیا کہ میں ہلاکت کے غار کے کنارے کھڑا ہوں، اگر میں نے اصلاح حال کی کوشش نہ کی تو میرے لئے سخت خطرہ ہے۔

اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد امام غزالی نے اس شان و شکوہ کی زندگی کو چھوڑ کر بغداد کو خیرباد کہا، پھر وہ شام آئے اور تزکیہ نفس، اخلاق کی درستی اور ذکراللہ کے لیئے اپنے قلب کو مصفّا بنانے میں مشغول رہے، پھر مدت تک جامع مسجد دمشق میں معتکف رہے، اس کے بعد امام غزالی دمشق سے بیت المقدس آئے، اور یہاں بھی عبادتوں اور ریاضتوں میں مشغول رہے، اس کے بعد حجاز آئے، اور کئی سال تک انہوں نے خلوت و عزلت میں گزارے، لیکن عالم اسلامی کے ان بگڑے ہوئے حالات کو دیکھ کر ان کی طبیعت میں ایک نیا جذبہ اور ولولہ پیدا ہوا کہ تبلیغ دین اور بگڑے ہوئے انسانوں کی اصلاح، وقت کا اہم تقاضا ہے، اس احساس نے ان کو اپنا صحیح فرض یاد دلایا پھر وہ نئے عزم، پاک ارادوں اور نئی لگن کے ساتھ خلوت سے انجمن میں آئے۔

اوائل پانچوی صدی ہجری سے ان کے تجدیدی کارناموں کا آغاز ہوا وہ ۴۹۹ھ (۱۱۰۵-۶ء) میں دوبارہ بغداد آئے، اور نئے عزم و ولولوں کے ساتھ مدرسہ نظامیہ کی مسند درس کو زینت بخشی، المنقذ من الضلال میں وہ دوبارہ اس منصب کے قبول کرنے کے فرق واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> میری اس پہلی اور اس دوسری حالت میں زمین آسمان کا فرق ہے میں پہلے اس علم کی اشاعت کرتا تھا، جو حصول جاہ کا ذریعہ ہے، اور میں اپنے قول و عمل سے اس کی دعوت دیتا تھا، اور یہی میرا مقصود اور نیت تھی، لیکن اب میں اس علم کی دعوت دیتا ہوں، جس سے جاہ سے دست بردار ہونا

پڑتا ہے ، اب میں اپنی اور دوسرے کی اصلاح چاہتا ہوں ، مجھے نہیں معلوم کہ میں اپنے مقصود تک پہنچوں گا یا اس سے پہلے میرا کام تمام ہوجائے گا ۔

امام غزالی نے جن بگڑے ہوئے سیاسی اور سماجی حالات میں اپنے کام کی ابتدا کی ، خود آن کے قلم سے ان کا تذکرہ ہم پہلے صفحات میں نقل کر آئے ہیں ۔

امام غزالی کے مجددانہ کارنامہ :

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے لکھا کہ حضرت امام غزالی کے مجددانہ کارناموں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ۔

۱ ۔ فلاسفہ کے ملحدانہ خیالات کی تردید ۔

۲ ۔ زندگی و معاشرت کا اسلامی و اخلاقی جائزہ ، اور ان کی تنقید و اصلاح ۔

امام غزالی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے شخص ہیں ، جنھوں نے یونانی فلسفے کے مفروضات پر جرح کرنے اور اس پر علمی تنقید کرنے کی جراٴت کی ، فلسفۂ یونانی کے رواج نے اعتقاد کی بنیادیں ہلادی تھیں ، اور اس کی اشاعت سے مسّلت کی ذہنی زندگی میں جو انتشار پیدا ہوچکا تھا ، انھوں نے فلسفے کی پیدا کردہ ایک ایک اُلجھن کو اسلامی نقطۂ نظر سے سلجھایا ، انھوں نے اس حقیقت کو سمجھایا کہ وہ مادی ترقی جو انسان کو معبود حقیقی سے دور لے جائے ، ترقی نہیں زوال ہے ان کی دو کتابیں ''مقاصد الفلاسفہ'' اور ''تہافتہ الفلاسفہ'' آن کے اسی نقطۂ نظر کی آئینہ دار ہیں ۔

ان کا دوسرا اصلاحی کارنامہ ، جس نے عالم اسلامی میں اُن کے نام کو روشن کردیا، اور جس کا شمار اسلام کی اعلیٰ ترین تصنیفات میں ہوتا ہے ، وہ اُن کی معرکہ آرا کتاب احیاء العلوم ہے ، انہوں نے یہ اپنی عظیم تصنیف بارہویں صدی عیسوی کے بالکل ابتدا میں مکمل کی ۔ عبدالغافر فارسی جو امام غزالی کے ہمعصر اور امام الحرمین کے شاگرد ہیں ، کہتے ہیں کہ احیاءالعلوم کے مثل کوئی کتاب اس سے پہلے تصنیف نہیں ہوئی ۔

امام غزالی نے یہ کتاب خاص حالات و کیفیات اور خاص جذبے کے ساتھ لکھی ، جو اُن کے قلبی تاثرات ، علمی تجربات ، اصلاحی خیالات اور وجدانی کیفیات کا آئینہ ہے ۔

اُنھوں نے اس کتاب میں اُن تمام خرابیوں ، اور کمزوریوں کی نشان دہی کی ہے ، جو مسلم معاشرے میں پھیلی ہوئی تھیں ، نیز اس حقیقت کو بھی واضح کیا ہے کہ نفس و شیطان نے کس طرح مختلف طبقوں کو فریب دے رکھا ہے ۔

انھوں نے اس کتاب میں اس دینی اور اخلاقی بگاڑ کا ذمہ دار علماء کو ٹھرایا ہے ان کو شکایت کہ علماء امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام نہیں دیتے وہ خود دنیا طلبی اور جاہ طلبی کا شکار ہوگئے ہیں ، اصلاحِ نفس ، تہذیبِ اخلاق اور سعادت اخروی سے ان کی توجہ ہٹ گئی ہے ۔

دوسرا طبقہ جس کو وہ اس دینی تنزل کا ذمہ دار ٹھراتے ہیں ، وہ اہل حکومت ، سلاطین اور امرا کا طبقہ تھا ، امام غزالی نے ایسے زمانے میں آنکھ کھولی تھی جب کہ جمہوریت ، شخصی حکومت کے چنگل میں تھی ، بادشاہ کی ذات ہر قانون اور ضابطے سے بالاتر تھی ، عوام کا ان حکومتوں میں کوئی دخل نہ تھا ، ناانصافی عام

تھی ، عوام کے حقوق پامال ہورہے تھے ، مردم آزاری ، رشوت ستانی عام تھی ، اپنے فرائض کی ادائیگی سے ہر عہدہ دار جی چراتا تھا ، انھوں نے ایسے بادشاہوں ، ان کے امرا اور وزرا پر بے لاگ تنقید کی ، اور بڑی جرأت و بے خوفی کے ساتھ انھیں حکومت کی بدنظمیوں ، عوام کے حقوق کی پامالی ، اپنے فرائض کی ذمہ داری سے غفلت کی طرف اپنی تحریروں سے توجہ دلائی ۔

بادشاہوں سے اگر ملاقات ہوجاتی تو نہایت جرأت سے اُن کے سامنے کلمۂ حق بلند کرتے ۔

ایک ملاقات کے موقع پر ملک شاہ سلجوقی کے بیٹے سلطان سنجر سے جو اُس وقت سارے خراسان کا بادشاہ تھا فرمایا :

افسوس کہ مسلمانوں کی گردنیں مصیبت اور تکلیف سے ٹوٹی جاتی ہیں ، اور تیرے گھوڑوں کی گردنیں طوقہائے زریں سے مزیّن ہیں ۔

اُن کی نظر بڑی گہری اور اُن کا مشاہدہ بہت وسیع ہے ، انھوں نے اپنی اس کتاب میں عام زندگی کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے ، اور ان برائیوں کو واضح کیا ہے ، جو عام زندگی میں رونما ہو کر خرابی کا باعث بن رہی ہیں ۔

مختصر یہ کہ امام غزالی ایک بلند پایہ فقیہ ، صاحبِ اجتہاد متکلّم ، صاحبدل صوفی ، اسلامی فلسفہ و اخلاق کے ایک نامور مصنف ہیں ، جن کے مجددانہ کارناموں نے مسلمانوں کو حیاتِ نو بخشی[1] ۔

— : ٥ : —

---

[1] یہ ساری تفصیل تاریخ دعوت و عزیمت حصہ اول ص ۱۱۲ تا ص ۱۴۵ سے ماخوذ ہے ۔

۱۰

حکیم سنائیؒ

حکیم سنائی کی عظمت علامہ اقبالؒ کی نظر میں:

حکیم سنائی کی جلالت و عظمت کا اعتراف علامہ اقبال کے مرشد معنوی مولانائے روم نے اپنے ایک شعر میں اس طرح کیا ہے:

عطار روح بود، سنائی دو چشمِ او
ما از پسِ سنائی و عطار آمدیم

ایک اور جگہ مثنوی میں وہ حکیم سنائی کو اس طرح یاد کرتے ہیں:

ترک جوشی کردہ ام من نیم خام
از حکیمِ غزنوی بشنو تمام

علامہ اقبال نے بھی اپنے مجموعہائے کلام میں جا بجا حکیم سنائی کی بارگاہ میں اپنے گلہائے عقیدت پیش کیے ہیں، ارمغان حجاز میں وہ صدق و اخلاصِ سنائی کی تمنا کرتے ہوئے بارگاہِ رب العزت میں عرض کرتے ہیں:

عطا کن شورِ رومی، سوزِ خسرو
عطا کن صدق و اخلاصِ سنائی

چناں پا بندگی در سا ختم من
نہ گیرم گر مرا بخشی خدائی[1]

علامہ اقبالؒ جب شاہ افغانستان کی دعوت پر ۱۹۳۳ء میں افغانستان گئے، اور غزنی میں حکیم سنائیؒ کے مزار پر حاضر ہوئے اس موقع پر علامہ نے اپنی مثنوی ''پس چہ باید کرد'' میں حکیم سنائی متعلق کے جن جذبات کا اظہار کیا ہے، ان کی وہ نظم حکیم سنائی سے بے پناہ عقیدت کی مظہر ہے - فرماتے ہیں :

از نواز شہائے سلطان شہید
صبح و شامم صبح و شام روز عید
نکتہ سنج خاوران ہندی فقیر
میہمان خسروان کیوان سریر
تاز شہر خسروی کردم سفر
شد سفر بر من سبک تر از حضر
سینہ بکشادم بآں بادے کہ پار
لالہ رست از فیض او در کوہسار
آہ غزنی آں حریم علم و فن
مرغزار شیر مردان کہن
دولت محمود را زیبا عروس
از حنا بندان او دانائے طوس
خفتہ در خاکش حکیم غزنوی
از نوائے او دل مردان قوی
آں حکیم غیب، آں صاحب مقام
ترک جوش رومی از ذکرش تمام

---

[1] ارمغان حجاز، ص ۱۸

من ز پیدا، او ز پنہاں در سرور
ہر دو را سرمایہ از ذوقِ حضور
ہر دو را از حکمتِ قرآں سبق
او ز حق گوید، من از مردانِ حق
در فضائے مرقدِ او سوختم
تا متاعِ نالۂ اندوختم
گفتم اے بینندۂ اسرارِ جاں
بر تو روشن ایں جہاں و آں جہاں
اے حکیمِ غیب! امامِ عارفاں
پختہ از فیضِ تو خامِ عارفاں
آنچہ اندر پردۂ غیب است گوی
بو کہ آبِ رفتہ باز آید بجوا[1]

حکیم سنائی سے علامہ کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ: حکیم سنائی کی جلالت شان سے کون واقف نہیں ہم سب اس منظر سے متاثر تھے، مگر ہم میں سب سے زیادہ اثر ڈاکٹر اقبال پر تھا، وہ حکیم ممدوح کے سرہانے کھڑے ہو کر بے اختیار ہو گئے، اور دیر تک زور زور سے روتے رہے[2]۔

حضرت سلطان ابو سعید ابوالخیر کے بعد جس نے اپنی شاعری سے گلشنِ تصوف کی آبیاری کی وہ حکیم سنائی ہیں۔

حالات:

ابوالمجد مجدود بن آدم سنائی پانچویں صدی ہجری کے وسط میں پیدا ہوئے، وہ جوانی ہی سے دربار غزنوی میں منسلک ہو گئے، اور اس خاندان کے افراد مثلاً بہرام شاہ کی مدح میں اشعار کہے۔

---

[1] مثنوی مسافر، ص ۱۸
[2] سیر افغانستان ص ۱۳۳

حکیم سنائی سلاطین و امرا اور اپنے عہد کے فضلاء و شعراء سے ربط رکھتے تھے، مسعود سعد[1] سے ان کے خاص تعلقات تھے۔ اور پہلی مرتبہ انہوں ہی نے مسعود سعد کے اشعار کو جمع کیا تھا۔

نغمات الانس میں ہے کہ سلطان سبکتگین موسم سرما میں، کفار کے بعض ملک لینے کے لیے، غزنی سے باہر نکلا، حکیم سنائی نے

---

[1] مسعود سعد: دور غزنوی و سلجوقی کا شاعر تھا۔ اگرچہ اس کا اصل وطن ہمدان تھا، مگر یہ ۴۳۹ھ میں لاہور میں پیدا ہوا، اور سلاطین غزنوی کی ملازمت میں منسلک ہوگیا، جب محمود ملقب بہ سیف الدولہ ۴۶۹ھ میں ہندوستان پر متعین ہوا تو یہ بھی اس کی ملازمت میں ہندوستان آیا اور امارت و ریاست کی زندگی بسر کرنے لگا، لیکن جب سیف الدولہ زوال میں آیا تو مسعود سلمان بھی سات سال تک "قلعہ دہک دیو" اور تین سال تک "قلعہ نابی" میں محبوس رکھا گیا۔ سلطان ابراہیم نے عمید الملک کی سفارش پر قید سے آزاد کیا، اور یہ اپنے وطن واپس لوٹ کر آیا، جب سلطان مسعود نے ہندوستان کی حکومت اپنے فرزند عضد الدولہ شیر زاد کے سپرد کی۔ اس کا پیشکار سپہ سالار ابن امیر نظام الدین بو نصر پارسی تھا، وہ مسعود سعد کا دوست تھا، اس کی سفارش پر مسعود سعد کو نواح لاہور جالندہر کی حکومت ملی، لیکن زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا کہ بو نصر پارسی معتوب ہوا، اور مسعود سعد سلطان مسعود کے حکم سے دوبارہ گرفتار کیا گیا اور "قلعہ مرنج" میں قید کیا گیا، اس نے اپنی عمر کے مزید سترہ سال قید میں گزارے، جب وہ اس دوسری قید سے چھوٹا تو بہت بوڑھا ہوگیا تھا، ملازمت سے کنارہ کش ہوکر گوشہ گیر ہوگیا۔ مسعود سعد نے ۵۱۵ھ (۲۲-۱۱۲۱ء) میں وفات پائی، وفات کے وقت اس کی عمر پچھتر سال تھی تاریخ ادبیات ایران (شفق) ص ۱۵۵ تا ۱۶۸)۔

اس کی تعریف میں قصیدہ کہا وہ اُسے لے کر سبکتگین کے پاس جارہے تھے تاکہ اُسے بادشاہ کی خدمت میں پیش کریں جب وہ ایک شراب خانے کے دروازے کے پاس سے گزرے تو ایک مجذوب جس کا نام لاخدار تھا ۔ اور ہمیشہ روبی شراب پیتا تھا ، اُس کی آواز سنی ، وہ اپنے ساقی سے کہہ رہا تھا کہ محمود سبکتگین کی قبر کے لیے پیالہ بھرو ، تاکہ میں پیوں ، ساقی نے کہا کہ محمود تو مسلمان بادشاہ ہے ، اور مرد غازی ہے ، مجذوب نے کہا وہ نہایت مردک ہے کہ جو ملک اُس کے قبضے میں ہے ، اس کا اِنتظام اس سے ہوتا نہیں دوسرے ملک حاصل کرنے کی ہوس اِس پر غالب ہے ۔ یہ کہہ کر شراب کا ایک جام چڑھالیا ۔ پھر اُس مجذوب نے اپنے ساقی سے کہا کہ ایک اور جام بھرو سنائی شاعر کی قبر کے لیے ، ساقی نے کہا سنائی تو بڑا پُر گو شاعر ہے ، مجذوب نے کہا اگر وہ لطیف الطبع شاعر ہوتا تو کسی مقصد کے تحت اپنے آپ کو مصروف کرتا ، اس نے تو چند بیہودہ شعر ایک کاغذ پر لکھے ہیں ۔ جو اس کے کسی کام کے نہیں ، وہ نہیں جانتا کہ وہ کس کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے ۔ مجذوب کی ان باتوں نے سنائی کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کردیا ، دَرباروں کی حاضری اور قصیدہ گوئی کو ترک کر کے سلوک کی راہ اختیار کی ، اور اپنی شاعری کے رُخ کو عرفان و تصوف کے مسائل کی طرف موڑا[1]
بہرام شاہ نے اپنی بہن کو آپ کے عقد نکاح میں دینا چاہا تو اُسے لکھ بھیجا:

من نہ مرد زن و زر و جاہم
بخدا گر کنم و گر خواہم
گر تو تا جم دہی ز احسانم
بہ سر تو کہ تاج نستانم[2]

---

[1] نفحات الانس (اُردو ترجمہ) ص ۶۳۲

[2] تاریخ مشائخ چشت ، ص ۱۲۳

اس کے بعد تو استغنا کی یہ کیفیت تھی کہ ایک رئیس نے آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہا تو آسے لکھا کہ :

ان الملوک اذا دخلو قریتہ افسدوا ھا ۔ گوشہ دل این گوشہ گرفتہ بہ تفقد ستائش خود خراب نکند ۔ چشم حقیر این بندہ نہ سزائے خشم خداوندی است[1]

شاعری :

سنائی کے دیوان کے اشعار کی تعداد تیس ہزار بتائی جاتی ہے ۔ یہ دیوان قصائد و غزلیات اور رباعیات پر مشتمل ہے ، آن کے اشعار بلند پایہ اور شاعری کا ایک مکمل نمونہ ہیں ، لیکن آن کی آستادی ، بلاغت اور کمال کا رنگ آن کی مثنویوں میں خصوصاً حدیقہ میں نظر آتا ہے ، انھوں نے اپنی شاعری میں تصوف کے اسرار و معارف کو بیان کرکے فارسی شاعری کو ایک نیا رنگ و آہنگ بخشا ہے ، خود اپنی شاعری کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

کس نگفت این چنیں سخن بجہان
ور کسے گفت ، گو بیار و بخوان
این نمط ہر چہ در جہاں سخن است
گیر یکے در ہزار آن من است

مولانا شبلی کا خیال ہے کہ اخلاقی شاعری کی بنیاد حکیم سنائی نے رکھی ۔ اور اخلاقی شاعری کے ابتدائی اصول و آئین حکیم سنائی نے قائم کیے تھے ۔

حکیم سنائی نے تصوف میں مستقل دو کتابیں ''حدیقہ'' اور ''سیرالعباد'' تصنیف کی تھیں ، اس کے علاوہ آن کی مثنوی کنزالرموز ۔

---

[1] تاریخ مشائخ چشت ، ص ۱۲۳ ، بحوالہ تذکرہ دولت شاہ سمرقندی

عشق نامہ ، عقل نامہ ، غریب نامہ ، بھی ہیں ، لیکن اُن کی مثنویوں میں سب سے زیادہ مشہور حدیقہ ہے ، جو انھوں نے ۵۲۵ھ (۳۱-۱۱۳۰ء) میں مکمل کی ، اُن کی یہ مثنوی دس ابواب پر مشتمل ہے، اور اس مثنوی میں دس ہزار اشعار ہیں[۱]۔

وفات :

حکیم سنائی نے طویل عمر پائی ، اور غزنی ہی میں جان جان آفریں کے سپرد کی ان کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے ، تقی کاشی نے اپنے تذکرے میں ان کا سنہ وفات ۵۴۵ھ (۵۱-۱۱۵۰ء) تحریر کیا ہے ، اور یہی زیادہ صحیح ہے ۔

نفحات الانس میں ہے کہ خواجہ حکیم سنائی پر جب نزع کی حالت طاری تھی تو یہ شعر اُن کی زبان پر تھا :

باز گشتم ، زانچہ گفتم ، زاں کہ ہست
در سخن معنی و در معنی سخن

ایک عزیز نے سنا تو کہا عجیب بات ہے کہ شعر سے توبہ کے وقت شعر ہی میں مشغول ہوئے[۲]۔

''کارنامہ بزرگان ایران'' میں ہمیں حکیم سنائی کے متعلق کچھ اور تفصیلات ملتی ہیں ، ''کارنامہ بزرگانِ ایران'' میں ہے کہ : ابوالمجد مجدود بن آدم سنائی عہد غزنوی کے عارف ، بزرگ اور نامور شاعر ہیں ، وہ ۴۷۳ھ (۸۱-۱۰۸۰ء) میں غزنی میں پیدا ہوئے ، ابتداً وہ غزنوی فرمانرواؤں کے دربار سے منسلک رہے ، خصوصاً بہرام شاہ سے ان کا ربط زیادہ رہا ، اور آن کی مدح و ثنا میں قصیدے کہتے رہے ، لیکن اچانک اُن کی طبعیت میں ایک

---

۱ تاریخ ادبیات ایراں (شفق) ص ۱۲۵

۲ نفحات الانس (اُردو ترجمہ) ص ٦۳۲ -

تغیر رونما ہوا ۔ اور وہ سلوک و تصوف کی طرف مائل ہوگئے ، ان کا یہ تغیر ان کی شاعری پر بھی اثر انداز ہوا ، اور انھوں نے شاعری کا موضوع تصوف کو بنا کر تصوف کے رموز و اسرار کو اپنی شاعری کے سانچے میں ڈھالا یہاں تک کہ وہ قدیم صوفی شعرا کی صف اول میں شمار ہوتے ہیں ۔

حکیم سنائی جب حج کے لیے گئے تو انھوں نے اثناء سفر میں خراسان کے شہروں میں وہاں کے مختلف صوفیائے کرام سے ملاقات کی ، اور ان سے روحانی استفادہ کیا ۔ ان ملاقاتوں نے ان کی صوفیانہ شاعری کو نیا آب و رنگ بخشا ۔ سنائی نے ۵۴۵ھ (۱۱۵۰-۵۱ء) میں وفات پائی ۔

حکیم سنائی کی جن مثنویوں کا پتا چل سکا ان کے نام یہ ہیں :

(۱) حدیقۃ الحقیقۃ : یہ مثنوی دس ہزار اشعار پر مشتمل ہے ۔ جسے انھوں نے ۵۲۴ھ (۱۱۲۹-۳۰ء) میں لکھنا شروع کیا ، اور ۵۲۵ھ (۱۱۳۰-۳۱ء) میں مکمل کیا ۔

(۲) طریق التحقیق : یہ مثنوی ایک ہزار اشعار پر مشتمل ہے ، جسے انھوں نے ۵۲۸ھ (۱۱۳۳-۳۴ء) میں نظم کیا ۔

(۳) سیر العباد الی المعاد : ان کی یہ مثنوی پانچسو اشعار پر مشتمل ہے ۔

(۴) دیوان قصائد و غزلیات : یہ دیوان بیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے ۔

اس کے علاوہ ان کی طرف جو دوسری مثنویاں منسوب ہیں ، ان کے نام یہ ہیں ، عقل نامہ ، عشق نامہ ، کارنامہ ، عفونامہ ۔[۱]

---

۱ یہ تمام تفصیل کارنامہ بزرگان ایران ، ص ۱۷۰-۱۷۱ سے ماخوذ ہے ۔

۱۱

شیخ فریدالدین عطارؒ

—: ٥ :—

بارگاہ عطار میں علامہ اقبال کی نذرِ عقیدت

بارہویں صدی عیسوی اسلامی تصرف کی تاریخ میں نہایت بار آور صدی ہے اس صدی کے صوفیائے کرام میں حضرت امام غزالی حکیم سنائی شیخ اکبر، شیخ شہاب الدین سہروردی اور خواجہ فرید الدین عطار خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اسی صدی میں تصرف بحیثیت فلسفے کے انتہائی عروج پر پہنچا اسی صدی میں حضرت امام غزالی نے اپنی عظیم الشان تصنیف احیاء العلوم مکمل کی، جس سے تعلیمات تصرف کے سمجھنے میں بڑی مدد ملی۔ دنیائے اسلام میں حضرت امام غزالی کی اس کتاب کی جو عظمت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ وہ اسلامی تاریخ تصرف کا ایک روشن باب ہے۔ شیخ اکبر اور شیخ شہاب الدین سہروردی نے، تصوف کے فلسفے۔ اصطلاحات اور بنیادی مسائل کی وضاحت کی۔

حکیم سنائی اور شیخ فرید الدین عطارؒ نے اپنی شاعری سے بے راہ رو عقل کے اندھیروں میں عشق کا چراغ روشن کیا۔ اور اپنے شاعرانہ توانائیوں اور کمال کو عشق الٰہی کے سوز سے دلوں کے گرمانے کے لیے وقف کیا، اور اس طرح صوفیانہ شاعری کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر کر دیا

حکیم سنائی اور شیخ فرید الدین کی صوفیانہ عظمت اور شاعرانہ کمال کو اکابر صوفیہ نے تسلیم کیا، مولانا روم فرماتے ہیں :

عطّار روح بود، سنائی دوچشم او
ما از پئے سنائی و عطّار آمدیم

ایک اور جگہ فرماتے ہیں

ہفت شہر عشق را عطّار گشت
ما ہماں اندر خم یک کوچہ ایم

ایک اور جگہ عارف رومی اپنی بے پناہ عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے سخن گوئی میں اپنے آپ کو عطّار کا غلام بتاتے ہیں فرماتے ہیں:

من آں مّلائے رومی ام کہ از نطقم شکر ریزد
و لیکن در سخن گفتن غلام شیخ عطّارم

علاء الدولہ رثمنائی جو آٹھویں صدی ہجری کے اکابر صوفیہ اور اہل دل میں شمار ہوتے ہیں حضرت شیخ فرید الدین عطّار کی بارگاہ میں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں :

سّرے کہ درون دل مرا پیدا شد
از گفتہ عطّار وز مولانا شد

علّامہ اقبال نے بھی حضرت شیخ فرید الدین عطّار سے اپنی عقیدت و محبت کا اظہار کیا ہے زبور عجم میں اپنی شاعری اور دوسرے شعرا کی شاعری میں فرق کو واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں

کشودم از رخ معنیٰ نقابے
بدست ذرّہ دادم آفتابے

نہ بینی خیر ازآں مرد فرو دست
کہ بر من تہمت شعر و سخن بست
بکوے دلبراں کارے ندارم
دل زارے، غم یارے ندارم
بجبریل امیں ہم داستانم
رقیب و قاصد و دربان ندانم
مرا با فقر سامان کلیم است
فر شاہنشہی زیر گلیم است
دمے در خویشتن خلوت گزیدم
جہانے لازوالے آفریدم
مرا زیں شاعری خود عار ناید
کہ در صد قرن یک عطّار ناید[1]

علامہ اقبال اس آہ سحرگاہی کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ جیسے عشق سکھاتا ہے اور جیسے عطار، رومی، رازی و غزالی سب اپنا شعار بنائے ہوئے تھے۔ فرماتے ہیں

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو غزالی
کچھ کام نہیں آتا ہے آہ سحرگاہی[2]

علامہ "ضرب کلیم" میں عطّار کے مقام بلند کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

---

[1] زبور عجم، ص ۲۰۴-۲۰۵ کہ "در صد قرن یک عطار ناید" یہ شعر محمود شبستری کا ہے، جو ایک صاحبدل بزرگ تھے، علامہ نے اپنی اس نظم میں اس شعر کو بطور دلیل استعمال کیا ہے تاریخ ادبیات ایران (شفق، ص ۱۲۹-۱۳۰)

[2] بال جبریل، ص-۸۳

مقام ذکر کمالات رومی و عطّار
مقام فکر مقالاتِ بو علی سینا

حالات :

شیخ فرید الدین محمد مشہور بہ عطّار جو خود اکابر صوفیہ میں اور اہل عرفان کے پیشواؤں میں ہیں ، نیشا پور میں پیدا ہوئے ، ان کی ولادت کی تاریخ یقینی طور پر معلوم نہیں ، لیکن قراین سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ چھٹی صدی ہجری کے وسط میں پیدا ہوئے ، یہ سلاجقہ کا دور حکومت تھا ، انھوں نے سو سال یا اس سے بھی کچھ زائد عمر پائی ، انھوں نے اپنے دیوان میں اپنی عمر کے متعلق ساٹھ اور ستر سال کی عمر کی طرف اشارہ کیا ہے ، فرماتے ہیں

مدتِ سی سال سودہ پختہ ایم
مدتِ سی سال دیگر سوختیم

ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

چون ز مقصود خود ندیدم بوی
سوئے عمرے رہم زیان آمد
دین ہفتاد سالہ داد بباد
مردِ میخانۂ مغان آمد

نیز ان کی عمر کے سلسلے میں ان کے دیوان سے یہ شعر بھی نقل کیا گیا ہے :

مرگ درآوردہ پیشِ وادی صد سالہ راہ
عمر تو افکندۂ شب بر سر ہفتاد ماند

حضرت شیخ فرید الدین عطار نے اپنی جوانی کا بڑا حصہ اکتسابِ علوم، تہذیب نفس، اور شیوخ کی خدمت میں گزارا اور بعض اطلاعات سے پتا چلتا ہے کہ انہوں نے مصر، دمشق، مکہ، ہندوستان اور ترکستان کی سیاحت کی تھی۔

حضرت شیخ کا لقب عطّار اِس وجہ سے تھا کہ وہ دوا فروشی کرتے تھے، اور بیماروں کا علاج کرتے تھے، خسرو نامہ میں فرماتے ہیں کہ:

بدارو خانہ پانصد شخص بودند
کہ در ہر روز نبضم می نمودند

رشد و ھدایت :

حضرت عطّار جسمانی شفا سے فرصت پاتے تو عوام کی روحانی شفاء کی طرف متوجہ ہو جاتے، ان ہی فرصت کے اوقات میں شعر کہتے۔

تذکروں اور خود ان کے آثار نظم و نثر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف عارفانِ حق کی صحبت میں رہے، بلکہ خود انہوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ تصوف اور سلوک کی منازل طے کرنے میں صرف کیا یہاں تک کہ مقام ارشاد پر فائز ہوئے، اور کعبہ اہل دل بن گئے

نفحات الانس میں ہے کہ شیخ فرید الدین عطار کے مرشد شیخ مجد الدین بغدادی تھے، بعضوں کا بیان ہے کہ وہ اویسی تھے مولانا رومی فرماتے ہیں کہ: منصور کا نور ڈیرہ سو سال بعد عطّار کی روح میں چمکا، اور وہ اُن کے مربّی ہوئے۔[۲]

---

[۱] یہ تمام تفصیل تاریخ ادبیات ایران (شفق) ص ۱۲۷ سے ماخوذ ہے۔
[۲] نفحات الانس (اردو ترجمہ) ص ۶۳۵ –

شاعری:

رشد و ہدایت میں شیخ فرید الدین عطّار کا سب سے بڑا ذریعہ ابلاغ، شاعری ہے انھوں نے تصوف کی تعلیم کے لیے، اور اپنے پیغام کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے شعر کو پردہ بنایا، اور اس طرح تصوف کی دولت کو عام کر دیا، اُن کے فکر رسا نے تصوف کے نہایت باریک نکات کو اپنے اشعار میں سمو کر انتہائی حُسن اور دلکشی کے ساتھ پیش کیا سوز و گداز، علوئے فکر، نفاست و سلاست و روانی اُن کے کلام کے وہ جوہر ہیں، جو اُن کو دوسروں سے بالکل ممتاز بناتے ہیں، نظم و نثر میں حضرت عطار کو وہ مرتبہ حاصل ہے کہ ان کے اتباع کو بعد میں آنے والے عارفوں اور سخنوروں نے اپنایا، مثنوی میں مقصود کو حکایات کے روپ میں بیان کرنا، اور اس طرح مقصد کی دل نشنی اور کلام کے اثر کئی گونہ بڑھا دینا خواجہ عطّار کی خصوصیت ہے، خواجہ عطار کے اس طرز شاعری نے اُن کے بعد کے شاعروں میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کی، یہاں تک کہ ان کا پرتو مولانا روم، سعدی اور حافظ شیرازی کے کلام میں نظر آتا ہے، اضافِ شاعری میں حضرت شیخ فرید الدین عطار نے ہر صنفِ شاعری کی طرف توجہ کی، اُن کے کلام میں قصائد، مثنوی، غزل ہر ایک کے نمونے ملتے ہیں، لیکن عطّار کی شاعری خالص عرفانی شاعری ہے! اُن کے قصائد اُمرا کی مدح سرائیوں سے پاک، اور شاہد حقیقی کی جلوہ آرائیوں سے مملوء نظر آتے ہیں، اُن کی مثنویوں میں ہمیں مجازی حُسن وعشق کی ترجمانی نہیں ملتی، بلکہ انھوں نے اپنی مثنویوں میں حکایات کے ضمن میں عرفان و تصوف کے رموز و نکات کو نہایت لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے، ان کی غزلیں اثر و تاثیر، سوز و گداز، عرفان و تصوف کا وہ خزانہ ہیں جن کو اہلِ دل پڑھتے ہیں، اور سر دُھنتے ہیں، بلا شبہ سنائی کی غزلیں تصوف کے مضامینِ عالیہ پر مشتمل ہیں، لیکن

جو درد و سوز و گداز اور گرمی ہمیں عطّار کی غزلوں میں ملتی ہے ، اُس میں کوئی ان کا حریف نہیں ، اُن کی غزلوں کی آتش انگیزی بے پناہ ہے ۔ ہر لفظ جو اُن کی زبان سے نکلتا ہے ، اثر و تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے ۔ ان کی غزلوں کو دیکھ کر بے اختیار میر کا یہ شعر زبان پر آجاتا ہے :

نہیں ملتا سخن اپنا کسو سے
ہماری گفتگو کا ڈھب جدا ہے

رضا زادہ شفق نے اپنی تالیف ''ادبیات ایران'' میں حضرت عطّار کے کچھ منتخب اشعار دیے ہیں ، ہم اُن میں سے چند شعر تبرکاً بطور نمونۂ کلام ذیل میں نقل کرتے ہیں :

بعمرِ خویش مدحِ کس نگفتم
دُرے از بہرِ دنیا من نسفتم

— — — —

شعر مدح و ہزل گفتن ہیچ نیست
شعر حکمت بہ کہ دروے پیچ نیست

— — — —

شیخ عطّار وحدت الوجود کے قائل ہیں ، اُن کی شاعری کا موضوع خاص ''وحدت الوجود'' ہے ، بارہویں صدی عیسوی میں انھوں نے اس نظریے کی اشاعت میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیا ۔ اُن کے کلام میں ہمیں جا بجا وحدت الوجود کی جھلکیاں ملتی ہیں ۔ فرماتے ہیں :

ہر کہ را ذرہ ای وجود بود
پیش ہر ذرہ ای سجود بود

نہ ہمہ بُت ز زر و سیم بود
کہ بُت رہروان وجود بود
در حقیقت چو جملہ یک بودہ ست
پس ہمہ بودہا نبود بود
نقطۂ آتشست در باطن
دود دیدن ازوچہ سود بود

در عشق ، تو من توام تو من باش
یک پیرہن ست گو دو تن باش
چون جملہ یکے ست در حقیقت
گو در یک تن دو پیرہن باش
جانان ہمہ آں تو شدم من
من آنِ تو ام ، تو آنِ من باش

مقام توحید کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں -

چویکی باشد ہمی نبود دوئی
ہم منی برخیزد ایں جا ہم توئی

اُن کی شاعری میں ہمیں معرفت ، استغنا ، حیرت ، مقام فنا ، اور تصوف و سلوک کے وہ دوسرے مقامات ملتے ہیں ، جن سے ایک سالک کو گزرنا پڑتا ہے ، انھوں نے اپنی تعلیمات میں مقام عشق پر سب سے زیادہ زور دیا ہے ، اپنی مثنوی "منطق الطیر" میں مقام عشق کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مرد وہ ہے کہ جس کو اپنے مقصد سے اس قدر دل بستگی ہو کہ وہ بے دھڑک راہِ وصال پر گامزن ہو ، اور راہ عشق میں جلنے سے نہ ڈرے ، اس راہ میں شک و یقین ، نیک و بد کی پروا نہ کرے ، اور

اپنے مقصد اور معبود کی جستجو سے لگن رکھے، اور اس منزل میں تامل اور عاقبت اندیشی کو روا نہ رکھے - فرماتے ہیں :

بعد از آن وادیِ عشق آمد پدید
غرقِ آتش شد کسے کانجا رسید
کس دریں وادی بجز آتش مباد
و آنکہ آتش نیست عیشش خوش مباد
عاشق آن باشد کہ چون آتش بود
گرم رو، سوزندہ و سرکش بود
عاقبت اندیش نبود یک زمان
غرق در آتش چو آن برقِ جہان

عشق الٰہی کے بعد وہ اتباعِ رسول اور پیرویِ شریعت پر سب سے زور دیتے ہیں، فرماتے ہیں :

جاوید در متابعتِ مصطفیٰ گزیں
تا نورِ شرعِ او شودت بر تو مقتدا

حضرت عطار کی غزلیں سادگی و پرکاری کا ایک مکمل نمونہ اور پیچیدگی و اغلاق سے بالکل پاک ہیں، اُن کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

عاشقانے کز نسیمِ دوست جاں می پرورند
جملہ اندر سوختن چوں عود اندر مجمراند
ہر کہ در عالم دوئی می بیند آں از احولیست
زانکہ ایشاں در دو عالم جز یکے را ننگرند
جملہ غواصد در دریائے وحدت لا جرم
گرچہ بسیارند، لیکن در صفت یک گوہراند

الا ای زاہدانِ دیں دل بیدار بنمائید
ہمہ ہستید در مستی یکے ہشیار بنمائید
من ایں رندانِ مفلس را ہمہ عاشق ہمی بینم
شما یک عاشق صادق چنیں بیدار بنمائید

ندارد درد ما درمان دریغا
بماندم بے سر و سامان دریغا
عزیزانِ جہان را بیں کہ یک راہ
شدہ با خاک رہ یکسان دریغا
بیا تا در وفائے دوستداران
فرو باریم صد طوفان دریغا
ہمہ یاران بزیرِ خاک رفتند
تو خواہی رفت چوں ایشان دریغا

دست در دامنِ جان خواہم زد
پائے بر فرقِ جہان خواہم زد
چون مرا نام و نشان نیست پدید
دم ز بے نام و نشان خواہم زد
از دلم مشعلہ ای خواہم ساخت
نفسِ شعلہ فشان خواہم زد

غزلوں میں اُن کی عارفانہ شاعری کے یہ چند نمونے ہم نے پیش کیے ، لیکن ان کی بعض غزلوں میں تشبیہات ، ضائع شعری اور شاعرانہ نکتہ پردازی کا مکمل پرتو بھی ہمیں ملتا ہے ، مگر اس قسم کی غزلیں حضرت عطار کے یہاں بہت کم ہیں ، دو چار شعر اس نوعیت کے بھی درج کیے جاتے ہیں :

بادِ شمال می رسد ، جلوهٔ نسترن نگر
وقتِ سحر ز عشقِ گلؔ بلبلِ نعرہ زن نگر
سبزۂ تازہ روئے را ، نو خطِ جوئبار بیں
لالۂ سرخ روے را سوختہ دل چو من نگر
یاسمنِ لطیف را ہم چو عروسِ بکر بیں
بادِ مشاطہ فعل را جلوہ گرِ سمن نگر
نرگسِ نیم مست را عاشقِ زرد روئے بیں
سوسنِ شیرہ خوارہ را آمدہ در سخن نگر
تا گل ، بادشاہ وش ، تخت نہاد در چمن
لشکریانِ باغ را خیمۂ نسترن نگر

مختصر یہ کہ حضرت شیخ فریدالدین عطّار نے عارفانہ شاعری کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر کردیا ، انھوں نے رباعی ، غزل ، قصیدہ تمام اصنافِ سخن میں تصوف کو سمو کر فارسی شاعری کو نئی چاشنی عطا کی۔

تصانیف :

حضرت شیخ فریدالدین عطّار کی تصانیف کثیر ہیں ۔ بعض تذکروں میں اُن کی تصانیف کی تعداد قران مجید کی سورتوں کے برابر بتائی گئی ہے ، چنانچہ مجالس المؤمنین میں ہے :

ہمان خریطہ کشِ داروی فنا عطّار
کہ نظم اوست شفا بخش عاشقانِ حزیں
مقابلِ عددِ سورۂ کلام نوشت
سفینہائی عزیز و کتابہائی گزیں

لیکن ان کی تصانیف جن کے نام اب تک معلوم ہوسکے ، وہ یہ ہیں :

(۱) مصیبت نامہ (۲) الہی نامہ (۳) خسرو نامہ (۴) پند نامہ (۵) اسرار نامہ (۶) شرح القلب (۷) مختار نامہ (۸) جواہر نامہ (۹) دیوان قصائد و غزلیات (جو تقریباً دس ہزار اشعار پر مشتمل ہے) (۱۰) منطق الطیر (۱۱) تذکرۃ الاولیاء (جس میں ۹۶ صوفیائے کرام کے حالات و مناقب، اخلاق و فرمودات کو جمع کیا گیا ہے[1]

وفات :

حضرت فرید الدین عطّار مغلوں کی یلغار کے زمانے میں مغلوں کے ہاتھوں ۶۲۷ھ (۳۰-۱۲۲۹ء) میں شہید ہوئے، ان کا مزار شادیاغ جنوب نیشاپور میں زیارت گاہ خاص و عام ہے[2]۔

کارنامۂ بزرگان ایران میں ہے کہ: شیخ فرید الدین محمد عطّار نیشا پوری، جن کا شمار اکابر صوفیائے کرام میں ہوتا ہے ۵۳۶ھ (۴۲-۱۱۴۱ء) میں نیشا پور کے ایک قصبے کدکن نامی میں پیدا ہوئے، ان کا پیشہ دوا فروشی اور عطّاری تھا، اسی لیے وہ عطّار کے لقب سے مشہور ہوئے، وہ دکان میں بیماروں کے علاج و معالجے میں مشغول رہتے، اور باقی جو وقت ملتا، وہ تحصیل علم اور صوفیائے کرام کی صحبت میں گزارتے یہاں تک کہ وہ سرخیل صوفیہ میں شمار ہونے لگے، ان کے علوئے مرتبت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ مولانا جلال الدین محمد رومی نے ان کی عظمت صوفیانہ کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

ہفت شہر عشق را عطّار گشت
ما ہنوز اندر خم یک کوچہ ایم[3]

---

[1] حضرت شیخ فریدالدین عطّار کے یہ تمام اشعار اور ان کی کتابوں کے نام تاریخ ادبیات ایران (شفق) ص ۱۲۷-۱۳۶ سے ماخوذ ہیں۔

[2] ایضاً ص ۱۳۶ - [3] کارنامۂ بزرگان ایران، ص ۲۴۱-۲۴۲

۱۴

حضرت سید احمد رفاعی علیہ الرحمہ

علامہ اقبال کا حضرت سید احمد رفاعی کے متعلق تاثر:

علامہ اقبال حضرت سید احمد رفاعی کے متعلق آن کی عظمت اور اپنے جذبات عقیدت کو اپنے نغموں میں سمو کر آن کی جلالت شان کو اسرار و رموز میں بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

شیخ احمد سید گردوں جناب
کاسب نور از ضمیرش آفتاب
گل که می پوشد مزار پاک او
لا الله گو یان دمد از خاک او
با مریدے گفت اے جان پدر
از خیالات عجم باید حذر
زانکه فکرش گرچه از گردوں گزشت
از حد دین نبی بیروں گزشت
اے برادر! این نصیحت گوش کن
پند آن آقائے ملت گوش کن
قلب را زیں حرف حق گردان قوی
با عرب در ساز تا مسلم شوی!

---

(۱) کلیات اقبال فارسی (غلام علی اینڈ سنز) اسرار و رموز ص ۱۲۹

حالات :

حضرت سید احمد کبیر علیہ الرحمہ سلسلہ رفاعیہ کے بانی ہیں، اس بر صغیر میں سلسلہ رفاعیہ کے عقیدت مند و مریدین کم ہیں، لیکن یہ سلسلہ عراق، عرب، مصر اور شام وغیرہ میں پھلا پھولا۔

حضرت سید احمد کبیر نے چھٹی صدی ہجری میں اپنے رشد و ہدایت کے چراغ کو روشن کیا، آن کی خانقاہ اصلاح و تربیت کا وہ گہوارہ رہی ہے کہ جن سے ہزاروں انسان سلوک و معرفت کی تعلیم حاصل کر کے نکلے، اور مختلف ممالک کے گوشے گوشے میں پھیل کر عالم انسانیت کو سر بلند کیا، اور بگڑے ہوئے انسانوں کو صلاح و تقویٰ سے آراستہ کر کے معرفت الٰہی اور محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نئی لگن ان میں پیدا کی۔

حضرت سید احمد کبیر رفاعی کی ولادت با سعادت ۱۵ رجب ۵۱۲ھ (۱۱۱۸ء) قریہ حسن میں ہوئی، یہ قریہ واسط اور بصرے کے درمیان واقع ہے، آپ کی کنیت ابوالعباس اور لقب محی الدین تھا۔ آپ کا سلسلہ نسب یہ ہے:

سید احمد کبیر، بن سید علی، بن سید حسن رفاعہ الہاشمی المکی مقیم اشبیلی، بن سید احمد کبیر صالح، بن سید موسیٰ ثانی، بن سید ابراہیم مرتضیٰ، بن امام موسیٰ کاظم رض، بن امام محمد باقر رض، بن امام زین العابدین رض، بن امام حسین رض، بن حضرت علی کرم اللہ وجہہ۔

آپ کی رفاعی کی نسبت سے شہرت کی وجہ یہ ہے کہ آپ کے اجداد میں سید حسن کا لقب رفاعہ تھا، جس کے معنی بلند آواز کے ہیں۔ اسی نسبت سے آپ رفاعی مشہور ہوئے۔

حضرت سید احمد کبیر کی پیشانی سے بچپن ہی سے آثار ولایت نمایاں تھے، آپ نے شیخ عبدالسمیع حربونی سے قرآن مجید حفظ کیا، ۵۱۹ھ (۱۱۲۵ء) میں آپ کے والد نے بغداد میں وفات پائی، اُن کے بعد آپ کے ماموں شیخ منصور بطاعی نے حضرت سید احمد کبیر کی تربیت اور سرپرستی فرمائی، اور آپ کو تعلیم کے لیے ابوالفضل شیخ علی قاری واسطی کے پاس واسط بھیجا ۔

بیس سال کی عمر میں ۔ آپ علوم مروجہ کی تعلیم سے فارغ ہوگئے، جن اساتذہ نے آپ کے جوہرِ قابل کو نکھارا اور سنوارا اُن میں شیخ ابوبکر واسطی اور شیخ عبدالملک الحربونی مشہور ہیں ۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آپ درس و تدریس میں مشغول ہوگئے، پھر آپ علم باطن کی طرف متوجہ ہوئے، اور اپنے ماموں شیخ باز الاشہب منصور کے دستِ حق پرست بیعت ہو کر خرقۂ خلافت حاصل کیا، اور خانقاہ ام عبید میں رشد و ہدایت کے چراغ کو روشن کیا ۔ تشنگانِ علم معرفت پروانہ وار اُس شمع معرفت کے گرد جمع ہونے لگے، وہ اپنے مریدوں میں صحیح جذبات پیدا کرتے، اور ان کی صلاحیتوں کو صحیح طور پر برسر کار لانے کے لیے ہمیشہ ساعی رہتے تھے، آپ کی نگاہ دور رس زندگی کے ہر شعبے میں پہنچتی اور آپ کا اصلاحی ہاتھ زندگی کے ہر پہلو میں محسوس کیا جاتا تھا وہ اپنی تعلیمات میں اتباع شریعت و سُنّت پر بہت زیادہ زور دیتے تھے ۔

حضرت سید احمد رفاعی کے آئینۂ اخلاق میں تواضع، انکسار، اتباع سُنّت کا عکس نمایاں نظر آتا ہے ۔

فرمایا کرتے تھے کہ میں سلوک و معرفت کے تمام طریقے دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تواضع اور انکسار سے بہتر کوئی طریقہ نہیں، اس لیے میں اسی کو پسند کرتا ہوں۔

اتباع سنت کے آپ خود بھی پابند تھے، اور اپنے مریدوں کو بھی اس کی تاکید فرماتے، علماء سو اور صوفیائے خام نے جو من گھڑت باتیں شریعت اور تصوف میں داخل کی تھیں، آپ ہمیشہ ان کی تردید فرماتے، اور بدعات کو مٹانے کی کوشش فرماتے۔

حضرت شیخ سید احمد رفاعی نے تالیف و تصنیف کو کبھی اپنا موضوع خاص نہیں بنایا بلکہ وہ وعظ و تذکیر کے ذریعے اعلاء کلمتہ الحق کرتے رہے، جن کو آپ کے خدام اور مریدین تحریری طور پر محفوظ کر لیتے تھے، آپ کے مواعظ و ارشادات میں ایسی دل کشی تھی کہ ان میں ''از دل خیزد بر دل ریزد'' کی کیفیت سامعین کو محسوس ہوتی تھی، مریدوں اور آپ کے خدام نے ان مواعظ و ملفوظات کو کتابوں کی صورت دی اس نوعیت کے چند رسالے اور کتابیں جن کا اب تک پتا چل سکا ہے، ان کے نام یہ ہیں، (۱) مجالس الاحمدیہ (۲) کتاب الحکم (۳) آثارالنافعہ (۴) الحکم الساطعہ (۵) البرہان المؤید وغیرہ ہیں۔

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی نے البرہان المؤید کا بنیان المشید کے نام سے اردو ترجمہ کر کے اس کے فیوض و برکات کو عام کر دیا ہے۔

کتاب الحکم کا ترجمہ فارسی سے اردو میں مولانا عبدالحلیم شرر مرحوم نے کیا تھا، جو سنہ ۱۹۰۹ء میں دلگداز پریس لکھنؤ سے چھپا تھا، جو مدتوں سے نایاب تھا، یہ سعادت علامہ محمد عبداللہ قریشی

کا مقدر تھی کہ انھوں نے اس کتاب کو ایک فاضلانہ اور مبسوط مقدمہ لکھ کر ''ادارہ آئینہ ادب لاہور'' سے شایع کیا، اور میخانہ معرفت کے متوالوں کے لیے نیا سامان بہم پہنچایا ہم نے بھی علامہ قریشی کے اس مقدمے سے اپنے اس مضمون میں استفادہ کیا ہے، اور ہم قریشی صاحب کے شکر گزار ہیں -

''کتاب الحکم کا یہ ترجمہ پند و موعظت کا ایک گنج گراں مایہ ہے، اور تصوف کے رموز و نکات کا ایک سدا بہار گل دستہ'' ہے، جس کی خوش‌بو اہلِ نظر کے مشام جاں کو ہمیشہ معطر کرتی رہے گی -

یہ نصائح اگرچہ انھوں نے اپنے ایک مرید شیخ عبدالسمیع کے لیے لکھی ہیں، لیکن ان کی افادیت عام ہے -

علامہ اقبال رح نے اپنے اشعار میں حضرت سید احمد رفاعی کے جس مرید کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ مرید یہی شیخ عبدالسمیع ہیں -

عوام اور اہلِ علم کو عجم کے خیالات سے متاثر ہوتے ہوئے دیکھ کر یونانی فلسفے کی گرم بازاری اور عقلیت کے طوفان سے دین کے سرچشموں کو گدلا ہوتے ہوئے دیکھ کر حضرت سید احمد رفاعی بے چین ہو کر شیخ عبدالسمیع کو لکھتے ہیں -

خبردار اہلِ عجم کی زیادتیوں سے دہوکا نہ کھانا اس لیے کہ اُن میں بعض حد سے گزر گئے ہیں، اور حبیب خدا حضرت رسول مجتبیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس کو منع فرمایا ہے۔[1]

(۱) حکمت رفاعی، ص ۵۳ -

روح سے محروم ہیں، اور جو انسانوں کی روح کو مضمحل بناتے ہیں۔

علامہ اقبال کے فکر و نظر پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے، علامہ اقبال کا خودی کا فلسفہ ہے، اور وہ عجم کے خیالات کو اسلام کی روح کے منافی سمجھتے ہیں، چنانچہ وہ خود بھی اس فکر کو شعر کے سانچے میں ڈھال کر ملتِ اسلامیہ کو اس کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

دگر بدشت عرب خیمہ زن کہ بزمِ عجم
مئے گزشتہ و جامِ شکستہ دارد

وہ ملتِ اسلامیہ کے ادیبوں اور شاعروں کو اسی نکتے کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اے میان کیسہ ات نقد سخن
بر عیار زندگی او را بزن

فکرِ روشن بیں عمل را رہبر است
چوں درخشِ برق پیش از تندر است

فکرِ صالح در ادب می بایدت
رجعتے سوئے عرب می بایدت

دل بہ سلمائے عرب باید سپرد
تا دمد صبح حجاز از شام کرد

از چمن زار عجم گل چیدہ
نو بہارِ ہند و ایران دیدہ

ماند کے از گرمی صحرا بخور
بادہ دیرینہ از خرما بخور ۱

پھر ملت اسلامیہ پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے عظیم الشان احسان کو بیان کرتے ہوئے یوں نغمہ سرا ہیں :

دین فطرت از نبی آموختیم
در رہ حق مشعلے افروختیم
ایں گہر از بحر بے پایان اوست
ما کہ یک جانیم از احسان اوست
پس خدا بر ما شریعت ختم کرد
بر رسول ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفل ایام را
او رُسل را ختم و ما اقوام را
خدمت ساقی گری با ما گزاشت
داد ما را آخریں جامے کہ داشت ۲

حضرت شیخ احمد کبیر رفاعی نے ۲۲ جمادی الاول ۵۷۸ھ (۲۳ ستمبر ۱۱۸۲ء) کو وفات پائی، اور ام عبیدہ کی خانقاہ میں مدفون ہوئے، آپ کی وفات کے بعد آپ کی بہن کے صاحبزادے علی بن عثمان نے آپ کی مسند سجادگی کو زینت بخشی،

---

(۱) کلیات اقبال فارسی، ص ۳۸-۳۹

(۲) رموز بے خودی (شیخ غلام علی ایڈیشن) ص ۱۰۲

حضرت سید احمد کبیر رفاعی کے مریدوں کی تعداد اسی ہزار ایک سو بتائی جاتی ہے۔[۱]

دارا شکوہ نے سفینتہ الاولیاء میں حضرت سید احمد کبیر رفاعی کے حالات کے ضمن میں لکھا ہے کہ: امام موسیٰ کاظمؒ کی اولاد سے ہیں، آن کا سلسلہ طریقت پانچ واسطوں سے حضرت شیخ شبلی تک منتہی ہوتا ہے، انہوں نے حضرت غوث اعظمؒ کو دیکھا تھا، اور وہ آن کے بے حد معتقد تھے، ایک مرتبہ اپنے مریدوں سے فرمایا کہ کس میں طاقت ہے کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے مناقب بیان کر سکے، اور آن کے مرتبے کو پہنچ سکے، آن کی ہستی ایسی ہے کہ ایک طرف ہم اور ایک طرف دریائے شریعت، ایک طرف ہم اور دوسری طرف دریائے حقیقت، فرمایا کرتے تھے، وہ بڑا بد قسمت شخص ہے، جس نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی زیارت نہ کی، سفینتہ الاولیاء میں آن کی تاریخ وفات ۱۲ جمادی الاول ۵۷۸ ھ (۱۱۸۳ء) مرقوم ہے۔[۲]

مفتی غلام سرور لاہوری نے اپنے تذکرے خزینتہ الاصفیاء میں حضرت سید احمد رفاعی کے حالات کے ضمن میں لکھا کہ حضرت سید احمد رفاعی آخر میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور طریقت میں آن سے فائدے حاصل کیے،

---

(۱) یہ تمام حالات حکمت رفاعی کے مقدمے، تصنیف علامہ عبداللہ قریشی سے ماخوذ ہیں۔

(۲) ماخوذ از سفینتہ الاولیاء (ترجمہ اردو۔ مطبوعہ نفیس اکیڈیمی، کراچی)، ص ۲۱۹—۲۲۰

۱۳

حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ

علامہ اقبال کا حضرت خواجہ اجمیری سے اظہارِ عقیدت :

برِ صغیر پاک و ہند میں سلسلہ چشتیہ کے مؤسس و بانی حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے متعلق ہمیں علامہ اقبال کے مجموعہائے کلام میں کوئی مستقل نظم نہیں ملتی، لیکن اُن کے بعض اشعار اور مکاتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت خواجہ اجمیری سے غیر معمولی عقیدت و محبت رکھتے تھے، مثلاً اسرار و رموز میں جو ایک طویل نظم انہوں نے حضرت داتا گنج بخش ہجویریؒ کے متعلق کہی ہے، اس کے پہلے شعر میں حضرت خواجہ بزرگ اجمیری کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

سید ہجویر مخدومِ اُمم
مرقدِ او پیرِ سنجر را حرم[1]

بانگِ درا میں ایک جگہ پیرِ سنجر سے اپنی عقیدت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں :

---

(۱) اسرار و رموز، ص ۵۸

دل بے تاب جا پہنچا دیارِ پیر سنجر میں
میسر ہے جہاں درمانِ دردِ نا شکیبائی[1]

اسی طرح اپنے ایک خط ۲۹ مارچ ۱۹۱۰ء میں جو سہاراجا سر کشن پرشاد کے نام ہے، لکھتے ہیں:

دہلی تو گیا تھا، اور دو دفعہ حضرت خواجہ نظام الدین کی درگاہ پر بھی حاضر ہوا تھا، مگر افسوس ہے کہ پیر سنجر کے دربار میں حاضر نہ ہو سکا، انشا اللہ پھر جاؤں گا، اور اس آستانے کی زیارت سے شرف اندوز ہو کر واپس آؤں گا۔[2]

سید عبدالواحد صاحب معینی، نائب صدر، اقبال اکیڈیمی نے مجھ سے بیان کیا کہ انھوں نے اپنے سابق وطن اجمیر شریف میں لوگوں سے سنا تھا کہ علامہ اقبال حضرت خواجہ بزرگ کی درگاہ میں بھی حاضر ہوئے تھے۔

برّ صغیر پاک و ہند میں حضرت داتا گنج بخش ہجویری کے بعد جو عظمت، مقبولیت اور شہرت حضرت خواجہ معین الدین اجمیری کو حاصل ہے، وہ دوسروں کو میسر نہ ہوسکی۔

وہ ہماری تمدنی اور ثقافتی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں، روحانی تربیت اور تزکیہ نفس کے جلیل القدر معلّم ہونے کے ساتھ، آپ نے اس برِّ صغیر میں اسلامی معاشرے کی تعمیر و تشکیل میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔

---

(۱) بانگ درا، ص ۱۶۷

(۲) اقبال نامہ، ج ۲: ص ۱۹۴ – ۱۹۵

غیر منقسمہ ہندوستان کی اسلامی دور کی تاریخ پر اگر غور کیا جائے تو یہ حقیقت واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہے کہ مسلم فرمانرواؤں نے غیر مسلموں کے ساتھ اپنی رواداری کی پالیسی کو کچھ اس طور پر مرتب کیا تھا کہ وہ خود بتدریج اشاعتِ اسلام اور تبلیغ سے کنارہ کش ہوتے گئے۔

مسلم فرمانرواؤں کے اِس رویے نے یہ ذمہ داری علماء اور صوفیائے کرام پر ڈال دی۔ علماء اور صوفیہ نے اپنی اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کیا۔ علماء نے ترویجِ شریعت اور دینی علوم کی درس و تدریس کا کام اپنے ذمے لیا، اور صوفیائے کرام نے تزکیۂ نفس، اصلاحِ اخلاق، اور روحانی تربیت کا مرکز اپنی خانقاہوں کو بنایا، ہر دور میں اِن دونوں گروہوں نے اسلامی معاشرے کو مستحکم اور مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کی انتھک کوششیں کیں۔

صوفیہ اپنی تعلیمات میں پابندیِ اخلاق پر زور دیتے تھے، اور خدمتِ خلق کو اس کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ ٹھہراتے تھے، صوفیہ کے مسلک میں خدمت خلق کو نہایت اہمیت حاصل تھی، یہاں تک کہ وہ دل جو بنی نوع انسان کے جذبۂ محبت و خدمت سے خالی ہو، اس کے ایمان کو بھی ناقص بتاتے تھے۔

صوفیائے کرام شریعت و طریقت کو ہم آہنگ کر کے شرافت، امن، سالمیت اور احترامِ انسانیت کا درس دیتے تھے، انھوں نے تصوف کو عوامی تحریک بنا کر عوام سے گہرا ربط پیدا کر کے عوام کے داخلی اور خارجی مسائل، انداز فکر اور رویوں کو سمجھ کر ان کے معاملات اور مسائل کو سلجھانے کی

کوشش کی، ان کو مساوات ِ اسلامی کی نئی راہ دکھا کر روحانی انداز میں اُن کے اُلجھے ہوئے مسائل کا اتنا عمدہ حل پیش کیا کہ عوام نے اُن کی تعلیمات میں ایک دل آویز کشش محسوس کی، اور وہ اُن میں اس طرح جذب ہوئے کہ عوام کی حمایت اور طاقت نے ان کو ناقابل ِ تسخیر قوت بنا دیا، یہاں تک کہ فرمانرواؤں کا اقتدار اور شوکت اُن کے فقیرانہ انکسار کے سامنے ہیچ ہو کر رہ گئی۔

حضرت عبداللہ بن مبارک[7] جو اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم اور صوفی تھے، ایک مرتبہ رقّہ تشریف لائے، اتفاق سے اُس زمانے میں مشہور عباسی خلیفہ ہارون الرشید بھی رقّہ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ حضرت عبداللہ بن مبارک کی تشریف آوری کی خبر سن کر شہر کی ساری آبادی اُن کے استقبال کے لیے نکل پڑی، ہارون کی ایک کنیز بھی بالا خانے سے یہ منظر دیکھ رہی تھی، ہارون نے اس کنیز سے پوچھا کیا بات ہے کہ لوگ بے تحاشا دوڑے ہوئے جوق در جوق چلے جارہے ہیں؟ کنیز نے جواب دیا کہ خراسان کے مشہور عالم اور صوفی عبداللہ بن مبارک اِس شہر میں تشریف لائے ہیں، اُن کے استقبال کے لیے دنیا ٹوٹ رہی ہے، یہ ہارون کی بادشاہت نہیں کہ بغیر ڈنڈے اور پولیس کے لوگ جمع ہی نہیں ہوتے۔

اِس چھوٹے سے واقعہ سے اِس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صوفیائے کرام کس طرح اپنی تعلیمات سے عوام کے قلوب کو فتح کر کے فاتح ِ زمانہ فرمانرواؤں پر سبقت لے گئے تھے۔

حضرت خواجہ معین الدین اجمیری[7] بھی اُن عظیم المرتبت بزرگوں میں سے ہیں کہ جنھوں نے انسانیت کی بکھری ہوئی کا کلوں

کو سنوارا، اور دین و دنیا، مادیت اور روحانیت میں ایک عظیم توازن پیدا کیا، اور معاشرے میں حسنِ اخلاق، تبلیغ دین اور اشاعتِ اسلام کی شمع روشن کر کے احترامِ انسانیت کا درس دیا۔ آپ نے رشد و ہدایت کی جو جلیل القدر خدمات انجام دیں، وہ ہماری تاریخ کا ایک جلی عنوان ہیں۔

یہ امتیاز بھی سلسلۂ چشتیہ کو حاصل ہے کہ برّ صغیر پاک و ہند میں تصوف کا یہ سلسلہ تمام سلاسل سے پہلے آیا۔

حالات:

اس بر صغیر میں سلسلۂ چشتیہ کے مؤسس و بانی حضرت خواجہ معین الدین چشتی سجزی ۵۳۴ھ (۱۱۳۹ء) میں سجستان میں پیدا ہوئے۔ اسی بنا پر آپ کو سجزی کہا جاتا ہے، بزم صوفیہ کے مؤلف جناب سید صباح الدین عبدالرحمان نے لکھا ہے کہ: (آپ کے نام کے ساتھ) سنجری کتابت کی غلطی ہے، عرب جغرافیہ نویس سیستان یا سجستان کو سجز بھی کہتے ہیں، جس کی نسبت سجزی ہے (نہ کہ سنجری) آپ کی ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے والدین کے زیر سایہ سجستان ہی میں ہوئی۔ ۵۴۴ھ (۴۰ - ۱۱۳۹ء) میں آپ کو مدرسۂ نیشا پور میں داخل کیا گیا، یہ مدرسہ نظامیہ بغداد کے بعد سب سے بڑا مدرسہ تھا، پندرہ سال کی عمر میں آپ کے والد سید غیاث الدین حسن نے بغداد میں وفات پائی، اپنے والد کی وراثت میں جو آپ کو ملا وہ ایک پنچکی اور باغ تھا۔ ۵۵۲ھ (۵۸ - ۱۱۵۷ء) میں جب کہ آپ کی عمر اٹھارہ سال کے قریب تھی ایک مجذوب ابراہیم قندوزی نامی آپ کے باغ میں تشریف لائے، خواجۂ بزرگ نے ان کی خدمت میں انگور کے خوشے پیش کیے لیکن انھوں نے انگور نہیں کھائے،

پھر خود انھوں نے کھلی کا ایک ٹکڑا اپنے دانتوں سے کاٹ کر حضرت خواجہؒ بزرگ کے منہ میں رکھ دیا، ٹکڑے کا منہ میں رکھنا ہی تھا کہ حضرت خواجہؒ بزرگ کا دل دنیا سے متنفر ہو کر زہد و اتقا کی طرف مائل ہو گیا ۔ آپ علائق دنیا سے منہ موڑ کر علم و عمل کی طرف رجوع ہوئے، بخارا پہنچ کر شیخ حسام الدین جیسے یگانہ روزگار عالم سے تعلیم حاصل کی، پھر سمر قند تشریف لائے، یہاں مولانا شرف الدین سے علوم دینی و عقلی کی تکمیل کی۔

بیعت :

علوم ظاہریہ سے فارغ ہونے کے بعد آپ علم باطن کی طرف متوجہ ہوئے اور قصبہ ہرون میں حاضر ہو کر جو کہ نیشا پور کے حدود میں واقع تھا حضرت عثمان ہارونیؒ کے دست حق پرست پر بیعت کی، اور ریاضتوں اور مجاہدوں کے بعد آپ کے مرشد نے آپ کو اپنی خلافت سے سر فراز فرمایا۔

اخبار الاخیار، مونس الارواح اور سفینتہ الاولیاء میں ہے کہ آپ بیس سال تک اپنے مرشد کے ساتھ رہے، اس مدت میں دس سال تک اپنے پیرو مرشد کے ساتھ سیاحت کی، اپنے مرشد کی خدمت کا یہ عالم تھا کہ اثنائے سفر میں مرشد کا بستر اور دوسرا سامان سفر اپنے سر پر رکھ کر چلتے۔

بزرگوں سے ملاقاتیں :

اپنے مرشد کے ساتھ سفر میں آپ کی جن بزرگوں سے ملاقاتیں ہوئیں، ان میں شیخ صدرالدین محمد احمد سیوستانی، حضرت شیخ اوحد الدین کرمانی، خواجہ بہاء الدین اوشی کا خاص طور پر آپ نے ذکر فرمایا ہے۔

حج و زیارت حرمین :

اپنے مرشد ہی کے ساتھ آپ نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی زیارت کی، آپ کے پیر و مرشد نے آپ کے حق میں دونوں جگہ دعا کی، غیب سے ندا آئی:

معین الدین دوست ما است، اورا قبول کردم و بر گزیدم ۔	معین الدین ہمارا دوست ہے، میں نے اس کو قبول کیا اور برگزیدہ کیا ۔

پاک و ہند میں تشریف آوری :

سیر الاقطاب اور سیر العارفین میں ہے کہ : بارگاہِ رسالت سے حضرت خواجہ معین الدین اجمیری کو بر صغیر پاک و ہند میں جانے کی بشارت ملی، سیر الاقطاب میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا :

معین الدین تو عین دین مائی، و لیکن ترا بہ ہندوستان باید رفت و در آں جا مقامے است اجمیر نام............. بہ یمن قدومت در آنجا اسلام آشکار خواہد شد، و کافراں مقہور گردند ۔

حضرت خواجہ بزرگ کے ملفوظاتِ دلیل العارفین میں ہے کہ : ایک روز آپ نے اپنی مجلس میں اشکبار ہو کر فرمایا کہ میں اب اس مقام پر سفر کر رہا ہوں جہاں میرا مدفن ہے پھر ہر شخص سے رخصت ہوئے، اور حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کو اپنے ہمراہ چلنے کا حکم دیا ۔

تذکروں میں ہے کہ حضرت خواجہؒ بزرگ جب اِس بر صغیر پاک و ہند میں لاہور پہنچے تو یہاں آپ نے حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پر چلہ کھینچا، اِسی واقعہ کی طرف علامہ اقبال نے اپنے اِس شعر میں اشارہ کیا ہے:

سید ہجویر مخدومِ اُمم
مرقدِ او پیرِ سنجر را حرم

پھر لاہور سے ملتان تشریف لائے، اور یہاں پانچ سال رہ کر ہندوؤں کی زبان سیکھی اور اس طرح آپ نے اس بر صغیر میں سب سے پہلے لسانی عصبیت پر ضرب کاری لگائی، اور اپنے طرز عمل سے اس حقیقت کو واضح کیا کہ ہر زبان ابلاغ کا ذریعہ ہے، کسی زبان سے تعصب برتنا یا علاقائی عصبیت پر اس کا نہ سیکھنا ابلاغ کے ایک بڑے ذریعہ سے محرومی ہے، آپ نے اپنے عمل سے اس حقیقت کو بھی واضح کیا کہ لسانی عصبیت، محبت، یگانگت اور احترام انسانیت کے گلشن کو سر سبز نہیں ہونے دیتی، اور معاشرے میں ایک ایسا بگاڑ رونما کرتی ہے کہ جو قومی وحدت اور سالمیت کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اس کے بعد آپ دہلی تشریف لائے، اور ۱۰ محرم ۵۶۱ھ (۱۱۶۵ء) کو اجمیر پہنچے، اور آخر وقت تک اجمیر ہی میں مقیم رہے۔

لیکن وحید احمد مسعود صاحب نے اپنی تالیف ''سوانح خواجہ معین الدین چشتی'' میں خواجہ بزرگوار کے اجمیر میں تشریف آوری کے سنہ ۵۶۱ھ کو جو صاحب تاریخ فرشتہ نے درج کیا ہے، غلط قرار دیتے ہوئے اکبر نامہ، تزک جہانگیری، سیر الاولیاء

(۱) خزینتہ الاصفیا، جلد ۱: ص ۲۶۵ و تاریخ فرشتہ۔

کے حوالے سے آپ کی تشریف آوری اجمیر کا سنہ ۵۸۷ھ (۹۲-۱۱۹۱ء) قرار دیا ہے، اور اس وقت آپ کی عمر ۵۴ سال لکھی ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ آپ اجمیر میں اپنے چالیس رفقاء کے ساتھ تشریف لائے تھے، ان کا خیال ہے کہ آپ اجمیر اس وقت تشریف لائے جب کہ محمد غوری نے قلعہ بھٹنڈہ فتح کر لیا تھا، اور ترواوڑی کی دونوں لڑائیوں کے وقت حضرت خواجہ بزرگ، اجمیر میں موجود تھے[1]۔

اجمیر میں رشد و ہدایت :

آپ نے اجمیر میں رشد و ہدایت کا چراغ روشن کر کے اس بر صغیر کو اسلام کی روشنی سے منور کر دیا، اور آپ کے تشریف لانے سے قبل ہندوستان میں عقائد و فکر کی گمراہیاں پھیلی ہوئی تھیں، لوگ صحیح فکر اور صحیح عقیدے سے محروم تھے، طبقاتی تفاوت اور ذات پات نے تمدنی زندگی کو بالکل تباہ کر کے رکھ دیا تھا، غریبوں کے لیے زندگی ایک بوجھ تھی، آپ نے اس عالم میں ان کے سامنے اسلام کا نظریہ پیش کر کے انھیں بتایا کہ اسلام ہی ایک ایسا لائحہ عمل ہے کہ جس کے اختیار کر لینے کے بعد اونچ نیچ، ذات پات کی تفریق ختم ہو کر سب کے لیے مساوات اور امن و خوشحالی کے دروازے کھلتے ہیں ۔

صاحب سیر الاولیا نے اس دور کی تاریکیوں کا نقشہ کھینچتے ہوئے، اور حضرت خواجہ بزرگ کی تبلیغی کوششوں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا کہ :

---

(۱) سوانح خواجہ معین الدین چشتی، مرتبہ وحید احمد مسعود، ص ۱۳۹-۱۴۷ ۔

و کرامت دیگر آنکہ مملکت
ہندوستان تا حد بر آمدن آفتاب
ہمہ دیار کفر و کافری و بت
پرستی بود ۔ و متمردان ہند ہر
یکے دعوئ انا ربکم الاعلیٰ می
کردند، و خدائے را جل و علیٰ
شریک می ساختند و سنگ و
کلوخ و داب و درخت و ستور گاؤ
و سرگین ایشان را سجدہ می
کردند، و بہ ظلمت کفر قفل
دل ایشان مظلم و محکم بود،
...... بوصول قدم مبارک آں
آفتاب اہل یقین کہ بحقیقت
معین الدین بود، ظلمت ایں
دیار بنور اسلام روشن و منور
گشت ۔[1]

اور دوسری کرامت آپ کی یہ
ہے کہ آپ کی تشریف آوری
سے قبل سارے ہندوستان میں
کفر و بت پرستی کا رواج تھا،
اور ہندوستان کا ہر سرکشی
انا ربکم الاعلیٰ کا دعویٰ کرتا
تھا، وہ اپنے آپ کو خدائے
عز و جل کا شریک ٹھہراتے
تھے، اور وہ سب پتھر، ڈھیلے،
درخت، چوپائے، گائے اور ان
کے گوبر کو سجدہ کرتے تھے
اور کفر کی تاریکی سے ان کے
دلوں کے قفل اور بھی تاریک
اور مضبوط ہو رہے تھے، اس
آفتاب اہل یقین کے تشریف
لانے پر جو حقیقت میں
معین الدین تھے، اس ملک کی
تاریکی نور اسلام سے منور ہوئی ہے

سیرالعارفین میں ہے کہ :

بیشتر کفار نامدار ازآں دیار
ببرکت آثار آں زبدۃ الابرار
بتشریف ایمان مشرف شدند، و
بیشترے کہ ایمان نیاوردند
نذر و فتوح بے حد وعد بحضرت

اس ملک کے بہت سے مشہور
کفار حضرت خواجہ بزرگ کی
برکت سے مشرف بہ ایمان ہوئے
اور جو ایمان نہ لائے (ان کی
بھی عقیدت کا یہ عالم تھا) کہ

---

(۱) سیر الاولیاء، ص ۴۷ ۔

ایشان می فرستادند که هنوز آن کفار بدان نمط معتقد اند، هر سالے می آیند و سر به خاک آن آستانهٔ عظیم القدر و آن بدرسپہرشیخت می نہند، ومبلغہائے کلی بمجاوران روضهٔ مطهره ایشان سیر سانند و خدمتے بجائے می آرند۔

وہ کثرت سے نذرانہ اور تحائف آپ کی خدمت میں بھیجتے تھے، اور آج بھی وہ کفار آپ کے اس طریقے پر معتقد ہیں کہ ہر سال آپ کے مزار مبارک پر حاضر ہوتے ہیں، اور آپ کے آستانے کی خاک کو اپنے سر پر رکھتے ہیں، اور آپ کے روضۂ مطہرہ کے مجاورں کو (بطور نذر) کچھ نقد پیش کرتے ہیں، اور خدمت بجا لاتے ہیں۔

''تاریخ مشائخ چشت'' میں ہے کہ اس عظیم مرتبے پر فائز ہونے کے باوجود حضرت خواجہؒ بزرگی شان و شکوہ سے بے نیاز، انکسار اور سادگی کو اپنا شعار بنائے ہوئے تھے - ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں ایک پھٹی ہوئی دو تہی اوڑھے ہوئے بیٹھے رہتے، فقر و فاقے کا یہ حال تھا کہ افطار میں پانچ مثقال سے زیادہ ''جو'' کی روٹی کبھی میسر نہیں آئی - لیکن خدائے تعالیٰ نے آپ کی نظر کیمیا اثر کو یہ تاثیر بخشی تھی کہ جس پر آپ کی نظر پڑ جاتی، وہ گناہوں سے تائب ہو کر نیکی اور پرہیز گاری کو اپنا شعار بناتا - رسالۂ احوال پیران چشت میں ہے کہ:

نظر شیخ معین الدین بر ہر فاسقے کہ افتادے در زمان تائب

شیخ معین الدین [7] کی نظر جس فاسق پر پڑ جاتی، وہ اسی وقت

شد ہے۔ باز گرد معصیت | توبہ کر لیتا، پھر کبھی گناہ
نگشتے۔[۱] | کے قریب نہ پھٹکتا تھا۔

محمد غوری اور قطب الدین ایبک کی وفات کے بعد اجمیر کی سیاسی حیثیت اور اہمیت کم ہو گئی تھی، لیکن آپ اجمیر کو تبلیغ کا مرکز بنائے ہوئے ہیں مقیم رہے، اور آپ کی تعلیم سے پرتھوی راج کے ملازمین بھی اسلام میں داخل ہوئے، صدیوں سے کچلی ہوئی اداس اور محزون زندگیاں اسلام کے پیغام کو سُن کر ایک نیا کیف محسوس کرنے لگیں۔

عوام کی خدمت، آن کی درد مندی، عوام کی تکالیف کو محسوس کرنا، اور خود تکلیف اٹھا کر آن کے درد دکھ کو دور کرنا، انسانی قلوب کو ایک رشتۂ الفت میں پرونا، تصوف کی تعلیم کا اصل مقصد اور منشاء ہے۔

حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رح کی زندگی میں ہمیں یہ کردار نمایاں نظر آتا ہے، ایک مرتبہ سرکاری کارندوں نے ایک کسان کے کھیت ضبط کر لیے، اس نے آکر آپ سے عرض کیا کہ دہلی کے حاکم نے میرے کھیت ضبط کر لیے ہیں، اب وہ کہتا ہے کہ شاہ التمش کے فرمان کے بغیر یہ کھیت تم کو واپس نہیں مل سکتے، اگر آپ شاہ التمش سے میرے کھیتوں کی بحالی کی سفارش فرمائیں تو میری اراضی مجھے واپس مل سکتی ہے، ارشاد فرمایا کہ نہیں، تمہارے اس کام کے لیے خود تمہارے ساتھ دہلی

(۱) سوانح خواجہ معین الدین چشتی، تالیف وحید احمد مسعود ص ۴۷، اخبار الاخیار، ص ۲۲، خواجہ معین الدین چشتی تالیف مولانا عبدالحلیم شرر، ص ۳۹۔

جاؤں گا، چنانچہ آپ اس مظلوم کسان کے ساتھ دہلی تشریف لائے، سلطان التمش کو خبر ہوئی تو وہ خود حاضر خدمت ہوا، اور قدم بوسی کی سعادت حاصل کرنے کے بعد تشریف آوری کی وجہ دریافت کی، آپ نے اس کسان کا سارا واقعہ بیان کر کے اس کی سفارش فرمائی ۔ سلطان شمس الدین التمش نے عرض کیا کہ آپ نے اس کام کے لیے ناحق زحمت فرمائی، اگر آپ اپنے کسی ادنیٰ خادم سے کہلا بھیجتے تو مجھے تعمیل میں کیا عذر ہو سکتا تھا؟ فرمایا مظلوموں کی امداد بھی عبادت میں داخل ہے، اس لیے میں خود ہی اس کام کو انجام دینے کے لیے چلا آیا ۔

مریدوں کی تربیت :

صوفیائے کرام کے نظام تعلیم و تربیت میں کسب حلال اور محنت سے اپنی روزی حاصل کرنے کو بڑی اہمیت حاصل ہے، حضرت خواجہ اجمیری نے اپنے خلفاء اور مریدوں کی تربیت اسی نہج پر کی تھی، کیونکہ انسانی کردار کے نشو و نما میں اس بات کا کہ وہ اپنی روزی کے حاصل کرنے میں سوائے خدا کے کسی دوسرے کا محتاج ہے، بڑا مہلک اثر پڑتا ہے ۔

خواجہؒ اجمیری کے خلفاء میں شیخ حمید الدین صوفی سوالی ناگوری ہیں، یہ ناگور کے قریب موضع سوالے میں مقیم ہوگئے تھے، ان کے پاس ایک بیگھا زمین تھی، جس کو وہ کاشت کر کے اپنی روزی حاصل کرتے تھے، ہمیشہ ایک چادر کمر سے بندھی رہتی، دوسری جسم پر پڑی رہتی، بیوی کا یہ حال تھا کہ سر پر دوپٹا تک نہ تھا، پیراہن کا دامن سر پر ڈال لیتی تھیں، مگر خواجہ اجمیری کی تعلیم و تربیت نے شیخ حمید الدین کو استغنا کی دولت بخش کر عالم سے بے نیاز بنا دیا تھا ۔

ایک دفعہ ناگور کے والی نے بادشاہ وقت کی جانب سے، کچھ زمین اور کچھ نقد روپیہ پیش کیا، اور عرض کیا کہ بادشاہ کی جانب سے آپ یہ نذر قبول فرمائیں، فرمایا ہمارا طریقہ امارت نہیں محبت ہے، میرے خواجگان میں کسی نے ایسی چیزیں قبول نہیں کیں، ایک بیگھا زمین میرے لیے کافی ہے۔[1]

میں اس حقیقت کو بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ وسائل معیشت میں اکثر صوفیاء زمین کی کاشت کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔

وفات :

روز دوشنبہ، ۶ رجب ۶۳۲ ھ (۳۵-۱۲۳۴ء) کو آپ اجمیر میں واصل الی اللہ ہوئے[2] اور اسی حجرے میں مدفون ہوئے جہاں آپ عبادت کیا کرتے تھے، مولانا عبد الحلیم شرر نے آپ کا سن وفات ۶ رجب ۶۳۳ ھ (۱۲۳۶ء) قرار دیا ہے صاحب سیر الاقطاب، صاحب اخبار الاخیار اور صاحب خزینۃ الاصفیاء اور وحید احمد مسعود مؤلف سوانح خواجہ معین الدین چشتی نے بھی آپ کا سنہ وفات ۶۳۳ ھ (۱۲۳۶ء) قرار دیا ہے۔[3]

اولاد :

حضرت خواجہ بزرگ نے قیام اجمیر کے زمانے میں دو شادیاں کی تھیں، ایک ۵۹۰ ھ میں، ان بی بی کا اسلامی نام امۃ اللہ رکھا

---

(۱) سیر الاولیاء، ص ۱۵۷-۱۵۸ و اخبار الاخیار، ص ۲۹-۳۰۔

(۲) بزم صوفیہ، ص ۵۳۔

(۳) سوانح خواجہ معین الدین چشتی ۔ تالیف وحید احمد مسعود، ص ۴۷، اخبار الاخیار، ص ۲۳ ۔ خواجہ معین الدین چشتی ۔ تالیف مولانا عبد الحلیم شرر، ص ۳۹۔

گیا تھا، ان کے بطن سے خواجہ فخر الدین[1]، خواجہ حسام الدین[2] اور بی بی حافظہ جمال[3] پیدا ہوئیں -

دوسری شادی سید وجیہ الدین مشہدی داروغہ اجمیر کی صاحبزادی سے کی تھی، ان کے بطن سے خواجہ ضیاء الدین ابو سعید[4] تھے-[5]

---

(۱) خواجہ فخر الدین : ولادت : ۵۹۱ ھ : قیام : موضع مانڈل عمر : ۷۰ سال - وفات : ۶۶۱ ھ : مدفن : قصبہ سرادر (سوانح خواجہ معین الدین چشتی - تالیف وحید احمد مسعود) ص ۱۷۰ -

(۲) خواجہ حسام الدین : عمر : ۴۵ سال : مزار لب جھالرہ (سوانح خواجہ معین الدین چشتی تالیف وحید احمد مسعود) ص ۱۷۰ -

(۳) بی بی حافظہ جمال : حافظہ قرآن تھیں، سلطان التارکین صوفی حمید الدین ناگوری کے صاحبزادے شیخ رضی الدین عرف عبداللہ سے بیاہی تھیں، ایک اندازے کے مطابق ۶۰۲ ھ میں پیدا ہوئی ہوں گی، بی بی حافظہ جمال کا مزار خواجہ بزرگ کی بائیں جنوبی دیوار کے قریب زیارت گاہ خلائق ہے (سوانح خواجہ معین الدین چشتی) ص ۱۷۰-۱۷۱-

(۴) خواجہ ضیاء الدین ابو سعید : سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے، پچاس سال کی عمر میں وفات پائی، مزار شریف لب جھالرہ احاطہ درگاہ میں ہے (سوانح خواجہ معین الدین چشتی) ص ۱۷۱ -

(۵) یہ تمام تفصیل سوانح خواجہ معین الدین چشتی - تالیف وحید احمد مسعود، ص ۱۶۸-۱۶۹ سے ماخوذ ہے -

خلفاء:

خواجہ بزرگ کے خلفاء کی تعداد کثیر ہے، یہ خلفاء مختلف مقامات پر مامور تھے تاکہ وہ رشد و ہدایت سے ہندوستان کے ظلمت کدے کو نور اسلام سے منور کریں، حقیقت یہ ہے کہ ان ہی بزرگوں نے اپنی تبلیغی جد و جہد سے ہندوستان میں اسلامی عظمت و شوکت قائم کی - لیکن خواجہ اجمیری کے خلفائے کبار میں سے دو بزرگ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ایک صوفی حمید الدین ناگوری[1]، دوسرے خواجہ قطب الدین بختیار کاکی[2] آپ کے ان دونوں خلفاء نے اس شمع معرفت کو جیسے آپ نے

---

(۱) صوفی حمید الدین ناگوری: شیخ حمید الدین صوفی سوالی کا لقب سلطان التارکین ہے، یہ حضرت خواجہ اجمیری کے خلفائے کبار میں ہیں، ناگور کے قریب ایک موضع سوالے کے رہنے والے تھے، آپ متعدد کتابوں کے مصنف تھے، آپ کی مشہور تصنیف ''اصول الطریقہ'' ہے، آپ کے ملفوظات ''سرور الصدر'' کے نام سے آپ کے پوتے اور خلیفہ شیخ فرید الدین نے جمع کیے تھے، تعلیم حدیث میں غیر معمولی شغف رکھتے تھے، شیخ حمید الدین ناگوری نے ۹ ربیع الثانی ۶۷۳ھ (۱۲۷۴ء) میں وفات پائی - (شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور ان کی تعلیمات - تالیف اعجاز الحق قدوسی)، ص ۶۸-۷۱ -

(۲) خواجہ قطب الدین بختیار کاکی: کے والد کا نام سید کمال الدین تھا، خواجہ بختیار کاکی ترکستان کے ایک قصبے اوش ماوراء النہر میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم مولانا ابو حفص سے حاصل کی، خرقۂ خلافت حضرت خواجہ معین الدین اجمیری سے حاصل کیا، اور آپ کے ساتھ ہندوستان تشریف لائے، خواجہ بزرگ

(بقیہ حاشیہ نمبر (۲) صفحہ ۱۳۵ پر)

اجمیر میں روشن کیا تھا، روشن رکھنے اور سلسلۂ چشتیہ کو ہندوستان میں وسیع کرنے کی انتہائی جدوجہد کی۔

(بقیہ حاشیہ نمبر ۲ صفحہ ۱۳۴)

نے ان کو دہلی میں رشد و ہدایت کے لیے مقرر کیا، اور یہ دہلی میں منتقل ہو گئے، آپ ہی کی وجہ سے سلسلۂ چشتیہ کا دوسرا مرکز دہلی میں قائم ہوا، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے ۱۴ ربیع الاول ۶۳۳ھ (۱۲۳۵ء) کو وفات پائی (اخبار الاخیار، ص ۳۶ - شیخ عبد القدوس گنگوہی اور ان کی تعلیمات، ص ۲۷ تا ۸۱)۔

۱۴

حضرت شمس تبریزؒ

حضرت شمس تبریز کے متعلق علامہ اقبال کا تاثر :

حضرت شمس تبریز علامہ اقبال کے مرشد معنوی مولانا روم کے پیر ہیں، ایک مرید کو اپنے پیر کے پیر سے جو عقیدت و محبت ہو سکتی ہے، وہ کسی وضاحت کی محتاج نہیں ۔ خود علامہ اقبال زبور عجم میں اپنے آپ کو مولانا روم اور حضرت شمس تبریز کا رمز شناس بتاتے ہیں ۔

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریزست

ایک اور جگہ علامہ اقبال حضرت شمس تبریز سے اپنے جذبۂ عقیدت کو شعر کا جامہ پہناتے ہوئے فرماتے ہیں :

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گِل ایراں وہی تبریز ہے ساقی

ایک اور جگہ اسرار خودی میں فرماتے ہیں :

شمع خود را ہمچو رومی بر فروز
روم را در آتشِ تبریز سوز

علامہ اقبال بتوسط مولانا روم خود حضرت شمس تبریز کے تصوف کے خوشہ چیں ہیں اور بالواسطہ اُن سے اکتساب فیض کیے ہوئے ہیں اس لیے ہمیں علامہ کی حضرت شمس تبریز سے عقیدت پر مزید کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہیں -

حالات :

حضرت شمس الدین بن علی بن ملک داؤد تبریزی، بعض انہیں شیخ ابو بکر زنبیل باف کا مرید بتاتے ہیں، بعضوں کا بیان ہے کہ شیخ رکن الدین سنجاسی کے مرید ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ انھوں نے بابا کمال جندی سے بیعت کی تھی، ہماری رائے میں آخری روایت زیادہ صحیح ہے، کیونکہ اسرار خودی میں علامہ نے بھی اس روایت کو ترجیح دی ہے، فرماتے ہیں :

پیر تبریزی ز ارشادِ کمال
جست راہِ مکتبِ ملا جلال

نفحات الانس میں ہے کہ مولانا شمس الدین ۶۴۲ ھ (۱۲۴۴-۴۵ ء) میں قونیہ پہنچے، وہ مولانا روم کی تلاش میں قونیہ آئے تھے، مولانا روم کی پیشانی میں عشق و معرفت کے آثار ہویدا دیکھ کر اُن کو اپنا شیفتہ بنایا، یہاں تک کہ اُن کے مرشد روحانی بنے -[1]

مولانا ابوالحسن سید علی ندوی نے تاریخ دعوت و عزیمت حصہ اول میں حضرت شمس تبریز کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا کہ : محمد بن علی بن ملک داد (معروف بہ شمس تبریز) بچپن ہی سے

---

(۱) یہ تمام تفصیل نفحات الانس (اردو ترجمہ)، ص ۴۹۴ سے ماخوذ ہے -

اعلیٰ استعداد اور جذبۂ عشق کے حامل تھے، ابھی آپ سنِ بلوغ کو بھی نہیں پہنچے تھے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے عشق میں تیس تیس چالیس چالیس روز تک آپ کو غذا کی خواہش نہیں ہوتی تھی، علوم ظاہری سے فارغ ہونے کے بعد آپ شیخ ابو بکر سلّہ باف کے مرید ہوئے، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ شیخ زین الدین سنجاسی کے مرید تھے، بعض روایتوں میں دوسرے نام لیے گئے ہیں ممکن ہے کہ آپ نے مختلف بزرگوں سے استفاضہ کیا ہو۔

اس کے باوجود حصول علم معرفت کے لیے متعدد سفر کیے، **سفر** کا طریقۂ کار یہ تھا کہ اس طرح سفر کرتے کہ لوگ آپ کے ولایت و کمال سے آگاہ نہیں ہوتے تھے، نمد سیاہ پہنتے اور جہاں جاتے سرائے میں قیام کرتے، حجرے کے دروازے میں قیمتی قفل ڈلواتے تاکہ لوگ سمجھیں کہ کوئی تاجر ہے مگر اندر سوائے بوریے کے کچھ نہ ہوتا سفر کی کثرت کی وجہ سے لوگ آپ کو شمس پرندہ کہنے لگے تھے، آپ نے تبریز، بغداد، ارزن، الروم اور قیصریہ کے سفر کیے۔

ذریعۂ معاش :

حضرت شمس تبریز نے مریدوں کی نذر و نیاز کو کبھی اپنے لیے ذریعۂ معیشت نہیں بنایا بلکہ وہ عوام کی طرح اپنی معیشت حاصل کرنے کے لیے ازاربند بنتے، اور انہیں کو فروخت کر کے اپنی روزی حاصل کرتے۔ غذا کی یہ کیفیت تھی کہ دمشق میں[۲] ایک سال رہے، ہفتے میں ایک پیالہ سری کا شوربہ اور وہ بھی

بے روغن پی لیا کرتے، تنہا پسند تھے، اکثر دعا فرمایا کرتے کہ خدایا! کوئی رفیق ایسا عطا کر جو میری صحبت کا متحمل ہو۔[1]

حضرت شمس تبریز کے روم تشریف لانے اور عارف رومی کے آن سے بیعت ہونے کا واقعہ اور حضرت شمس تبریز کے غیبت کے حالات، چوں کہ آئندہ صفحات میں مولانا جلال الدین رومی کے حالات میں آرہے ہیں، اس لیے ہم یہاں طوالت و تکرار کی وجہ سے، مولانا شمس تبریز کے ان ہی حالات پر اکتفا کرتے ہیں۔

قاضی تلمذ حسین مرحوم نے ''صاحب مثنوی'' میں حضرت شمس تبریز کے مزید حالات کی تفصیل دیتے ہوئے آپ کے نام کے سلسلے میں لکھا ہے کہ: صاحب مجمع الفصحا نے آپ کا نام شمس الدین محمد بن علی بن ملک داد تبریزی لکھا ہے، اور نفحات الانس میں آپ کا نام شمس الدین علی بن ملک داد تبریزی مذکور ہے مناقب العارفین کے ایک قلمی نسخے میں، آپ کا نام شمس الدین محمد بن علی بن ملک داد تحریر ہے، قاضی تلمذ حسین نے مجمع الفصحاء کی روایت کو زیادہ صحیح قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ آپ کا نام محمد تھا، مناقب العارفین سے بھی اسی کو تائید ہوتی ہے پھر اسی طرح آپ کے وطن میں بھی اختلاف ہے، بعض آپ کو تبریزی بتاتے ہیں، اور بعض آپ کی اصل خراسان سے بتاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ آپ کے والد بسلسلہ تجارت تبریز آئے تھے، اور حضرت شمس تبریز وہیں پیدا ہوئے۔

''صاحب مثنوی'' میں قاضی تلمذ حسین نے بحوالہ افلا کی قونیہ میں حضرت شمس تبریزی کی پہلی آمد کی تاریخ ۲۶ جمادی الآخر ۶۴۲ھ (دسمبر ۱۲۴۴ء) لکھی ہے۔

---

(۱) تاریخ دعوت و عزیمت حصہ اول، ص ۳۱۴-۳۱۵۔

افلاکی نے لکھا ہے کہ حضرت شمس تبریز کی ملاقات کے بعد سے مولانا نے درس و تذکیر بالکل ترک کر دیا تھا، پھر کبھی وعظ نہیں کہا، صرف ایک مرتبہ شیخ صلاح الدین کے اشارے سے وعظ فرمایا، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ:

و تذکیر آخر ہمہ بود، و دیگر بر بالائے منبر نرفت۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شمس تبریز کی ملاقات سے پہلے مولانا سماع کے منکر تھے، لیکن حضرت شمس تبریز کے سماع کی طرف رغبت دلانے پر وہ سماع کی طرف مائل ہوئے، نوبت یہاں تک پہنچی کہ بغیر سماع کے مولانا کو چین نہ آتا تھا، حضرت شمس تبریز ہی کی صحبت نے مولانا میں شاعری کا شعور بیدار کیا۔

لوگوں نے جب یہ دیکھا کہ مولانا حضرت شمس تبریز سے والہانہ عقیدت رکھتے ہیں تو یہ مریدوں اور دوسرے لوگوں پر شاق گزرا، اور رات دن اس فکر میں رہنے لگے کہ کسی طرح حضرت شمس تبریز کو وہاں سے نکالیں، جب حضرت شمس تبریز نے پانی سر سے اونچا ہوتا ہوا دیکھا تو وہ ایک دن نہایت خموشی سے قونیہ سے نکل گئے، افلاکی نے آپ کے پہلی مرتبہ غائب ہونے کی تاریخ روز پنجشنبہ یکم شوال ۶۴۳ھ (۱۲۴۵ء) دی ہے، پھر عارف رومی کے صاحبزادے سلطان ولد اپنے والد کے ارشاد پر دمشق گئے، اور حضرت شمس تبریز کو ساتھ لے کر آئے۔

چند دن کے بعد لوگوں میں پھر حضرت شمس تبریز کی مخالفت شروع ہوگئی، اور آپ آزردہ خاطر ہو کر ۱۰ شعبان ۶۴۴ھ

(۱۲۴۶ء) کو دوبارہ غائب ہو گئے۔ ہم نے آیندہ اوراق میں مولانا روم کے حالات میں حضرت شمس تبریز کے دوبارہ غائب کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں، اس لیے یہاں اُن کے اعادے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

"صاحبِ مثنوی" میں ہے کہ: مولانا جب حضرت شمس تبریز کے غائب ہونے کے بعد صبح کو مدرسے میں تشریف لائے اور حضرت شمس تبریز کو گھر میں نہ دیکھا تو چیخ اٹھے، اور سلطان ولد کے خلوت خانے پر جا کر آواز دی: "بہاء الدین چہ خفتہ ای، بر خیز و طلب شیخت کن کہ باز مشام جاں را از فوائح لطف او خالی می یابیم"۔ دو تین روز جستجو کرتے رہے، مگر کہیں ان کا پتا نہ چلا، مولانا کو اُن کے فراق میں چین نہ آتا تھا، مدرسے کے صحن میں ٹہلتے ہوئے یہ رباعی پڑھا کرتے تھے:

از عشقِ تو ہر طرف شب خیزے
شب گشتہ ز زلفین تو عنبر بیزے
نقاشِ ازل نقش کند ہر طرفے
از بہر قرارِ دلِ من تبریزے

سماع کی طرف تو آپ پہلے ہی راغب ہو چکے تھے، اب یہ حالت ہوئی کہ ایک گھڑی بھی بغیر سماع کے نہیں گزرتی تھی، قوّال عاجز ہو گئے، مگر مولانا کو سماع سے سیری نہیں ہوتی تھی، اسی زمانے میں مولانا نے حضرت شمس تبریز کے فراق میں نہایت دل دوز غزلیں کہیں۔

لباس کی وہ خاص وضع جو مولانا کی جانب منسوب اور خرقۂ مولویہ کا شعار ہے، یہ لباس مولانا نے اسی زمانے میں اختیار کیا، افلاکی نے لکھا ہے کہ حضرت شمس تبریز کے غائب ہونے کے

چالیس دن بعد مولانا نے دستار خانی سر پر باندھی، پھر کبھی سفید دستار نہیں باندھی، اور بردیمنی و ہندی سے فرجی بنائی، آخر وقت تک مولانا کا لباس یہی رہا۔

ایک روز فقر نبوی[ص] کی شرح کرتے ہوئے فرمایا کہ اب خواہش یہ ہے کہ چوقائے سبک پہنوں، فرجی نہ پہنوں، اور حضرت عمر[رض] کی طرح پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنوں، اور ہر طرح فارغ ہو جاؤں۔

عارف رومی کے حضرت شمس تبریز سے عشق و محبت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ اگر کوئی جھوٹوں کو بھی کہہ دیتا کہ میں نے حضرت شمس تبریز کو فلاں جگہ دیکھا ہے تو مولانا لباس تک اتار کر اس کی نذر کر دیتے۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے آ کر کہا کہ میں نے حضرت شمس تبریز کو دمشق میں دیکھا ہے، مولانا یہ سن کر اس درجہ مسرور ہوئے کہ جو کچھ پہنے ہوئے تھے سب اسے بخش دیا، موزے تک اتار کر دے دیے، بعد میں کسی نے کہا یہ خبر غلط ہے، مولانا نے فرمایا اگر خبر صحیح ہوتی تو لباس کے بجائے جان کیوں نہ دیتا، اور اس پر فدا کیوں نہ ہو جاتا۔

دوسری مرتبہ غائب ہونے کے بعد حضرت شمس تبریز کی تلاش میں مولانا نے دمشق کا سفر کیا، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

خبر رسید بہ شام است شمس تبریزی
چہ صبحہا کہ نماید اگر بہ شام بود

عشق نے تسکین کی نئی راہ نکالی، اور وہ خود اپنے وجود میں حضرت شمس تبریز کو محسوس کرنے لگے، اور اپنی ذات میں اپنے

محبوب کو جلوہ گر دیکھنے لگے، خود مولانا نے بعض اشعار میں اس طرف اشارہ کیا ہے، فرماتے ہیں۔

دست بکشا دامن خود را بگیر
مرحم ایں ریش جز ایں ریش نیست

— —

شمس تبریز خود بہانہ ایست
مائیم بلطف و حسن مائیم

حضرت شمس تبریز کی مولانا سے محبت :

حضرت شمس تبریز بھی مولانا سے غیر معمولی محبت رکھتے تھے، اور ان کی بڑی قدر و منزلت فرماتے تھے، ایک روز فرمایا کہ غواص دریائے معانی مولانا ہیں، اور میں تاجر ہوں، پس ہوتی ہمیں دونوں کے درمیان ہے۔

ایک موقع پر فرمایا اگر چاہتے ہو العلماء ورثۃ الانبیاء کے معنی معلوم ہوں تو مولانا کو دیکھ لو۔

وفات :

تمام تذکرہ نویسوں نے حضرت شمس تبریز کا سن وفات ۶۴۵ ھ (۱۲۴۷-۴۸ ء) قرار دیا ہے صرف اسپر نگر نے لکھا ہے کہ بعض مصنفین آپ کا سال وفات ۶۶۰ ھ قرار دیتے ہیں، دولت شاہ نے اپنے تذکرے، تذکرۃ الشعراء میں لکھا ہے کہ: شاہ شمس الدین کی قبر قونیہ میں ہے، اور حضرت شمس تبریز کی وفات مولانا کی وفات کے بعد ہوئی۔

تصانیف :

مثنوی مرغوب القلوب، حضرت شمس تبریز کے نام سے منسوب ہے لیکن محققین اس مثنوی کو حضرت شمس تبریز سے منسوب کرنا غلط قرار دیتے ہیں، البتہ آپ کے بعض اقوال ملتے ہیں، جو رشد و ہدایت کا ایک گنجینہ ہیں -

ایک دفعہ کچھ لوگ قدم عالم پر بحث کر رہے تھے، آپ نے فرمایا قدم عالم سے تمھیں کیا غرض، تم یہ معلوم کرو کہ تم قدیم ہو یا حادث، جو کچھ تھوڑی بہت عمر ہے، اسے اپنی جستجو میں خرچ کرو قدم عالم کے چکر میں نہ پڑو -

موت کے اس درجہ شائق تھے کہ ایک روز ایک جنازہ سامنے سے گزرا تو فرمایا کہ اسے کہاں لے جارہے ہیں، میں سالہا سال سے اس فکر و حسرت میں خون جگر کھا رہا ہوں، لیکن یہ مراد حاصل نہیں ہوتی -

جب کسی سے رنجیدہ ہوتے تو دعا کرتے کہ خدا وندا اس کی عمر دراز کر، اور اسے مال زیادہ دے -[۱]

(۱) یہ تمام واقعات ''صاحب المثنوی'' تالیف قاضی تلمذ حسین مرحوم، ص ۱۲۷ تا ص ۱۲۸ سے ماخوذ ہیں -

۱۵

مولانا جلال الدین رومی

معروف بہ

(مولانا روم)

علامہ اقبال کا مولانا روم کی بارگاہ میں نذرانہ عقیدت :

حضرت مولانائے روم کی عظمت و جلالت شان کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ آج بھی ان کے تذکرے سے عرب و عجم کی محفلیں گونجتی ہیں، ان کے نام اور ان کے کلام کو آج بھی اہل نظر و صاحبان باطن سرمایہ تسکین دل و جان بنائے ہوئے ہیں ان کی ذات پر تاریخ اسلام کو ناز ہے -

علامہ اقبال ان کو اپنے مرشد معنوی سے تعبیر کرتے ہیں، ان کا کوئی مجموعہ کلام ایسا نہیں کہ جس میں علامہ موصوف نے مختلف رنگ میں اپنی عقیدت کے پھول مولانا روم کی بارگاہ میں پیش نہ کیے ہوں ''زبور عجم'' میں وہ اپنے آپ کو ان کا رمز شناس و ادا شناس بتاتے ہوئے فرماتے ہیں :

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی
برہمن زادہ رمز آشنائے روم و تبریز است

"بال جبریل" میں فرماتے ہیں :

صحبت پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سر بکف[1]

ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گلِ ایراں، وہی تبریز ہے ساقی

ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی[2]

ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

مرشدِ رومی حکیم پاک زاد
سرِّ مرگ و زندگی بر ما کشاد

وہ اپنی مئے سخن کو پیر روم کی خم کی شراب بتاتے ہوئے کہتے ہیں :

بیا کہ من زخمِ پیر روم آوردم
مئے سخن کہ جواں تر زبادۂ عنبی است

ایک اور جگہ اپنی شاعری میں مولانا روم کے رہین منت ہونے کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں :

آمیزشے کجا، گہر پاک او کجا
از تاک بادہ گیرم و در ساغر افگنم

---

(۱) کلیات اقبال فارسی (شیخ غلام علی ایڈیشن) ص ۳۳۱ -

(۲) ایضاً، ص ۳۳۸ -

ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

مقامِ ذکر کمالاتِ رومی و عطار
مقامِ فکر مقالاتِ بو علی سینا

ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

ز چشمِ مستِ رومی وام کردم
سرورے از مقامِ کبریائی

ارمغان حجاز میں علامہ نہایت نیاز مندانہ طور پر اس کا اعتراف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مجھے جو کچھ فیض ملا ہے، وہ مولانا روم ہی کا ہے، انھوں ہی نے مجھ کو عشق و مستی سے آشنا کیا ہے :

گرہ از کارِ ایں ناکارہ وا کرد
غبارِ رہ گزر را کیمیا کرد
نئے آں نے نوازے پاک بازے
مرا با عشق و مستی آشنا کرد

(وہ ہر جگہ اس کے معترف نظر آتے ہیں کہ مولاناء روم آن کے مرشد معنوی ہیں، اور انھوں نے مولانا ہی سے روحانی فیض حاصل کیا ہے، فرماتے ہیں :

باز بر خوانم ز فیضِ پیرِ روم
دفترِ سر بستہ اسرارِ علوم
جانِ او از شعلہ ہا سرمایہ دار
من فروغِ یک نفس مثلِ شرار
پیرِ رومی خاک را اکسیر کرد
از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد

موجم و در بحرِ او منزل کنم
تا دُرِ تابندہ حاصل کنم
من کہ مستی ہا ز صہبایش کنم
زندگانی از نفس ہایش کنم

ان اشعار میں واضح طور پر علامہ نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ جو کیف و مستی اُن کے بادۂ اشعار میں نظر آتی ہے، مولانا روم کی عطا کردہ ہے، وہ اپنے خیالات و افکار کے شائستہ، مہذب اور مرتب کرنے میں آن ہی کے رہین منت ہیں، پھر اسی مثنوی میں اپنا ایک خواب بیان کرتے ہیں، جب کہ عرفان و آگہی کی طلب نے آن کو بیقرار کر رکھا تھا، وہ اسی عالم میں سو جاتے ہیں، خواب میں پیر رومی کو دیکھتے ہیں، جو آن کو تسکین دیتے ہوئے، حقیقت کو آن پر منکشف فرماتے ہیں، خودی کے اسرار کو آن پر آشکار کرتے ہیں، چناں چہ علامہ ارشاد فرماتے ہیں کہ عارف رومی کی اس تلقین کے بعد میں نے راز خودی کو فاش کیا ہے، فرماتے ہیں :

شب دلِ من مائل فریاد بود
خامشی از یاربم آباد بود
شکوہ آشوب غمِ دوراں بُدم
از تہی پیمانگی نالاں بُدم
روئے خود بنمود پیر حق سرشت
کو بحرفِ پہلوی قرآں نوشت
گفت اے دیوانۂ اربابِ عشق
جرعۂ گیر از شرابِ ناب عشق
بر جگر ہنگامۂ محشر بزن
شیشہ بر سر، دیدہ بر نشتر بزن

خندہ را سرمایۂ صد نالہ ساز
اشکِ خونیں را جگر پر کالہ ساز

تا بکے چوں غنچہ می باشی خموش
نکہتِ خود را چوں گل ارزاں فروش

آتش استی بزمِ عالم بر فروز
دیگراں راہم ز سوزِ خود بسوز

فاش گو اسرارِ پیرِ مے فروش
موجِ مے شو کسوتِ مینا بپوش

سنگ شو آئینۂ اندیشہ را
بر سرِ بازار بشکن شیشہ را

از نیستاں ہمچو نے پیغام دہ
قیس را از قوم حے پیغام دہ

نالہ را اندازِ نو ایجاد کن
بزم را از ہائے و ہو آباد کن

خیز جانِ نو بدہ ہر زندہ را
از قم خود زندہ تر کن زندہ را

زیں سخن آتش بہ پیراہن شدم
مثلِ نے ہنگامہ آبستن شدم

چوں نوا از تارِ خود برخاستم
جنتے از بہرِ گوش آراستم

بر گرفتم پردہ از رازِ خودی
وا نمودم سرِّ اعجازِ خودی[1]

---

(۱) اسرار و رموز، ص ۸-۹ -

جاوید نامے میں وہ مولانا روم کے اوصاف و خصائل کی مدح سرائی کرتے ہوئے یوں رطب اللسان ہیں :

روح رومی پردہ ہا را بر درید
از پس کُہ پارہ آمد پدید
طلعتش رخشندہ مثل آفتاب
شیب او فرخندہ چوں عہد شباب
پیکرے روشن ز نور سرمدی
در سراپایش سرور سرمدی
بر لب او سرّ پنہان وجود
بند ہائے حرف و صوت از خود کشود
حرف او آئینۂ آویختہ
علم با سوز درون آمیختہ[1]

اسی جاوید نامے میں علامہ اقبال نے پیر رومی کی رہبری میں عالم افلاک کی سیر کی ہے، اسی روحانی سیر میں پیر رومی نے ان پر زندگی کے مختلف اسرار و رموز کی عقدہ کشائی کی ہے ۔ اور علامہ کے مختلف سوالات کے جواب دیے ہیں، جاوید نامے میں علامہ پر مولانا روم کے روحانی فیوض و برکات کا اثر سب سے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے، اسی میں پیر رومی ان سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں :

ہر کجا رومی برد، آنجا برو
یک دو دم از غیر او بیگانہ شو

(۱) جاوید نامہ، ص ۱۳ -

حالات :

مولانا جلال الدین محمد بن سلطان العلماء بہاء الدین محمد بن حسین الخطیبی ایران کے متصوف شعراء میں جلیل القدر شاعر ہیں، وہ بلخ میں ۶۰۴ھ (۷-۱۲۰۸ء) میں پیدا ہوئے، آن کے والد محترم محمد بن حسین ملقب بہ بہاء الدین آس دور کے اکابر علماء و مشائخ میں شمار ہوتے تھے، شیخ نجم الدین کبریٰ[1] کے خلفاء میں تھے اور سلطان علاء الدین خوارزم شاہ کے مزاج میں بڑا اثر و رسوخ رکھتے تھے، پند و موعظت کی وجہ سے جہاں ان کو غیر معمولی مقبولیت و شہرت حاصل ہوئی، وہیں آن کے مخالف بھی پیدا ہوئے آنھوں نے بلخ کے لوگوں سے تکلیف اٹھا کر بلخ سے ہجرت کی، اور بغداد کے راستے اپنے صاحبزادے مولانا جلال الدین رومی کے ساتھ حج کے ارادے سے روانہ ہوئے، غالباً یہ سفر انھوں نے ۶۱۷ھ (۲۱-۱۲۲۰ء) میں اختیار کیا۔ اس وقت مولانا جلال الدین رومی کی عمر ۱۴ سال کی تھی[2]۔

راہ میں جہاں کہیں گزر ہوتا، وہاں کے معززین، امیر و غریب سب آپ کی زیارت کو آتے، جب آپ نیشا پور پہنچے، تو حضرت خواجہ فرید الدین عطار آپ سے ملنے کے لیے آئے، مولانا جلال الدین رومی کو دیکھا تو اپنے سینے سے لگا لیا، اور آن کے والد سے کہا کہ اس جوہر قابل سے غافل نہ ہونا، پھر اپنی مثنوی ''اسرار نامہ'' مولانا روم کو دی، پھر آپ بغداد گئے، اور حج و زیارت سے فارغ ہو کر ملاطیہ پہنچے، اور اس شہر میں چار سال مقیم رہے، اس کے بعد لارندہ تشریف لائے، لارندہ سلجوقیوں

---

(۱) شیخ نجم الدین کبریٰ : شہادت ۶۱۸ھ (۲-۱۲۲۱ء)
نفحات الانس اردو ترجمہ ص، ۴۵۳ -

(۲) تاریخ ادبیات ایران (شفق) ص، ۲۹۲ -

کا دارالحکومت تھا، اس شہر میں آپ نے سات سال قیام کیا۔ پھر سلطان علاء الدین کیقباد (۶۱۷-۶۳۴ھ) کی دعوت پر آپ اس کے دارالحکومت قونیہ تشریف لے گئے، اور وہاں سلطان العلماء بہاء الدین جو علوم ظاہری و باطنی میں بلند مقام رکھتے تھے، درس و تدریس، ارشاد و تلقین میں مصروف ہو گئے، علاء الدین کیقباد آپ سے بے حد عقیدت رکھتا تھا۔ شیخ بہاء الدین نے جمعہ کے روز ۱۸ ربیع الثانی ۶۲۸ھ (۱۲۳۱ء) کو وفات پائی[۱]۔

تعلیم و تربیت :

مولانا جلال الدین رومی نے ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے والد سے حاصل کی، ان کی وفات کے بعد اپنے والد کے مرید سید برہان الدین محقق ترمذی[۲] جو اس زمانے میں قونیہ آئے ہوئے تھے اور اکابر اولیاء اور اہل طریقت میں تھے، ان کے حلقۂ درس میں شریک ہو کر اکتساب فیض کیا، اور پورے نو سال اس مرد حق آگاہ سے تعلیم و تربیت حاصل کرتے رہے، اور اکثر علوم و فنون ان سے حاصل کیے۔ بعضوں کا بیان ہے کہ اسی زمانے میں مولانا روم ان کے مرید ہو گئے تھے۔

مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ اس کے بعد مولانا روم نے حلب کا قصد کیا، جو اس زمانے میں دمشق کی طرح مدینۃ العلم بن چکا

---

(۱) یہ تمام تفصیل تاریخ ادبیات ایران (شفق)، ص ۲۹۲-۲۹۳ سے ماخوذ ہے۔

(۲) سید برہان الدین محقق : ترمذ کے رہنے والے تھے، ان کا مزار دار الفتح قیصریہ میں ہے، (نفحات الانس اردو ترجمہ)، ص ۳۸۸-۳۸۹۔

تھا، حلب پہنچ کر مدرسۂ حلاویہ کے دارالاقامہ میں قیام کیا
مولانا نے مدرسۂ حلاویہ کے سوا حلب کے اور مدرسوں میں بھی
تعلیم حاصل کی[1]۔

مناقب العارفین میں ہے کہ حلب کے بعد مولانا دمشق
تشریف لائے، وہاں کے علماء اور اکابر نے آپ کا شاندار استقبال
کیا، اور مدرسۂ مقدسہ میں لے کر آئے، مولانا دمشق میں تقریباً
سات سال علوم دینیہ کی تحصیل میں مشغول رہے، اس وقت آپ کی
عمر چالیس سال کی تھی[2]۔

بیعت :

دمشق سے مولانا پھر قونیہ تشریف لائے، اس وقت مولانا پر
ظاہری علوم کا رنگ غالب تھا، درس و تدریس میں مشغول رہتے
تھے، وعظ کہتے تھے فتویٰ لکھتے تھے، سماع وغیرہ سے احتراز
کرتے تھے۔ یہاں تک کہ حضرت شمس تبریز آپ کی زندگی میں
داخل ہوئے، انھوں نے آپ کی زندگی کے رنگ ہی کو بدل دیا۔
علامۂ شبلی نے حضرت شمس تبریز کی ابتدائی ملاقات کے واقعات
کو مختلف تذکروں سے یک جا جمع کردیا ہے، ہم اس سلسلے
میں علامہ شبلی کی سوانح مولانا روم سے یہ مختلف روایتیں یک جا
نقل کیے دیتے ہیں۔

جواہر مضیئہ میں ہے کہ ایک دن مولانا روم گھر میں
تشریف رکھتے تھے، آپ کے شاگرد ازدگرد بیٹھے ہوئے تھے،
چاروں طرف کتابوں کے انبار لگے ہوئے تھے، اتفاقاً حضرت شمس تبریز

---

(۱) سوانح مولانا روم (شبلی نعمانی)، ص ۱۸۔

(۲) مناقب العارفین، مطبوعہ ستارۂ ہند۔ آگرہ ص ۵۵-۵۶۔

کسی طرف سے آنکلے، اور سلام کر کے بیٹھ گئے، اور مولانا سے کتابوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا یہ کیا ہے؟ مولانا نے فرمایا یہ وہ چیز ہے، جس کو تم نہیں جانتے، یہ کہنا تھا کہ تمام کتابوں کو آگ لگ گئی، مولانا روم نے کہا یہ کیا ہے، حضرت شمس تبریز نے جواب دیا، یہ وہ ہے جسے تم نہیں جانتے یہ کہہ کر حضرت شمس تبریز چل دیے، اور مولانا کا یہ عالم ہوا کہ گھر بار، مال، اولاد سب چھوڑ چھاڑ کر نکل کھڑے ہوئے اور ملک بہ ملک حضرت شمس تبریز کو ڈہونڈتے پھرے، لیکن حضرت شمس تبریز کا کہیں پتا نہ لگا۔

زین العابدین شروانی نے مثنوی کے دیباچے میں لکھا ہے کہ حضرت شمس تبریز کو اُن کے پیر بابا کمال جندی[1] نے حکم دیا تھا کہ روم جاؤ، وہاں ایک دل سوختہ ہے، اس کو گرم کر آؤ، حضرت شمس تبریز قونیہ پہنچے، شکر فروشوں کی کاروان سرائے میں آترے، ایک روز مولانا روم کی سواری بڑے تزک و احتشام سے نکلی، حضرت شمس تبریز نے سر راہ ان کو روک کر پوچھا کہ مجاہدہ و ریاضت سے کیا مقصد ہے؟ مولانا نے کہا "اتباعِ شریعت" شمس تبریز نے کہا یہ تو سب جانتے ہیں، مولانا نے کہا اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے، حضرت شمس تبریز نے فرمایا کہ علم کے معنی یہ ہیں کہ تم کو منزل تک پہنچائے، پھر حکیم سنائی کا یہ شعر پڑھا :

(۱) بابا کمال جندی : نے علومِ باطنی کی تکمیل شیخ نجم الدین کبریٰ سے کی تھی، آن کے ارشاد کی بناء پر ترکستان میں مولانا شمس الدین مفتی کے صاحبزادے جن کا نام احمد تھا ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے شیخ کا خرقہ انہیں پہنچایا، اور اپنے مرشد کے حکم کے مطابق آن سے تربیت حاصل کی (نفحات الانس (آردو ترجمہ)، ص ۴۶۲-۴۶۳)۔

علم کز تو ترا نہ بستاند
جہل زاں علم بہ بود بسیار

مولانا پر حضرت شمس تبریز کی اس گفتگو کا بڑا اثر ہوا، اور اسی وقت حضرت شمس تبریز کے ہاتھ پر بیعت ہو گئے۔

علامہ اقبال نے بھی اسرار و رموز میں اس واقعہ کو نظم کیا ہے فرماتے ہیں:

پیر تبریزی ز ارشادِ کمال
جست راہِ مکتبِ ملا جلال

گفت ایں غوغائے قیل و قال چیست
ایں قیاس و وہم و استدلال چیست

مولوی فرمود ناداں لب بہ بند
بر مقالاتِ خرد منداں مخند

پائے خویش از مکتبم بیروں گزار
قیل و قال ست ایں ترا باوے چہ کار

قال ما از فہم تو بالا تر است
شیشۂ ادراک را روشن گر است

سوزِ شمس از گفتۂ ملا فزود
آتشے از جان تبریزی کشود

بر زمیں برقِ نگاہ او فتاد
خاک از سوز دمِ او شعلہ زاد

مولوی بیگانہ از اعجازِ عشق
ناشناس نغمہائے سازِ عشق

گفت ایں آتش چساں افروختی
دفتر اربابِ حکمت سوختی

گفت شیخ اے مسلم زنّار دار
ذوق و حال است این ترا با وے چہ کار

حالِ ما از فکر تو بالا تر است
شعلۂ ما کیمیائے احمر است

ساختی از برفِ حکمت ساز و برگ
از سحابِ فکر تو بارد تگرگ

آتشے افروز از خس و خاشاکِ خویش
شعلۂ تعمیر کن از خاکِ خویش

علمِ مسلم کامل از سوز دل است
معنیِ اسلام ترکِ آفل است

چون ز بندِ آفل ابراہیم رست
درمیانِ شعلہ ہا نیکو نشست[1]

ایک اور روایت ہے کہ مولانا حوض کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے، سامنے کچھ کتابیں رکھی ہوئی تھیں، حضرت شمس تبریز نے پوچھا کہ یہ کیا ہیں؟ مولانا نے کہا یہ قیل و قال ہے، تمھیں اس سے کیا غرض، حضرت شمس تبریز نے یہ تمام کتابیں اٹھا کر حوض میں ڈال دیں، مولانا کو نہایت رنج ہوا، اور کہا اے درویش! تم نے ایسی چیزیں ضائع کردیں، جن کا ملنا اب ممکن نہیں، حضرت شمس تبریز نے حوض میں ہاتھ ڈالا اور تمام کتابیں نکال کر کنارے پر رکھ دیں، ساری کتابیں خشک تھیں، اور کسی کتاب پر ذرا بھی نمی نہیں آئی تھی، مولانا سخت متحیر ہوئے، حضرت شمس تبریز نے کہا کہ یہ حال کی باتیں ہیں، تم ان کو کیا جانو، اس کے بعد مولانا ان کے ارادتمندوں میں داخل ہو گئے۔

(۱) اسرار خودی، ص ۷۵-۷۶-

یہ اور اس قسم کی متعدد روایتیں ہمیں تاریخ اور تذکروں میں ملتی ہیں ۔ ان روایتوں کی آبیاری عقیدت کی بارش نے کی ہے ، لیکن حقیقت سے ان کا تعلق بہت کم ہے ۔

مولانا شبلی نے اس سلسلے میں مولانا روم کے شاگرد سپہ سالار کی روایت کو ترجیح دی ہے ، جس کا ماحصل یہ ہے کہ ایک دفعہ حضرت شمس تبریز نے دعا کی کہ الٰہی ! مجھے کوئی ایسا بندہ ملے جو میری صحبت کا متحمل ہو سکے ، عالم غیب سے اشارہ ہوا کہ روم جاؤ ، وہ اسی وقت چل کھڑے ہوئے ، قونیہ پہنچے تو رات کا وقت تھا ، برنج فروشوں کی سرائے میں اترے ، سرائے کے دروازے پر ایک چبوترہ تھا ، اکثر امرا اور عمائدین شہر اس چبوترے پر آکر بیٹھتے ، حضرت شمس بھی اس چبوترے پر بیٹھا کرتے ، مولانا روم کو جب آپ کی آمد کی خبر معلوم ہوئی تو حضرت شمس تبریز کی ملاقات کے لئے آئے ، حضرت شمس تبریز نے آپ کو دیکھتے ہی ایک نظر میں سمجھ لیا کہ یہ وہی شخص ہے ، جس کے متعلق بشارت ہوئی ہے ، دونوں بزرگوں کی آنکھیں چار ہوئیں ، اور دیر تک زبان حال میں باتیں ہوتی رہیں ۔ سپہ سالار کا بیان ہے کہ چھ مہینے تک برابر دونوں بزرگ صلاح الدین زرکوب[1]

---

(۱) صلاح الدین زرکوب : شیخ صلاح الدین فریدون قونیوی معروف بہ زرکوب ابتداءً سید برہان الدین محقق کے مرید تھے ۔ ایک دفعہ مولانا روم زرکوبوں کے محلے سے گزر رہے تھے ، ان کی ضرب کی آواز سے مولانا پر حال کی کیفیت طاری ہوگئی ، صلاح الدین زرکوب یہ دیکھ کر دکان سے باہر کود پڑے ، اور مولانا کے قدموں پر سر رکھ دیا ، مولانا نے ان کو آغوش میں لے لیا ، شیخ زرکوب نے فرمایا دکان لوٹ لو ، اور دونوں جہان سے ازاد ہوگئے اور
(باقی حاشیہ بر صفحہ ۱۵۸)

کے حجرے میں چلہ کش رہے ، کسی کو اس حجرے میں آمد و رفت کی مجال نہ تھی ، حضرت شمس تبریز کی صحبتوں سے مولانا روم میں ایک تغیر عظیم پیدا ہوا ، اب تک سماع سے محترز رہتے تھے ۔ لیکن اب سماع کے بغیر چین نہیں آتا تھا، درس و تدریس وعظ و پند کے اشغال دفعتہً چھوڑ دیے ، حضرت شمس تبریز کی خدمت سے دم بھر کو جدا نہ ہوتے تھے ، مولانا کی طبیعت میں اس انقلاب کو دیکھ کر حضرت شمس تبریز کے خلاف لوگوں میں شورش پیدا ہوئی ، اور آپس میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ ایک دیوانے نے مولانا پر ایسا جادو کر دیا ہے کہ مولانا کسی کام کے نہیں رہے ، حضرت شمس تبریز نے بھی اس شورش کو بھانپ لیا ، اور چپکے سے قونیہ سے نکل کر دمشق چلے گئے ۔ مولانا کو ان کے فراق سے ایسا صدمہ ہوا کہ سب سے قطع تعلق کر کے گوشہ عزلت اختیار کیا ، مدت کے بعد حضرت شمس تبریز نے دمشق سے مولانا کو خط لکھا ، خط کے بعد رائے ہوئی کہ سب مل کر دمشق جائیں اور حضرت شمس تبریز کو ساتھ لے کر آئیں ، سلطان ولد اس قافلے کے سپہ سالار بنے ۔ اور ایک خط مولانا کا لے کر گئے ، اور ساتھ میں تحائف بھی لے کر گئے ، دمشق پہنچ کر یہ خط اور تحائف آپ کی خدمت میں پیش کیے ، حضرت شمس تبریز مسکرائے ، اور فرمایا

بہ دام و دانا نگیرند مرغ دانا را ؂

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۷) :-

دس سال تک مولانا کی خدمت میں رہے ، جب سلطان ولد بالغ ہوئے تو مولانا نے ان کی شادی حضرت صلاح الدین زرکوب کی صاحبزادی سے کی ، اور چلپی عارف اس دختر کے بطن سے پیدا ہوئے ، شیخ صلاح الدین زرکوب نے یکم محرم ۶۵۷ھ کو وفات پائی ۔ نفحات الانس (اردو ترجمہ) ص، ۴۹۷ ۔

پھر فرمایا کہ ان خزف ریزوں کی ضرورت نہیں، مولانا کا پیام کافی ہے۔ اس کے بعد اس کارواں کے ساتھ حضرت شمس تبریز قونیہ واپس آئے، خود مولانا نے قونیہ سے نکل کر ان کا استقبال کیا۔ مدت تک بڑے ذوق و شوق کی صحبتیں رہیں۔

چند روز کے بعد حضرت شمس تبریز نے مولانا کی ایک پروردہ کے ساتھ جس کا نام کیمیا تھا شادی کرلی۔ مولانا نے ان کے لیے مکان کے سامنے ایک خیمہ نصب کرادیا تھا کہ حضرت شمس تبریز اس میں قیام فرمائیں، مولانا کے ایک صاحبزادے جن کا نام علاء الدین چلپی تھا، وہ جب مولانا سے ملنے آتے تو حضرت شمس تبریز کے خیمے میں سے ہو کر جاتے، حضرت شمس تبریز کو یہ بات ناگوار تھی، انھوں نے چند بار منع کیا، لیکن وہ نہ مانے۔ علاء الدین نے لوگوں سے شکایت شروع کی، حاسدوں کو موقع ملا، اور انھوں نے کہنا شروع کیا کہ کیا غضب ہے کہ بیگانہ یگانہ کو گھر میں نہیں آنے دیتا، یہ چرچا عام ہوا، یہاں تک حضرت شمس تبریز نے عزم کرلیا کہ وہ اس مرتبہ جاکر پھر کبھی نہ آئیں گے، چنانچہ وہ دفعتاً غائب ہوگئے، مولانا نے ہر چند تلاش کیا، مگر ان کا پتا نہ چلا۔ یہ واقعہ شعبان ۶۴۵ھ (۴۸-۱۲۴۷ء) میں پیش آیا[1]۔ نفحات الانس اور دوسرے تذکروں میں ہے کہ مولانا روم کے بعض مریدوں نے حسد کی وجہ سے، جن میں ان کے صاحبزادے علاء الدین بھی شریک تھے، حضرت شمس تبریز کو شہید کر دیا[2]۔ ہماری رائے میں پہلی روایت کہ وہ دوبارہ غائب ہو گئے، زیادہ صحیح ہے۔

---

(۱) یہ تمام روایتیں سوانح مولانا روم (شبلی نعمانی)، ص ۲۰—۳۰ سے ماخوذ ہیں۔

(۲) نفحات الانس (اردو ترجمہ) ص ۳۹۶۔

ڈاکٹر رضا زادہ شفق کا بیان :

تاریخ ادبیات ایران میں ڈاکٹر رضا زادہ شفق نے مولانا روم اور حضرت شمس تبریز کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، آیئے ہم یہاں اختصار کے ساتھ نقل کرتے ہیں ۔ 'تاریخ ادبیات ایران' میں ہے کہ :

حلب اور دمشق سے تحصیل علوم کر کے مولانا روم قونیہ آئے، اور یہاں آ کر اپنے والد کی طرح تعلیم و تدریس اور علوم شریعہ کے پھیلانے میں مشغول ہو گئے، یہاں تک کہ ایک شخص نے باہر سے آ کر آن کی زندگی میں ایک عجیب انقلاب پیدا کیا، یہ بزرگ شمس الدین بن علی بن ملک داؤد تبریزی تھے ۔ جو پیران صوفیہ میں تھے، آن کے نفس گرم میں ایک عجیب تاثیر تھی، وہ ایک عظیم جذبہ اور اپنی گفتگو میں ایک عجیب تاثیر رکھتے تھے ۔ مختلف شہروں میں گھومنا، اور اہل راز کے ساتھ ریاضت، اور درویشوں اور عارفوں کے ساتھ آنس وصحبت آن کا خاص شعار تھا ، یہاں تک ۶۴۲ ھ (۱۲۴۴-۴۵ ء) میں یہ مولانا روم کی تلاش میں قونیہ آئے، اور مولانا کے چھرے میں عشق و حقیقت کی تجلیات کو محسوس کر کے آن کو اپنا شیفتہ معنوی بنا لیا، اور آن کے روحانی مرشد اور قائد بنے، مولانا کو جو عقیدت اور بے پایاں محبت حضرت شمس تبریز سے تھی، اس کا اندازہ مولانا کے اشعار اور اقوال سے ہوتا ہے، چنانچہ مثنوی دفتر اول کے ذیل کے اشعار ہمارے اس خیال کی تصدیق کرتے ہیں :

شمس تبریزی کہ نور مطلق ست
آفتاب ست و ز انوار حق ست

این نفس جان دامنم بر تافتست
بوئے پیراھان یوسف یافت ست

کیز بیرائے حق صحبت سالہا
باز گو رمزے از آں خوش حالہا

من چہ گویم یک رگم ہشیار نیست
شرح آں یارے کہ آں را یار نیست

شرح ایں ہجران و ایں خون جگر
ایں زماں بگزار تا وقت دگر

گفتمش پوشیدہ، خوش تر سرّ یار
خود تو از در ضمن حکایت گوش دار

خوش تر آں باشد کہ سرّ دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

ان اشعار سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مولانا روم نے مثنوی کی حکایات میں اور تصوف کے رموز و اسرار بیان کرنے میں حضرت شمس تبریز کے تصوف کو برابر پیش نظر رکھا ہے ۔ اگرچہ آن کا نام نہیں لیا ہے، لیکن آن کے اسرار و عرفان و راز ایمان کو حدیث دیگراں کے انداز میں ذکر کیا ہے، مولانا مدت دراز تک عارف تبریزی کی خدمت میں رہے، اور حضرت شمس تبریز نے ان کی زندگی میں ایک نئی شمع عشق روشن کی ۔

کہتے ہیں کہ حضرت شمس تبریز پر وجد و شوق کا غلبہ تھا، اور وہ غلبۂ حال کی وجہ سے اندرونی مضمرات کے چھپانے پر قادر نہ تھے، اور اسرار کو فاش کرتے تھے، جس کی وجہ سے لوگ آن کے زیادہ مخالف ہو گئے، اور ٦۴۵ ھ (۱۲۴۷-۴۸ ء) میں قونیہ کے عوام نے آن پر حملہ کر کے آن کو شہید کر دیا، اور اس حادثے میں مولانا کے صاحبزادے علاء الدین بھی شدید زخمی ہوئے ۔ لیکن مولانا کی غزلیات سے جو اندازہ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ

حضرت شمس تبریز ایک روز غائب ہو گئے، مولانا دو سال شب و روز اُن کو تلاش کرتے رہے، لیکن کہیں اُن کا پتا نہ چلا[1]۔

سلسلہ :

مولانا کے سلسلۂ باطنی کا نام جلالیہ یا مولویہ ہے۔

وفات :

مولانا کے مرض الموت کے متعلق کچھ تفصیلات نہیں ملتیں، اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کتنے دن علیل رہے، صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ جب مزاج ناساز ہوا تو اس دور کے ماہر اطبّا اکمل الدین اور حکیم غضنفر نے علاج کیا، لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوا، بیماری کی خبر جب عام ہوئی تو عیادت کے لیے تمام شہر ٹوٹ پڑا، حضرت شیخ صدرالدین قونیوی بھی عیادت کے لیے آئے، اور دعا کی کہ خدائے تعالیٰ جلد آپ کو شفا دے، مولانا نے فرمایا شفا آپ کو مبارک ہو، عاشق و معشوق میں ایک پیرہن کا پردہ باقی رہ گیا ہے، کیا آپ نہیں چاہتے کہ وہ بھی اُٹھ جائے، اور نور نور میں مل جائے۔ پھر یہ شعر پڑھا :

چہ دانی تو کہ در باطن چہ شاہی ہمنشیں دارم
رخِ زرینِ من منگر کہ پائے آہنیں دارم

اسی عالم میں ایک شخص نے پوچھا کہ آپ کا جانشین کون ہو گا، آپ نے مولانا حسام الدین چلپی کا نام لیا، دو بار سہ بار پوچھا، پھر بھی یہی جواب دیا۔ چوتھی مرتبہ کسی نے آپ کے صاحبزادے سلطان ولد کا نام لے کر کہا کہ اُن کے حق میں آپ کیا فرماتے ہیں ؟ فرمایا وہ پہلوان ہے، اُسے کسی وصیت کی حاجت نہیں۔ حضرت چلپی حسام الدین نے پوچھا کہ آپ کے جنازے کی نماز کون پڑھائے گا، فرمایا مولانا صدر الدین۔

---

(۱) یہ تمام تفصیل تاریخ ادبیات ایران (شفق) ص، ۲۹۳—۲۹۴ سے ماخوذ ہے۔

آخری لمحات میں اپنے اصحاب و مریدوں سے فرمایا کہ میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ سراً و علانیتہً خدا سے ڈرتے رہو، کھانے سونے اور گفتگو میں کمی کرو، گناہوں سے دور رہو، روزے برابر رکھو، قیام شب کی مداومت کرو، شہوتوں کو ہمیشہ ترک کرتے رہو، ہر طرح کے لوگوں کی جفا برداشت کرو، عامیوں کی ہمنشینی چھوڑ دو، نیکوں اور بزرگوں سے صحبت رکھو، بہترین شخص وہ ہے جو لوگوں کو نفع پہنچائے، اور بہترین کام وہ ہے جو "قل" و "دل" ہو۔[1]

آخر ۵ جمادی الثانیؔ ۶۷۲ ھ (۱۲۷۳ء) بروز یکشنبہ غروب آفتاب کے وقت آپ واصل الی اللہ ہوئے۔ مولانا استیاز الدین نے غسل دیا، شیخ صدر الدین نماز جنازہ پڑھانے کے لیے کھڑے ہوئے، مگر فرط غم سے چیخیں مار کر بے ہوش ہو گئے، آخر قاضی سراج الدین نے نماز جنازہ پڑھائی، قونیہ میں، سولانا کا مزار مبارک آج تک زیارت گاہ خاص و عام ہے۔[2]

✓ وفات سے کچھ پہلے فرمایا طشت پانی سے بھر کر لاؤ، پانی پیشانی پر ملتے تھے، اور یہ شعر پڑھتے تھے :

گر مومنی و شیریں ہم مومن است مرگ
ور کافری و تلخی ہم کافر است مردن

پھر فرمایا میرے احباب ادھر کھینچتے ہیں، اور مولانا شمس الدین ادھر بلا رہے ہیں، اللہ کی طرف بلانے والے کو مانو اور اس پر یقین لاؤ۔

---

(۱) صاحب المثنوی، ص ۲۵۲ ۔

(۲) یہ تمام تفصیل سوانح مولانا روم (شبلی نعمانی) ، ص ۳۸-۳۱ سے ماخوذ ہے ۔

اخلاق :

عارف رومی اپنے اخلاق و کردار میں اتباع رسول اور اور حسن اخلاق کا پیکر مجسم تھے آپ کے آئینۂ اخلاق میں عبادت و ریاضت، خشیت الٰہی، زہد و قناعت، فیاضی و ایثار، استغنا و بے نفسی، اور کسب حلال کا عکس نمایاں نظر آتا ہے۔

مولانا شبلی نے سوانح مولانا روم میں مولانا روم کے اخلاق و عادات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

مولانا جب تک تصوف کے دائرے میں نہیں آئے، آپ کی زندگی عالمانہ جاہ و جلال کی ایک شان رکھتی تھی، ان کی سواری جب نکلتی تھی تو علماء اور طلبہ کا ایک بڑا گروہ ان کی رکاب میں ہوتا تھا، سلاطین و امراء کے دربار سے بھی ان کا تعلق تھا، لیکن سلوک میں داخل ہونے کے ساتھ ہی یہ حالت بدل گئی، درس و تدریس، افتاء و افادے کا سلسلہ اب بھی جاری تھا، لیکن وہ پچھلی زندگی کی ایک محض یادگار تھی، ورنہ زیادہ تر محبت و معرفت کے نشے میں سرشار رہتے تھے۔

ریاضت و عبادت :

ریاضتوں اور مجاہدوں کی یہ کیفیت تھی کہ سپہ سالار جو برسوں آپ کے ساتھ رہے ان کا بیان ہے کہ میں نے کبھی آپ کو شب خوابی کے لباس میں نہیں دیکھا، بچھونا اور تکیہ بالکل نہیں ہوتا تھا، قصداً لیٹتے نہیں تھے، نیند غالب ہوتی تو بیٹھے بیٹھے سو جاتے، ایک شعر میں فرماتے ہیں :

چہ آساید بہر پہلو کہ خسپد
کسیکہ گر خار دارد او نہالین

سماع کی مجلسوں میں مریدوں پر جب نیند غالب ہوتی تو اُن کے خیال سے دیوار سے ٹیک لگا کر زانو پر سر رکھ لیتے، تاکہ وہ لوگ بے تکلف ہو کر سو جائیں، وہ سو جاتے تو خود اٹھ بیٹھتے اور ذکر و شغل میں مصروف ہوجاتے، ایک غزل میں اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

همه خفتند و من دل شده زا خواب نبرد
همه شب دیدهٔ من بر فلک استاره شمرد
خوابم از دیده چنان رفت که ہرگز ناید
خواب من زہر فراق تو بنوشید و بمرد

روزے اکثر رکھتے تھے اور مسلسل کئی کئی روز تک نہ کھاتے تھے۔

نماز میں خشوع و خضوع :

نماز کا وقت آتا تو فوراً قبلے کی طرف مڑ جاتے، اور چہرے کا رنگ بدل جاتا، آپ پر نماز میں نہایت استغراق ہوتا تھا، سپہ سالار کا بیان ہے کہ : میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ اول عشاء کے وقت سے نیت باندھی اور دو رکعتوں میں صبح ہو گئی، ایک غزل میں اپنی نماز کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں :

چو نماز شام ہر کس بنهد چراغ و خوانے
منهم و خیال یارے غم و نوحه و فغانے
چو وضو به اشک سازم، بود آتشیں نمازم
در مسجدم بسوزد چو در و رسد اذانے
عجبا نماز مستان، تو بگو درست ہست آن
که نداند او زمانے، نه شناسد او مکانے

عجباً دو رکعت ست ایں، عجباً چہارم ست ایں
عجباً چہ سورہ خواندم چو نداشتم زمانے
در حق چہ گونہ کوبم؟ کہ نہ دست ماند و نے دل
دل دوست چوں تو بردی بدہ اے خدا امانے
بخدا خبر نہ دارم، چو نماز می گزارم
کہ تمام شد رکوعے کہ امام شد فلانے

ایک دفعہ جاڑوں کے دن تھے، مولانا نماز میں اس قدر روئے کہ تمام چہرہ اور داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی، شدید سردی کے موسم کی وجہ سے آنسو جم کر یخ ہو گئے، لیکن اب نماز میں اسی طرح مشغول رہے۔[1]

زہد و قناعت :

زہد و قناعت کی انتہا یہ تھی کہ سلاطین و امرا کی جانب سے مختلف قسم کے تحائف آتے تھے، لیکن مولانا اپنے پاس کچھ نہ رکھتے تھے، جو چیز آتی اسے صلاح الدین زرکوب یا چلپی حسام الدین کے پاس بھجوا دیتے، کبھی کبھی ایسا اتفاق ہوتا کہ گھر میں نہایت تنگی ہوتی اور مولانا کے صاحبزادے سلطان ولد اصرار کرتے تو کچھ رکھ لیتے، جس دن گھر میں کھانے کا سامان نہ ہوتا تو بہت خوش ہوتے اور فرماتے کہ آج ہمارے گھر میں درویشی کی بو آتی ہے۔

فیاضی و ایثار :

فیاضی و ایثار کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی سائل سوال کرتا تو عبا یا کُرتا جو کچھ بدن پر ہوتا اتار کر سائل کو دے دیتے۔

(۱) تاریخ دعوت و عزیمت حصہ اول؛ ص ۳۲۸ تا ۳۲۹۔

اسی اعتبار سے کُرتا عبا کی طرح سامنے سے کھلا ہوتا تھا کہ اتارنے میں زحمت نہ ہو۔

بے نفسی اور فنائیت :-

بے نفسی اور فنائیت کی یہ کیفیت تھی کہ ایک دفعہ مریدوں کے ساتھ جارہے تھے کہ ایک تنگ گلی میں ایک کتا سو رہا تھا ، جس سے راستہ رک گیا تھا ، مولانا وہیں رک گئے اور دیر تک کھڑے رہے ، اُدھر سے ایک شخص آرہا تھا ، اُس نے کُتّے کو ہٹادیا ، مولانا نہایت آزردہ ہوئے ، اور فرمایا میاں ! اس کو ناحق تکلیف دی ۔

ایک دفعہ راستے میں دو آدمی لڑ رہے تھے ، ان میں سے ایک نے کہا او لعین ! اگر ایک کہے گا تو دس سنے گا ، اتفاق سے مولانا کا ادھر سے گزر ہوا ، آپ نے اس شخص سے فرمایا بھائی جو کچھ کہنا ہے مجھ سے کہو اگر تم ہزار کہو گے تو ایک بھی نہ سُنو گے ، دونوں مولانا کے پاؤں پر گر پڑے اور آپس میں صلح کرلی ۔

استغنا و بے نیازی :-

مولانا بالطبع سلاطین اور اُمرا سے گریز کرتے تھے ، صرف اخلاقاً اُن سے مل لیتے ۔ ایک دفعہ ایک امیر نے ملاقات میں تاخیر کی وجہ بیان کرتے ہوئے معذرت کی کہ میں بہت مشغول رہتا ہوں ، اس لیے کم حاضر ہوتا ہوں ، فرمایا :

> معذرت کی ضرورت نہیں ، میں تم لوگوں کے آنے کی بہ نسبت نہ آنے سے زیادہ ممنون ہوتا ہوں ۔

معیشت :

معاش میں مولانا کا طریقۂ کار یہ تھا کہ انھیں اوقاف کے مد سے پندرہ دینار ماہوار وظیفہ ملتا تھا ۔ وہ مفت خوری کو ناپسند فرماتے تھے لہٰذا اس کے معاوضے میں فتوے لکھا کرتے تھے ، مریدوں کو تاکید فرماتے اگر کوئی فتویٰ لے کر آئے تو لوگو! میں کسی حالت میں ہوں مجھے خبر کر دو ، تاکہ یہ آمدنی مجھ پر حلال ہو ۔

ایک دفعہ کسی نے کہا شیخ صدرالدین کو ہزاروں روپے کا وظیفہ ہے اور آپ کو کُل پندرہ دینار ماہوار ملتے ہیں ، مولانا نے فرمایا ! شیخ کے اخراجات بھی بہت ہیں ، اور حق یہ ہے کہ یہ پندرہ دینار بھی ان ہی کو ملنے چاہیں ۔[1]

تصانیف :

(۱) **فیہ مافیہ** :- یہ مولانا کے ملفوظات کا مجموعہ ہے ، مولانا کے صاحبزادے سلطان بہا ولد نے ۷۵۱ھ (۱۳۵۰-۵۱ء) اس کا مسودہ صاف کیا تھا اصل کتاب اور اس کا اردو ترجمہ دونوں شائع ہو چکے ہیں ۔

(۲) دیوان شمس تبریز :

یہ مولانا روم کا مجموعۂ غزلیات ہے ، اس مجموعے کا نام مولانا نے اس والہانہ عشق و محبت کی بنا پر جو انھیں حضرت شمس تبریز سے تھی ، ''دیوان شمس تبریز'' رکھا ، اس مطبوعہ دیوان میں تقریباً پچاس ہزار اشعار ہیں ۔

---

(۱) یہ تمام واقعات تاریخ دعوت و عزیمت حصہ اول ، ص ۳۲۹ سے ماخوذ ہیں ۔

مولانا کی غزلیں سوز و گداز علوئے معانی ، نفاست و سلاست کی آئینہ دار ہیں ، ان کی غزلوں کا ہر شعر اثر و تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے - ہجر و عشق کی کیفیات کو جہاں انھوں نے شعر میں سمویا ہے شعر کو ایک نیا کیف اور تاثیر عطا کی ہے - ان کی غزلوں کے اشعار میں ان کیفیات کا مظہر ان کے مرشد حضرت شمس تبریز ہیں، حضرت شمس تبریز کے ہجر و فراق نے ان کی غزلوں کو عجب گرمی اور تاثیر بخشی ہے۔ عشق نے مولانا کی شاعری میں وہ درد و سوز عطا کیا ہے کہ جو ان اشعار کو پڑھتا ہے ، سر دھنتا ہے ۔ ان کی شاعری کا موضوع خاص شاہد حقیقی ہے ، انھوں نے غزلوں میں بھی تصوف کے نکاتِ و رموز کو نہایت حسن اور دلکشی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ہم مولانا کی غزلوں کے چند شعر یہاں تبرکاً درج کرتے ہیں :

ہزار بار پیادہ طوافِ کعبہ کنی
قبولِ حق نشود گر دلے بیازاری
ز عرش و کرسی و لوح و قلم فزوں باشد
دلِ خراب کہ آو را بہیچ نشماری

مولانا کا مسلک وحدت الوجود ہے ، انھوں نے اس مسلک کی اشاعت میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیا ہے - ذیل کے دو اشعار میں مسلک وحدت الوجود کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں -

آنہا کہ طلب گار خدائید خدائید
بیروں ز شما نیست شمائید شمائید
چیزے کہ نگردید گم از بہرچہ جوئید
کس غیر شمانیست کجائید کجائید

ز عشق روئے تو من رو بقبلہ آوردم
و گرنہ من ز نماز و ز قبلہ بیزارم

اشارتے کہ نمودی بہ شمس تبریزی
نظر بجانب ما کن غفور غفارم

نہ شبم، نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم
چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

ما دل اندر راہ مردان باختیم
غلغلے اندر جہان انداختیم
خرقہ و سجادہ و تسبیح را
در خرابات مغان انداختیم
ما ز قرآن برگزیدہ مغز را
پوست را پیش خسان انداختیم
بہر عشقے شمس تبریزی لقب
غلغلے در آسمان انداختیم

حاصل عمرم سہ سخن بیش نیست
خام بدم، پختہ شدم، سوختم

بنمائی رخ کہ باغ گلستانم آرزوست
بکشائی لب کہ قند فراوانم آرزوست
یک دست جام بادہ و یک دست زلف یار
رقص چنیں میانہٗ میدانم آرزوست

(۳) مثنوی مولانا روم :

شاعری اور تصوف کی مئے دو آتشہ کو جس نے سب سے پہلے ہم آہنگ کیا، وہ حضرت سلطان ابوسعید ابوالخیر ہیں، جنھوں نے

---

(۱) مولانا کے یہ تمام اشعار تاریخ ادبیات ایران (شفق) ۳۰۶—۳۰۹ سے ماخوذ ہیں۔

رباعی کو اپنا موضوعِ سخن بنا کر تصوف کے اسرار و نکات کو بڑے دلکش انداز میں پیش کیا، انھوں نے فارسی رباعیات کا بیش بہا ذخیرہ چھوڑا ہے، جو اُن کے جذبات عشق کی آئینہ دار ہیں۔

اُن کے بعد حکیم سنائی نے مثنوی کو موضوعِ سخن بنا کر تصوف کو عوام تک پہنچانے میں بڑی زبردست خدمت انجام دی ہے۔

اُن کے بعد ایک اور آتش نوا صاحبِ دل شاعر نے اپنی شاعرانہ نواؤں سے قلوب کو گرما دیا، یہ حضرت شیخ فرید الدین عطار تھے انھوں نے اپنی شاعری سے تصوف کی دولت کو عام کیا، اور اپنے تخیل کی رفعتوں سے شاعری کی تمام اصنافِ سخن کو مالا مال کر دیا۔

لیکن آخر میں جس نے ساری فضا کو صوفیانہ جذبات سے معمور کر دیا وہ مولانا روم تھے، (عارف رومی کی مثنوی نے دلوں کو ایمان و ایقان کی ایک نئی حرارت بخشی، مولانا کی مثنوی نے مولانا کے نام کو ثبت دوام بخشا، مولانا نے مثنوی میں حکایات و قصص کے رنگ میں عرفان و حکمت کے وہ گوہر گراں مایہ جمع کیے ہیں جس کی مثال فارسی ادب میں نہیں ملتی)، مولانا نے عام طبائع کے افہام و تفہیم لیے مثنوی میں استدلال تمثیلی سے کام لیا ہے، اور مثالوں اور تشبیہوں سے یہ کتاب بھری ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ مولانا نے حکایتوں کے ذریعہ اخلاقیات کی تعلیم دی ہے، اس کے ماسوا اخلاق و سلوک کے مسائل کو جن میں اہل نظر میں اختلاف ہے، اُن مسائل کو مولانا نے فرضی مناظروں کے ذیل میں سمجھانے کی کوشش کی ہے، مختصر یہ کہ مثنوی کا اصل مقصد شریعت کے اسرار اور طریقت و حقیقت کے مسائل کو بیان

کرنا ہے ، اور مثنوی میں مولانا نے اس مقصد کو باحسن الوجوہ پورا کیا ہے ۔ اس امر میں کوئی شک نہیں کہ حکیم سنائی اور شیخ فرید الدین عطار کی روشن کی ہوئی شمع کی روشنی میں وہ آگے بڑھے ہیں ، جس کا خود مولانا نے بھی اعتراف کیا ہے ۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مثنوی، مولانا کے فکر و نظر اور تصوف کے اسرار و رموز کا بہترین شاہکار ہے ۔ جو مقبولیت مولانا کی مثنوی کو حاصل ہوئی ، وہ دوسروں کا حصہ نہ بن سکی ۔ بقول صاحب مجمع الفصحاء کے کہ ایران میں جتنی چار کتابیں مقبول ہوئیں ، کوئی نہیں ہوئی ، شاہ نامہ ، گلستاں ، مثنوی مولانا روم ، دیوان حافظ ۔ ان چاروں کتابوں موازنہ کیا جائے تو مقبولیت کے لحاظ سے مثنوی کو ترجیح ہوگی ۔

تذکروں میں ہے کہ مولانا کے مرید خاص حسام الدین چلپی نے آپ سے درخواست کی کہ '' منطق الطیر'' کے طرز پر ایک مثنوی لکھی جائے، مولانا نے فرمایا کہ رات مجھ کو بھی اس کا خیال آیا تھا ، اور اسی وقت یہ چند شعر لکھے تھے :-

بشنو نے از چوں حکایت می کند —— الخ

وز جدائی ہا شکایت می کند

مولانا کی مثنوی چھ دفتروں پر مشتمل جس میں چھبیس ہزار اشعار بحر رمل میں ہیں ۔ مثنوی دفتر اول کی ابتدا مولانا نے کب کی ۔ اس کی صحیح تاریخ معلوم نہیں ، خیال ہے کہ دفتر اول ۶۵۷ھ اور ۶۶۰ھ کے درمیان لکھا گیا ، کیونکہ حسام الدین چلپی کو مولانا نے ۶۵۷ھ (۱۲۵۸—۵۹ء) میں اپنا خلیفہ منتخب کیا تھا۔

مثنوی کے چھ دفتر میں ، دفتر اول کے سوا باقی پانچ دفتر حسام الدین چلپی کے نام سے مزین ہیں ۔ دفتر دوم میں فرماتے ہیں :

مدتے ایں مثنوی تاخیر شد
مہلتے بایست تا خوں شیر شد

چوں ضیاء الحق حسام الدین عناں
باز گردانید ز اوجِ آسماں

چوں بمعراجِ حقائق رفتہ بود
بے بہارش غنچہ ہا نشگفتہ بود

چوں ز دریا سوئے ساحل باز گشت
چنگِ شعرِ مثنوی با ساز گشت

مطلعِ تاریخ ایں سودا و سود
سال اندر ششصد و شصت و دو بود

دفتر سوم میں فرماتے ہیں :

اے ضیاء الحق حسام الدین بیار
ایں سوم دفتر کہ سنت شد سہ بار

چوتھے دفتر میں ارشاد فرماتے ہیں :

اے ضیاء الحق حسام الدین توئی
کہ گزشت از مہ بنورت مثنوی

گردنِ ایں مثنوی را بستہ ای
می کشی آں سو کہ تو دانستہ ای

قصدم از الفاظِ او رازِ تو ست
قصدم از انشاش ، آوازِ تو ست

پانچویں دفتر میں تحریر فرماتے ہیں :

شہ حسام الدین کہ نور انجم ست
طالبِ آغازِ سفر پنجم ست

اے ضیاء الحق حسام الدین راد
اوستادانِ صفا را اوستاد

گر نبودے خلق محجوب و کثیف
ورنہ بودے خلقہا تنگ و ضعیف

در مدیحت داد معنی دادمے
غیر ازیں منطق لبے نکشادمے

چھٹے دفتر میں ارشاد فرماتے ہیں :

اے حیاتِ دل حسام الدین بسے
میل می جو شد بقسم سادسے

پھر اسی دفتر میں لکھا ہے :

اے ضیاء الحق حسام الدین فرید
دولتت پایندہ، قدرت بر مزید

چونکہ از چرخِ ششم کردی گزر
بر فراز چرخِ ہفتم کن سفر
سعد اعداد است ہفت اے خوش نفس
زآنکہ تکمیل عدد ہفت است وبس[1]

---

(۱) یہ تمام تفصیل تاریخ ایران (شفق)، ص ۲۹۶ — ۲۹۷ اور سوانح مولانا روم (شبلی)، ص ۸۰ — ۸۴ سے ماخوذ ہے ۔

مثنوی کی خصوصیات :

مثنوی مولانائے روم گنجینۂ معارف ہے ، مولانا نے قصہ و حکایات کے رنگ میں تصوف کے مضامین عالیہ کو بڑے دل نشین انداز میں پیش کیا ہے ، اور اُن روایتوں اور حکایتوں سے بڑے اہم نتائج نکالے ہیں وہ ان روایات و حکایات میں اپنے استدلال کو قیاس تمثیلی سے مزیّن کرتے ہیں ، اور انھوں نے مثنوی میں بہت زیادہ تشبیہ و تمثیل سے کام لیا ہے ، اور اُس کے ذریعہ سے مسائل کو فہم سے قریب تر کر دیا ہے ۔

زبان کا مسئلہ اور مثنوی :

مثلاً زبان کے مسئلے پر آج جو ہنگامے برپا ہیں ، مولانا نے آج سے سات سو برس پہلے اس انسانی عصبیت کے مرض کو جو مسلم معاشرے کی سالمیت اور وحدت کو پارہ پارہ کر دینے والا ہے محسوس کر لیا تھا ، زبانوں کے بارے میں عارف رومی کا مسلک یہ تھا کہ ہر زبان خدا کی نعمت ہے اس لیے کسی زبان سے عصبیت رکھنا اور اُس کی مخالفت کرنا کسی طرح جائز نہیں ۔ وہ ایک حکایت کے ذریعہ سے تمثیلی رنگ میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ انسانوں کو زیادہ سے زیادہ زبانوں کا علم حاصل کرنا چاہیے اور زبانوں کو نزاع اور باہمی مخاصمت کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیے ، مثنوی میں ایک حکایت بیان کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں کہ : ایک آدمی نے چار آدمیوں کو جو مختلف زبانوں کے بولنے والے تھے ۔ جن میں ایک فارسی ، دوسرا ترکی ، تیسرا رومی ، اور چوتھا عرب تھا ، ایک درم دیا ، فارسی نے کہا کہ میں اِس درھم سے انگور خریدوں گا ، عرب نے کہا ہرگز نہیں میں تو اِس سے عنب خریدوں گا ، ترک نے کہا یہ نہیں ہو سکتا میں تو ازم خریدوں گا رومی نے کہا یہ ہرگز نہیں ہو سکتا میں تو استافیل

خریدوں گا ۔ یہ چاروں آپس میں جھگڑنے لگے ، حالانکہ چاروں اپنی اپنی زبان میں انگور کا نام لے رہے تھے ، اس کے بعد مولانا اس حکایت سے نتیجہ نکالتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر اس موقع پر کوئی شخص ایسا ہوتا کہ جو ان چاروں زبانوں کا جاننے والا ہوتا ، اور انگور ان کے سامنے لا کر رکھ دیتا تو ان کا سارا اختلاف جاتا رہتا ۔[1]

پھر مولانا ہمزبانی کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر ہمزباں نہ ہو تو آدمی بے نوا ہو جاتا ہے ، ہمزبانی ہی دز اصل خویشی و پیوندی ہے ، فرماتے ہیں :

ہر کہ او از ہم زبانے شد جدا
بے نوا شد گرچہ دارد صد نوا

ہم زبانی خویشی و پیوندی است
مرد با نا محرماں چو بندی است[2]

اے بسا ہندو و ترک ہم زباں
اے بسا دو ترک چو بیگانگاں

لیکن وہ ہمزبانی پر فکر و عقائد کے رشتے کو مستحکم اور قابل ترجیح قرار دیتے ہیں ، اور اسے ہمدلی سے تعبیر کرتے ہیں :

پس زبانِ محرمی خود دیگر ست
ہم دلی از ہم زبانی بہتر ست
غیر نطق و غیر ایمان و سجل
صد ہزاراں ترجماں خیزد ز دل[3]

---

(۱) مثنوی مولانا روم ، دفتر دوم ، ص ۱۸۳ ۔
(۲) مثنوی مولانا روم دفتر اول ، ص ۳۰ ۔
(۳) مثنوی مولانا روم دفتر اول ، ص ۳۳ ۔

وہ اسی کے ساتھ تمام زبانوں کو خدا کا عطیہ بتاتے ہیں ، ان کے نزدیک کسی زبان کو اچھا اور کسی کو برا کہنا درست نہیں :

ہر کسے را سیرتے بنہادہ ایم
ہر کسے را اصطلاحے دادہ ایم

ما بری از پاک و ناپاکی ہمہ
از گران جانی و چالاکی ہمہ

ہندیان را اصطلاح ہند مدح
سندیان را اصطلاح سند مدح[1]

مولانا کی تصوف میں بنیادی تعلیمات :

مولانا کی مثنوی یوں تو افکار عالیہ اور تصوف کے رموز و نکات کا ایک گنجینہ ہے، جس کی شرح و بیان اس مختصر سی کتاب میں ممکن نہیں، لیکن ہم اختصار کے ساتھ تصوف کے ان بنیادی مسائل کا ذکر کریں گے ، جن پر مولانا نے بہت زیادہ زور دیا ہے ، اور جن سے علامہ اقبال نے اپنے اشعار میں مرشد معنوی سے اکتساب فیض کیا ہے ۔

عشق و عقل :

سب سے پہلے عباسیوں کے دور میں مسلمان ، یونانی فلسفے اور علوم عقلیہ سے آشنا ہوئے ، اس نئے علم میں معاشرے کے لیے بڑی کشش تھی، مذہبی عقائد کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا جانے لگا ، عقل بے لگام کے اس پیدا کردہ فلسفے نے ، عقائد میں تذبذب ، ایمان میں خلل اور ذہنوں میں ایک خلفشار پیدا کر دیا ، کچھ لوگوں نے

(۱) مثنوی مولانا روم دفتر دوم ، ص ۲۰۴ -

حواس خمسہ کو علم اور یقین کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھنا اُن کا خیال تھا ، جس چیز کا خواس خمسہ سے ادراک نہ ہو آسے کھوٹا سکہ سمجھنا چاہیے ، یونانی فلسفے نے اسلامی عقائد و فکر کو بہت نقصان پہنچایا ، اسلام نے اگرچہ اشیاء کی حقیقت پر غور کرنے کی انسانوں کو دعوت دی ہے ، وہ اپنی تعلیمات میں تعقل و تفکر کی بار بار دعوت دیتا ہے ، لیکن وہ عقل کو بے لگام نہیں چھوڑتا ۔ کیونکہ وہ عقل جو دینی وجدان سے محروم ہے ۔ وہ امرت نہیں بلکہ زہر ہلاہل ہے -

صوفیہ نے عقلیت کے اس طوفان کو عشق کی تعلیم سے روکنے کی کوشش کی ، انھوں نے عقلیت کے مقابلے میں عشق الٰہی پر زور دیا اور اس حقیقت کو واضح کیا کہ عشق ہی سے منزل مقصود کا پتا چل سکتا ہے ، وہ صوفیہ جنھوں نے عشق الٰہی کی تعلیم دی اُن میں حضرت بایزید بسطامی ، حضرت معروف کرخی ، حضرت سری سقطی ، حضرت ذوالنون مصری ، شیخ محی الدین ابن عربی اور حضرت امام غزالی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ ان صوفیائے کرام نے اپنی تعلیمات اور عمل سے انسانوں پر اس حقیقت کو منکشف کیا کہ :

بگزر از عقل و بیا ویز بہ موج یم عشق
کہ دریں جوئے تنک مایہ گہر پیدا نیست

اس دور کے صوفی شعرا نے بھی عشق الٰہی کو اپنی شاعری کا موضوع بنا کر عشق و محبت الٰہی کے پیغام کو عام کیا ، انھوں نے اپنے نغموں سے عشق الٰہی کی گرمی سے قلوب کو گرمایا ، ریب و تذبذب اور انکار کے بھٹکے ہوئے راہیوں کو یقین اور ایمان کی راہ دکھائی ، ان اہل دل شعراء میں سلطان ابو سعید ابوالخیر ،

شیخ فرید الدین عطار ، حضرت عبداللہ انصاری ، حکیم سنائی اور مولانا جلال الدین رومی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مولانا رومی پر جب فلاسفہ و متکلمین اور اہل استدلال کی بے بضاعتی اور حقیقت ناشناسی کی حقیقت منکشف ہو گئی تو مولانا نے مثنوی میں حواس پرستوں اور ان کے وکیلوں پر سخت تنقید کی ، انھوں نے بتایا کہ حواس ظاہری کے علاوہ انسان کے حواس باطنی بھی ہیں ، جو حواس ظاہری کے مقابلے میں نہایت وسیع اور وقیع ہیں ، پھر انھوں نے عقل پر تنقید کرتے ہوئے فرمایا کہ معارف کے بارے میں عقل کوتاہ و نارسا ہے ، اگر محض عقل دینی حقائق و معارف کے لیے کافی ہوتی تو اہل منطق و استدلال اور ائمۂ کلام سب سے بڑے عارف اور دین کے محرم اسرار ہوتے ، وہ اس عقل ایمانی کے قائل ہیں ، جو خود عقل کے لیے رہنما اور اس کے لیے چراغ راہ ہے ۔ ایسی عقل ایمانی ، دین کے شہر کے پاسبانی کا حکم رکھتی ہے ، وہ حکمت یونانی سے حکمت ایمانی کی طرف دعوت دیتے ہوئے ، فرماتے ہیں :

چند چند از حکمت یونانیاں
حکمت ایمانیاں را ہم بخواں

اس کے بعد مولانا نے بے لگام عقل کے مقابلے میں عشق کا آوازہ بلند کیا ، اور عالم اسلامی میں ایک نئے شعور کو بیدار کیا ۔ اور عشق کی کرشمہ سازیاں بیان کرتے ہوئے فرمایا :

از محبت تلخہا شیریں شود
وز محبت مسہا زریں شود
از محبت سجن گلشن می شود
بے محبت روضہ گلخن می شود

ایک اور جگہ عشق کی حیرت انگریزیوں کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ وہ بیماری ہے کہ جس کا بیمار کبھی شفاء نہیں چاہتا :

چملہ رنجوراں شفا جویند و این
رنج افزوں جوید و درد و چنیں
خوب تر زیں سم ندیدم شربتے
زیں مرض خوشتر نہ باشد صحتے

پھر وہ جس عشق کی دعوت دے رہے ہیں ، اس کا تعلق اس عالم آب و گل سے نہیں ، وہ حی و قیوم کا عشق ہے ، وہ عشق حقیقی ہے ، جس کی تازگی اور آبیاری ، سدا بہار پھولوں کی طرح ہے :

عشق بر مردہ نباشد پائیدار
عشق بر حی جان افزائے دار
عشق زندہ در رواں و دز بصر
ہر دمے باشد ز غنچہ تازہ تر
عشق آں زندہ گزیں کو باقی ست
وز شراب جاں فزایت ساقی ست
عشق آں بگزیں کہ جملہ انبیا
یافتند از عشق او کار و کیا

وہ عشق کو روحانی امراض کا شافی بتاتے ہوئے اسے افلاطون و جالینوس قرار دیتے ہیں :

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیب جملہ علت ہائے ما

اے دوائے نخوت و ناموس ما
اے تو افلاطون و جالینوس ما

وہ عشق حقیقی کو آب حیات سے تعبیر کرتے ہیں جو دل کو زندگی اور روح کو نشاط بخشتا ہے ، اور اس سے ہر دور زندگی میں توانائی اور رعنائی محسوس ہوتی ہے فرماتے ہیں :

دل بجو تا دائما باشی جواں
از تجلی چہرہ ات چوں ارغواں
طالب دل شو کہ تا باشی چو گل
تا شوی شاداں و خنداں ہمچو گل

انسانیت :

تصوف اسلامی میں انسانیت کا بلند مقام ہے ، شخصی سلطنتوں کے اثرات ، طبقاتی تفاوت اور پیہم مظالم نے ساری انسانیت کو دکھی بنا دیا تھا عام انسان زندگی سے بیزاری اور احساس کمتری کا شکار تھا ، لوگوں میں عام طور پر بے اعتمادی ، ناامیدی ، افسردگی اور شکستہ دلی پائی جاتی تھی ، مولانا نے اپنی شاعری سے لوگوں کو انسان کی عظمت اور اس کے مقام کا عرفان بخشا ، اور بتایا کہ قرآن مجید میں جا بجا انسان کو احسن التقویم کے خطاب سے سرفراز فرمایا گیا ہے ، انسان ایک گراں مایہ گوہر ہے ، اسی کے سر پر کرامت کا تاج رکھا گیا ہے ، انسان خلاصۂ کائنات اور مجموعۂ اوصاف عالم ہے ، انسان وہ کوزہ ہے جس میں دریا بند ہے ، اس کے سختصر سے وجود میں عالم پنہاں ہے ، اسی سے عالم کا رنگ و بو اور زندگی کی آبرو ہے ، یہی نہیں بلکہ وہ مظہر صفات الٰہی ہے ، اور ایک ایسا آئینہ ہے جس میں تجلیات و آیات کا عکس نظر آتا ہے ، مولانا نے مقام انسانیت کو بیان

کر کے انسانوں کی عزت نفس کے شعور کو بیدار کیا ہے ۔ جس کو علامہ اقبال خودی سے تعبیر کرتے ہیں ۔

مختصر یہ کہ مثنوی مولانا روم میں ہمیں اسلام کے بنیادی عقائد ، مثلاً وجود باری ، بعثت انبیاء ، معاد ، جبر و اختیار علت و معلول اور تصوف اسلامی کے تمام مسائل بڑے دلکش انداز میں ملتے ہیں ۔ مثنوی میں چونکہ تمام قرآنی تعلیمات کا عکس جمیل ہے ۔ اور رموز تصوف اسلامی کا گنجینہ ہے ، اسی لیے کسی شاعر نے مبالغے سے کہا ہے

مثنوی مولوی معنوی
ہست قرآں در زبان پہلوی

اقبال کے کلام میں مولانا کا پرتو :

یوں تو مولانا کی مثنوی نے مسلمانوں کے افکار ، ادب اور شاعری پر گہرا اثر ڈالا ، اور دماغ کو نئی تازگی اور قلوب کو نئی حرارت بخشی اور اہل سلوک و معرفت کو عارفانہ مضامین کا ایک خزانہ ملا ، اس لیے ہر دور کے اہل دل نے مثنوی کو شمع محفل اور ترجمان دل بنایا لیکن چھ سو برس گزرنے کے بعد پاکستان کے ایک مفکر شاعر علامہ اقبال نے مولانا روم کے افکار کا بنظر غائر مطالعہ کیا ، مثنوی نے ان کو نئی روح اور نیا جذبہ عطا کیا ، عارف رومی کی معارف پرور شاعری نے ان کو اس حقیقت سے روشناس کرایا کہ گل و بلبل ، شاہد و مے کا زمانہ گزر چکا ، عشق کی ہوسناکیوں کی مداحی کا زمانہ ختم ہوچکا ، اب شاعری کو نئے فکر او راسلامی عقائد سے مزین کرنے کی ضرورت ہے ، مثنوی کے عمیق مطالعے نے عقیدت کے دریچے کو وا کیا ، انہوں نے اپنا مرشد معنوی مولانا روم کو تسلیم کیا ، چنانچہ فرماتے ہیں :

باز بر خوانم ز فیضِ پیرِ روم
دفترِ سر بستہ اسرارِ علوم)

علامہ کی پیر رومی سے بے پایاں عقیدت و محبت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ وہ جاوید نامے میں مولانا کے حسن ظاہری اور اوصاف باطنی کی اپنے اشعار میں تصویر کھینچتے ہوئے کہتے ہیں :

طلعتش رخشندہ مثلِ آفتاب
شیبِ او فرخندہ چون عہدِ شباب

پیکرِ روشن ز نورِ سرمدی
در سراپایش سرورِ سرمدی

بر لبِ او سرّ پنہانِ وجود
بندہائے حرف و صوت از خود کشود

حرفِ او آئینۂ آویختہ
علم با سوزِ دروں آمیختہ

(وہ اسرار و رموز کی عقدہ کشائی میں اپنے آپ کو رومی کے رہین منت بتاتے ہوئے فرماتے ہیں :

رازِ معنیٰ مرشد رومی کشود
فکرِ من بر آستانش در سجود

مرشد معنوی کی روح نے ان پر از سر نو شعر و حکمت کے دروازے کھولے ۔ اور ان کی شاعری کے لیے نئی راہیں متعین کرتے ہوئے بقول حضرت علامہ اقبال فرمایا :

از نیستاں ہمچو نَے پیغام دہ
قیس را از قومِ حے پیغام دہ

نالہ را انداز نو ایجاد کن
بزم را از ہا و ہو آباد کن
روح نو می جوید اجسام کہن
کم تر از قم نیست اعجاز سخن
خیز جان نو بدہ ہر زندہ را
از قم خود زندہ تر کن زندہ را
خیز و پا برجادۂ دیگر بنہ
جوش سودائے کہن از سر بنہ[1]

پیر رومی کی اس ہدایت کے بعد علامہ اقبال نے اُن کے متعین کیے ہوئے اصولوں پر شاعری کی نئی شمع روشن کی ، اُنھوں نے نہ صرف مولانا کے افکار کو عہد حاضر کے تقاضوں کے مطابق شاعری کے سانچوں میں ڈھالا ، بلکہ بہت سے اسلامی افکار و خیالات اپنی قوت متخیلہ کے قالب میں ڈھال کر عالم اسلامی کے لیے ایک نیا ارمغان پیش کیا ، جو دنیا کے مسلمانوں کے لیے بصیرت افروز ہے ، اُنھوں نے سب سے پہلے اپنے تمام نظریات کی بنیاد قرآن حکیم کو قرار دیا ۔ فرماتے ہیں :

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

اُنھوں نے اپنے افکار کی بنیاد قرآن حکیم پر رکھی ، اور مولانا کی تعلیمات کو نئے اسلوب ، نئے انداز نگارش کے ساتھ عالم اسلامی کے سامنے پیش کیا علامہ نے بادہ کہن کو نئے شیشوں میں ڈھال کر اہل نظر کو اپنی شاعری میں جذب کر لیا ، اس دانائے راز کے نغمے نہ صرف پاکستان و ہندوستان میں گونجے ، بلکہ مغربی دنیا نے بھی ان کو نہایت ذوق سے پڑھا اور مطالعہ کیا ۔

---

(۱) (اسرار خودی ، ص ۱۰)

ہم سابقہ اوراق میں نظریۂ عقل و عشق کا تذکرہ کر آئے ہیں اور بتا چکے ہیں کہ مولانا عقلِ بے لگام پر عشق کو ترجیح دیتے تھے ، علامہ اقبال بھی اس موضوع میں اپنے مرشد معنوی کے ہم خیال نظر آتے ہیں ، انھوں نے اس نظریے کو عہد حاضر کے تقاضوں سے آراستہ کر کے نئی آب و تاب بخشی ہے ، وہ عشق کے تفوق کو عقل پر بیان کرتے ہوئے اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں :

عقل سفاک است او سفاک تر
پاک تر ، چالاک تر ، بیباک تر

عقل در پیچاکِ اسباب و علل
عشق چوگاں باز میدانِ عمل

عشق صید از زور بازو افگند
عقل مکّار است و دامے می زند

عقل را سرمایہ از بیم و شک است
عشق را عزم و یقیں لاینفک است

آں کند تعمیر تا ویراں کند
ایں کند ویراں کہ آباداں کند

عقل چوں باد است ارزاں در جہاں
عشق کمیاب و بہائے او گراں[1]

وہ عشق کو علم پر بھی فضیلت دیتے ہوئے کہتے ہیں :

علم پر بیم و رجا دارد اساس
عاشقاں را نے امید و نے ہراس

---

(۱) اسرار و رموز، ص ۱۲۵ -

علم ترسان از جلال کائنات
عشق غرق اندر جمال کائنات
علم را بر رفته و حاضر نظر
عشق گوید آن چه می آید نگر

لیکن وہ مطلقاً عقل کے مخالف نہیں ، وہ اس عقل کے مخالف ہیں ، جو عشق سے بغاوت کرتی ہے ، وہ اس دین آمیز عقل کے مداح و معترف ہیں ، جو ایمان و یقین کی طرف راہ دکھاتی ہے ، وہ اس عقل کو سراہتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول ؐ کے عشق سے ہم آہنگ ہو کر عرفان و حق شناسی کی رہنمائی کرتی ہے۔ فرماتے ہیں :

غربیاں را زیرکی ساز حیات
شرقیاں را عشق راز کائنات
زیرکی از عشق گردد حق شناس
کار عشق از زیرکی محکم اساس
عشق چوں با زیرکی ہمبر بود
نقش بند عالم دیگر شود
خیز و نقش عالم دیگر بنہ
عشق را با زیرکی آمیز دہ

وہ عقل و عشق کی ہم آہنگی کی دعا کرتے ہوئے کہتے ہیں :

عقل دادی ہم جنونے دہ مرا
رہ بجذب اندرونے دہ مرا

(۱) جاوید نامہ ، ص ۱۳۹ -

علم تا از عشق برخوردار نیست
جز تماشا خانهٔ افکار نیست

(وہ جس عشق کے طالب ہیں، اس کا تعلق اس عالم آب و گل سے نہیں ، وہ اس حقیقت کو واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں :

عشق را از تیغ و خنجر باک نیست
اصل عشق از آب و باد و خاک نیست

وہ اس عشق کی دعوت دیتے ہیں ، جس کو قرآن حکیم حُب سے تعبیر کرتا ہے ، وہ مؤمن کے قلب میں عشق الٰہی اور محبت رسول کے چراغ کو روشن کرنا چاہتے ہیں ، وہ عشق الٰہی کی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں :

از نگاہِ عشق خارا شق شود
عشقِ حق آخر سراپا حق بود

وہ ہر مسلمان کو قرآن حکیم کے مطابق صبغتہ اللہی رنگ میں رنگے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں ، فرماتے ہیں :

قلب را از صبغتہ اللہ رنگ دہ
عشق را ناموس و نام و ننگ دہ
طبع مسلم از محبت قاہر است
مسلم ار عاشق نباشد کافر است

وہ عشق الٰہی کے ساتھ محبت اور اتباع رسول کو لازمی قرار دیتے ہیں ، وہ عظمت رسول کی نغمہ سرائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰؐ است
آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰؐ است

خاکِ یثرب از دو عالم خوش تر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است)

پیام مشرق میں عشق حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کامرانیوں اور شعلہ توں کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں :

ہر کہ عشقِ مصطفیٰؐ سامانِ اوست
بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست

سوزِ صدیقؓ و علیؓ از حق طلب
ذرۂ عشقِ نبیؐ از حق طلب

ز آنکہ ملّت را حیات از عشقِ اوست
برگ و سازِ کائنات از عشقِ اوست

وہ عظمتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک نئے پہلو کو پیش کرتے ہوئے دعوت غور و فکر دیتے ہیں :

معنیٔ حرفم کنی تحقیق اگر
بنگری با دیدۂ صدیقؓ اگر

قوتِ قلب و جگر گردد نبیؐ
از خدا محبوب تر گردد نبیؐ

علامہ نے مولانا کی طرح انسان کی عظمت اور اس کے عرفان کو نئے انداز اور نئے اسلوب سے پیش کیا ہے ۔ وہ اس نظریے کو نہایت آب و تاب سے مختلف دل آویز طریقوں پر پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

نصیبِ او ہنوز آں ہا و ہو نیست
کہ او در انتظارِ آدمی ہست

وہ اس آدمی کے انتظار میں ہیں ، جو دین آمیز عقل اور پاک باز عشق کے امتزاج سے مزیّن ہو ، جو اس فرشِ خاکی کو ہمدوش ثریا کردے ۔ وہ تمنا کرتے ہیں :

زہن ہنگامہ دہ ایں جہاں را
دگرگوں کن زمین و آسمان را
ز خاکِ ما دگر آدم بر انگیز
بکش ایں بندۂ سود و زیاں را

مردمی اندر جہاں افسانہ شد
آدمی از آدمی بیگانہ شد

کہن گشتند ایں خاکی نہاداں
دگر آدم بنا کن از گِلِ ما

مولانا کے نظریہ لسانی کے ضمن میں ہم اُن کا نظریۂ وطن بیان کر آئے ہیں ، مولانا وطن کی محبت کے منکر نہیں ، لیکن وہ ملّت کی بنیاد وطن پر نہیں رکھتے بلکہ وہ دنیائے اسلام کی قومیت کی بنیاد کلمۂ لاالہ پر رکھتے ہیں ، جو تمام دنیا کے مسلمانوں کو ایک رشتے میں جوڑتا ہے ، علامہ نے بھی اس اخوت اسلامی کے نظریے کو اپنی دل آویز شاعری سے مسلمانوں کے قلوب میں مستحکم کیا ، ہے ۔ انھوں نے اسلام کے رشتے کے علاوہ تمام رشتوں کو خواہ ان کی بنیاد حسب و نسب پر ہو ، یا رنگ و نسل ، قوم و وطن پر ، ان تمام رشتوں کو اسلامی اخوت کے سامنے ہیچ بتایا ہے ۔

علامہ کی نظریۂ وطنیت کے متعلق وہی اساس ہے ، جس کو مرشد رومی نے قرآن حکیم سے اخذ کر کے پیش کیا ہے ، لیکن

انھوں نے اس فکر کو اپنے انداز میں پیش کر کے ایک نیا آب و رنگ عطا کیا ہے، اور انسانوں پر اس حقیقت کو منکشف کیا ہے کہ حُبِّ وطن جس حد تک اسلام اس کی اجازت دیتا ہے صحیح ہے، لیکن ملّت اسلامیہ میں اخوت کا اصل رشتہ صرف اسلام ہے، جو تمام عالمِ اسلامی کو متحد کرتا ہے۔ فرماتے ہیں:

جوہرِ ما با مقامے بستہ نیست
بادۂ تندش بجامے بستہ نیست

ہندی و چینی سفالِ جامِ ماست
رومی و شامی گلِ اندامِ ماست

قلبِ ما از ہند و روم و شام نیست
مرز بوم اُو بجز اسلام نیست

عقدۂ قومیّتِ مسلم کشود
از وطن آقائے ما ہجرت نمود

حکمتش یک ملّتے گیتی نورد
بر اساسِ کلمۂ تعمیر کرد

تا ز بخششہائے آں سلطانِ دین
مسجدِ ما شد ہمہ روئے زمین

صورتِ ماہی بہ بحر آباد شو
یعنی از قیدِ مقام آزاد شو

وہ مغرب کے ان لوگوں کو جنھوں نے وطن پر ملت کی بنیاد رکھی ہے، ان کے اس نظریے کی خرابیوں کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس غلط نظریے کے پرستاروں نے انسانیت کو وطنیت، قبائل، اور نسل و رنگ میں تقسیم کردیا ہے، یہاں تک کہ انسان کو انسان سے بیگانہ بنا دیا ہے، فرماتے ہیں:

آں چناں قطع اخوت کردہ اند
بر وطن تعمیر ملّت کردہ اند
تا وطن را شمع محفل ساختند
نوع انساں را قبائل ساختند
ایں شجر جنّت ز عالم بردہ است
تلخی پیکار بار آوردہ است
مردمی اندر جہاں افسانہ شد
آدمی از آدمی بیگانہ شد
روح از تن رفت و ہفت اندام ماند
آدمیت گم شد و اقوام ماند
تا سیاست مسند مذہب گرفت
ایں شجر در گلشن مغرب گرفت[1]

مولانا روم نے مثنوی میں پیر کی اہمیت ، اس کی محبت اور عقیدت پر بہت زور دیا ہے ، فرماتے ہیں :

سایۂ یزداں بود بندہ خدا
مردۂ ایں عالم و زندہ خدا
دامن او گیر زو تر بے گماں
تا رہی از آفت آخر زماں[2]

پھر فرماتے ہیں :

پیر را بگزیں کہ بے پیر ایں سفر
ہست بس پُر آفت و خوف و خطر

---

(۱) کلیات اقبال فارسی (رموز بیخودی) ص ۱۱۵ - ۱۱۶ -
(۲) مثنوی مولانا روم دفتر اول ، ص ۱۱ -

ہر کہ او بے مرشدے در راہ شد
او ز غولاں گمرہ و در چاہ شد

گر نباشد سایہ پیر، اے فضول
پس ترا سرگشتہ دارد بانگ غول[1]

علامہ اقبال بھی اپنے مرشد رومی کی طرح پیر کی اہمیت اور عقیدت پر بہت زور دیتے ہیں، فرماتے ہیں:

کیمیا پیدا کن از مشتے گلے
بوسہ زن بر آستان کاملے[2]

خود انھوں نے مولانا کو اپنا مرشد معنوی تسلیم کر کے مولانا سے جس محبت و عقیدت کا اظہار کیا ہے اُن کے اشعار اُن کی عقیدت و محبت کے گواہ ہیں۔ تصوف میں خودی کے فلسفے کا اضافہ اگرچہ علامہ کی طرف منسوب ہے اور کہا جاتا ہے کہ ان کا یہ فلسفہ نٹشے سے ماخوذ ہے لیکن در حقیقت اس کا سر چشمہ بھی مولانا کی تعلیمات اور ان کی مثنوی ہے، انھوں نے اس تخیل کو مولانا روم سے اخذ کیا ہے۔ لیکن علامہ نے اس فلسفے کو ایک مستقل حیثیت دی، اور فلسفہ خودی کے تمام بنیادی مضامین قرآن حکیم سے اخذ کر کے اُن کو شاعرانہ آب و تاب کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔

علامہ اقبال نے اِن کے علاوہ تصوف کے متعدد مسائل کو قرآن حکیم اور حدیث نبوی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی روشنی میں اپنے اشعار میں نئے اور دل کش انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ اس تصوف کے قائل ہیں جس کی بنیاد قرآن حکیم اور سنت رسول پر ہے، وہ اُن صوفیائے خام کے مخالف ہیں جنھوں نے دین کے سرچشموں کو اپنی بدعات اور اختراعات سے گدلا کر دیا ہے۔

---

(۱) مثنوی مولانا روم، دفتر اول ص ۵۹۔

(۲) اسرار و رموز، ص ۷۰۔

۱۶

حضرت شیخ حسام الحق ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ

علامہ اقبال علیہ الرحمہ اسلامی فکر و روایات سے بے حد متاثر تھے ، وہ عجمی تہذیب و روایات کو ، اور اس فکر و نظر کو جو شعر و ادب میں ہمیں عجم نے بخشا ہے سخت نا پسند کرتے تھے، انہوں نے جا بجا اپنے کلام میں اس بر صغیر پاک و ہند کے نوجوان شعرا اور ادیبوں کو اس طرف توجہ دلائی ہے کہ زندگی کی صحیح حقیقتوں کو سمجھ کر ایسا تعمیری ادب تخلیق کریں ، جس کا اکتساب انہوں نے آفتاب نبوت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا ہو ، وہ اپنے ادب سے ایسے نور کو پھیلائیں جو بصر کے ساتھ بصیرت کو بڑھائے ، اور قلب و روح کو گرمائے ، وہ اسرار و رموز میں حقیقی شاعر کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں :

سینۂ شاعر تجلی زارِ حسن
خیزد از سینائے او انوارِ حسن

از نگاہش خوب گردد خوب تر
فطرت از افسونِ او محبوب تر

از دمش بلبل نوا آموخت است
غازہ اش رخسارِ گل افروخت است

سوز او اندر دلِ پروانہ ہا
عشق را رنگیں از او افسانہ ہا

بحر و بر پوشیدہ در آب و گلش
صد جہانِ تازہ مستُتر در دلش

فکرِ او با ماہ و انجم ہم نشین
زشت را نا آشنا، خوب آفرین

خضر و در ظلماتِ او آبِ حیات
زندہ تر از آبِ چشمش کائنات[1]

وہ شاعر پر فطرت اور اس کے بلند مقام کو منکشف کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

فطرتِ شاعر سراپا جستجو ست
خالق و پروردگارِ آرزو ست

شاعر اندر سینۂ ملت چو دل
ملتے بے شاعرے انبارِ گل

سوز و مستی نقشبندِ عالمے است
شاعری بے سوز و مستی ماتمے است

شعر را مقصود اگر آدم گری ست
شاعری ہم وارثِ پیغمبری ست[2]

وہ حقیقی شاعر اس کو سمجھتے ہیں کہ جس کا سینہ تجلی زار حسن ہو، اور جس کی شاعری سے انوار حسن کے چشمے پھوٹیں، جو اپنے فکر و تخیل سے خوب کو خوب تر کر کے دکھائے، اور جس کی شاعری انسانوں کو فطرت سے آشنا کرے، جس کے فکر کی بلندیاں چاند اور ستاروں کو چھوتی ہوں، جو برائیوں اور خوبیوں کا رمز شناس ہو، جس کے خمیر میں بحر و بر پوشیدہ ہوں، جس کے قلب میں سینکڑوں نئے آنے والے جہانوں کی کرن

(۱) کلیات اقبال فارسی (اسرار و رموز) ص ۳۵ -
(۲) ،، (جاوید نامہ) ص ۶۳۲ -

پھوٹ رہی ہو، جس کے نغمے انسانوں کی مضمحل اور اداس زندگی کو نئی توانائیاں بخشیں، جس کے آنسو کائنات کے لیے باعثِ حیات ہوں۔ وہ عہد حاضر کے شعرا کی فکری تخیل پر اظہار تاسف کرتے ہوئے کہتے ہیں :

وائے قومے کز اجل گیرد برات
شاعرش وا بوسد از ذوق حیات
خوش نماید زشت را آئینہ اش
در جگر صد نشتر از نوشینہ اش
بوسہ او تازگی از گل برد
ذوق پرواز از دل بلبل برد
سست اعصاب تو از افیونِ او
زندگانی قیمت از مضمونِ او
می رباید ذوق رعنائی ز سرو
جرّہ شاہین از دم سردش تدرو
ماہیٔ ہستی ز جانِ تو برد
لعلِ عنابی ز کانِ تو برد
خستہ ما از کلامش خستہ تر
انجمن از دورِ جامش خستہ تر
قلبِ مسموم از سرودِ بلبلش
خفتہ مارے زیر انبار گلش
از خم و مینا و جامش الحذر
از مئے آئینہ فامش الحذر!

وہ ایک اور نظم میں ان شعرا پر اظہار تاسف کرتے ہوئے جو اپنے فکر شعری کو اس عالم بزم آب و گل سے آگے نہیں بڑھاتے

(۱) کلیات اقبال فارسی (اسرار و رموز)، ص ۳۶ - ۳۷ -

اور جن کی شاعری قوم کے لیے افیون سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی، فرماتے ہیں :

اے بسا شاعر کہ از سحر ہنر
رہزنِ قلب است و ابلیس نظر

شاعرِ ہندی! خدایش یار باد
جانِ او بے لذتِ گفتار باد

عشق را خنیہ گری آموختہ
با خسلیلان آزری آموختہ

حرفِ او چاویدہ و بے سوز و درد
مُرد خوانند اہلِ دل او را نہ مرد

زآن نوائے خوش کہ نشناسد مقام
خوش تر آن حرفے کہ گوئی در منام[1]

وہ ان قارئین کو جو ان اشعار سے متاثر ہوتے ہیں، متنبّہ کرتے ہوئے کہتے ہیں :

اے ز پا افتادۂ از صہبائے او
صبحِ تو از مشرق مینائے او

اے دلت از نغمہ ہایش سرد جوش
زہرِ قاتل خوردۂ از راہِ گوش

شیونش از جام تو سرمایہ برد
لطف خواب از دیدۂ ہمسایہ برد

وائے بر عشقے کہ نارِ او فسرد
در حرم زائید و در بت خانہ سرد[2]

(۱) کلیات اقبال فارسی (جاوید نامہ) ص ۶۳۲ -
(۲) ایضاً -(اسرار و رموز) ص ۳۷ - ۳۸ -

رحمت ہستی از عرب بر چیدہ ای
در خمستان عجم خوابیدہ ای

شل ز برفاب عجم اعضائے او
سرد تر از اشک او صہبائے او[1]

آخر میں وہ عہد حاضر کے شعرا کو جو خد و خال، لب و رخسار، گل و بلبل کی شاعری میں پھنسے ہوئے ہیں فکر مستقبل کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ شعر و ادب میں فکر صالح اور تعمیری ادب و شاعری کی طرف متوجہ ہوں ، اور عجمی خیالات و روایات سے رخ پھیر کر ، سلمائے عرب سے دل لگائیں ، اور ان روایات و خیالات کو اپنا موضوع سخن بنائیں جن کا نور فاران کی چوٹیوں سے پھیلا ہے۔

فکر روشن بیں عمل را رہبر است
چوں درخش برق پیش از تندر است

فکر صالح در ادب می بایدت
رجعتے سوئے عرب می بایدت

دل بہ سلمائے عرب باید سپرد
تا دمد صبح حجاز از شام کرد

از چمن زار عجم گل چیدہ
نو بہار ہند و ایراں دیدہ

اند کے از گرمی صحرا بخور
بادۂ دیرینہ از خرما بخور

وہ اپنے اشعار میں مسلم معاشرے کے تنزل و زوال کا سبب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شعار کو چھوڑ دینے کو قرار دیتے ہوئے نہایت دردناک طریقے پر فرماتے ہیں :

---

(۱) کلیات اقبال فارسی (اسرار و رموز) ص ۱٦۷ -
(۲) ایضاً ص ، ۳۸ - ۳۹ -

پست دینِ مصطفیٰ دینِ حیات
شرع او تفسیر آئینِ حیات[1]

تا شعارِ مصطفیٰ از دست رفت
قوم را رمزِ بقا از دست رفت

پھر وہ گزشتہ مسلمانوں کی عظمت کو یاد دلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ کس طرح عجمی افکار و روایات کے قبول کرنے نے اس عظمت کو گھٹا دیا ہے:

آں نہالِ سربلند و استوار
مسلمِ صحرائی اشتر سوار

پائے تا در وادیِ بطحا گرفت
تربیت از گرمیِ صحرا گرفت

آں چناں کاہید از بادِ عجم
ہم چو نے گردید از بادِ عجم[2]

علامہ نے ایک مثنوی ، اسرار و رموز میں بعنوان ''عرض حال بحضور رحمۃ اللعالمین'' لکھی ہے ۔ وہ اس مثنوی میں مسلم معاشرے کے حال زار کو بیان کرتے ہوئے بارگاہِ رسالت مآب میں عرض کرتے ہیں :

مسلم از سرِّ نبی بیگانہ شد
باز ایں بیت الحرم بتخانہ شد

از منات و لات و عزّیٰ و ہبل
ہر یکے دارد بُتے اندر بغل

شیخ ما از برہمن کافر تر است
زانکہ او را سومنات اندر سر است[3]

---

(۱) کلیات اقبال فارسی (اسرار و رموز) ص ۱۲۸ -
(۲) ایضاً ، ص ۱۲۸ - (۳) ایضاً ، ص ۱۶۲ -

رخت ہستی از عرب بر چیدہ
در خمستان عجم خوابیدہ

شل ز برفاب عجم اعضائے او
سرد تر از اشک او صہبائے او

ذوق حق دہ این خطا اندیش را
این کہ نشناسد متاع خویش را[1]

وہ ایک اور قطعے میں بارگاہ رب العزت میں دعا کرتے ہوئے کہتے ہیں :

بچشمش وا نمودم زندگی را
کشودم نکتہ فردا و دی را
توان اسرار جاں را فاش تر گفت
بدہ نطق عرب این اعجمی را

علامہ اقبال چاہتے تھے کہ مسلمان اپنے اخلاق ، مذہب و معاشرت میں اسلام کے پابند رہیں ، اور اپنی فکر و روایات تہذیب و ثقافت میں براہ راست فیضان ، نبوت محمدی ؐ سے حاصل کریں ، انھوں نے کہیں وضاحت کے ساتھ اور کہیں تلمیحات و اشارات میں معاشرے کو عرب کی صحرایت اور بدویت کے سادہ اخلاق اور سادہ زندگی کی طرف دعوت دی ہے ، وہ برملا کہتے ہیں :

دگر بدشت عرب خیمہ زن کہ بزم عجم
مے گزشتہ و جام شکستنی دارد[2]

اُن کا خیال تھا کہ عرب کی سادہ اور صحرائی زندگی ہی اُن کو بلند مقام پر پہنچا سکتی ہے اور عجمی اثرات نے اُن کو تعیش و تکلف کی طرف مائل کر کے ان کے اخلاق و کردار پر نہایت برا

(۱) کلیات اقبال فارسی (اسرار و رموز) ص ۱٦٧ -
(۲) ,, (پیام مشرق) ص ۲۳۳ -

اثر ڈالا ہے ۔ علامہ اقبال کے اس مخلصانہ جذبے کو محدود وطنیت اور قومیت سے تعبیر کرنا کسی طرح صحیح نہیں ۔

وہ اس لیے بھی صحرائی زندگی کی تلقین کرتے ہیں کہ صحرائی زندگی بالکل قدرتی اور فطری ہوتی ہے ، اس میں اخلاق ، مذہب اور معاشرت سب اپنی اصلی صورت میں قائم رہتے ہیں ، لیکن تہذیب و تمدن کی رنگینیاں انسانی ترقی کو روک دیتی ہیں ۔

علامہ نے اپنے اس شعر کے دوسرے مصرعے میں جسے ہم گزشتہ صفحات میں بھی نقل کر آئے ہیں :

دل بہ سلمائے عرب باید سپرد
تا دمد صبح حجاز از شام کُرد[1]

شیخ حسام الحق ضیاء الدین کے اس مقولے "امسیت کُردیاً اصبحت عربیاً" (ترجمہ : میں شام کو کُردی سویا اور صبح کو عربی اٹھا) کی طرف اشارہ کیا ہے ۔

حالات :

حضرت شیخ ضیاء الدین کے حالات افسوس ہے کہ باوجود تلاش و جستجو کے ہمیں صوفیہ کے تذکروں میں نہیں ملے ، البتہ اسرار و رموز کے شارحین و مترجمین نے اس شعر کے ضمن میں حضرت حسام الحق کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ ہم الگ الگ یہاں نقل کرتے ہیں ۔

نکلسن :

نکلسن نے اپنے انگریزی ترجمے اسرار خودی میں اس شعر کے ضمن میں جو کچھ لکھا ہے ، ہم اس کا ترجمہ ذیل میں پیش کرتے ہیں ۔

---

(۱) کلیات اقبال فارسی (اسرار و رموز) ص ۳۹ ۔

(ترجمہ)

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک غیر پڑھا لکھا کُرد کچھ طالب علموں کے پاس گیا ، اس نے ان طالب علموں سے درخواست کی کہ وہ تصوف کے اسرار و رموز کی تعلیم اس کو دیں ، ان طالب علموں نے اس کُرد کی سادگی کو دیکھ کر از راہِ مزاح اس کرد سے کہا کہ تم اپنے گھر کی چھت میں ایک رسی باندھو اور اس کا دوسرا سرا اپنے پاؤں میں باندھ کر لٹک جاؤ ، اور جب تک ممکن ہو اسی حالت میں لٹکے رہو ، اور وہ کلمات جو ہم نے تمھیں بتائے ہیں ، ان کا ورد کرتے رہو ، وہ غریب کرد یہ نہ سمجھ سکا کہ یہ اس کا مذاق اڑایا جا رہا ہے ، وہ جا کر ان کی ہدایات پر عمل پیرا ہوا ، اور تمام رات لٹک کر ان کلمات کا ورد کرتا رہا ، اللہ تعالیٰ نے اس کی اس محنتِ شاقہ کا بدلہ اس کے خلوصِ نیت کے مطابق دیا ، اور اسے وہ روشنی حاصل ہو گئی جسے تصوف کہتے ہیں - چنانچہ یہ شخص ولایت کے مرتبے پر فائز ہو گیا ، اور خدائے تعالیٰ نے اسے یہ صلاحیت عطا فرمائی کہ وہ عالمانہ طریقے پر تصوف کے عمیق مسائل پر گفتگو کر سکے ۔ اس کے بعد وہ بار بار کہتا تھا "امسیت کردیاً اصبحت عربیاً" ۔[1]

نکلسن نے ان کی شخصیت پر اس سے زیادہ کوئی روشنی نہیں ڈالی ۔

مولانا غلام رسول مہر :

اسرار و رموز کے شارح مولانا غلام رسول مہر مرحوم نے اپنی

---

(۱) ترجمہ انگریزی اسرار خودی (نکلسن) ، صفحہ ۹۹ ، فٹ نوٹ نمبر ۲ ایڈیشن ششم - طابع محمد اشرف - لاہور -

"مطالب اسرار و رموز" میں اس مصرعے "تا دمد صبح حجاز از شام کُرد" کے مفاہیم و مطالب کو واضح کرتے ہوئے لکھا کہ :

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک سادہ لوح کُرد بعض عالموں یا عارفوں کے پاس پہنچا ، اور عرض کیا کہ تصوف کے بارے میں رہنمائی فرمائیے ، انھوں نے کُرد کی سادہ لوحی کو دیکھ کر اصل سوال کو مذاق سمجھا ، اور کہا کہ اپنے پاؤں رسے سے باندھ کر الٹا لٹک جانا اور فلاں ورد پڑھتے رہنا ، تصوف کے تمام حقائق روشن ہو جائیں گے ، کُرد نے گھر پہنچتے ہی اس تدبیر پر عمل کیا ۔ خدا نے خلوص کی برکت سے اسے ایک ہی رات میں ولایت کے درجے پر پہنچا دیا ، اس نے اپنی کیفیت سامنے رکھتے ہوئے کہا تھا "امسیت کُردیاً اصبحت عربیاً" (میں شام کو کُرد تھا ، صبح اٹھا تو عرب بن گیا) یعنی جو قلب شام کو دین کے معارف سے خالی تھا وہ صبح کے وقت ان سے لبریز ہو گیا ۔[1]

غالباً مولانا مہر کا ماخذ بھی نکلسن کا ترجمہ ہے ، سوائے اس کے کہ کچھ انداز بیان بدلا ہوا ہے لیکن ان کا بیان بھی شیخ حسام الحق کی شخصیت کے متعلق ہماری معلومات میں کچھ اضافہ نہیں کرتا ۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی :

شرح اسرار خودی کے ایک اور شارح پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب ہیں ، جنھوں نے اسرار خودی کی شرح ۔ "شرح اسرار خودی" کے نام سے لکھی ہے ، انھوں نے اس شعر کی وضاحت کے ضمن میں لکھا کہ : تا دمد صبح حجاز از شام کُرد" اس مصرعے میں

(۱) مطالب اسرار و رموز (مولانا غلام رسول مہر) ناشر : شیخ غلام علی اینڈ سنز ، لاہور ۔ ص ۸۲ - ۸۳

شیخ ضیاء الحق حسام الدین کے اس مقولے کی طرف اشارہ ہے امسیتُ کُردیاً اصبحت عربیاً یعنی گزشتہ شب تک میں کُردی تھا ، لیکن جب صبح ہوئی تو عرب ہوگیا ۔ روایت ہے کہ ایک جاہل کُردی چند طلبہ کے پاس آیا ، اور اُن سے درخواست کی کہ مجھے تصوف کے اسرار سے آگاہ کرو ، انھوں نے مزاحاً اس سے کہا کہ ہم تمھیں کچھ الفاظ تلقین کیے دیتے ہیں ، تم رات کو اُلٹے لٹک کر اُن کا ورد کرو ، تم عارف ہو جاؤ گے ، چنانچہ اس شخص نے ایسا ہی کیا ، اللہ کو اس کا خلوص پسند آگیا ، وہ شخص در حقیقت عارف ہوگیا تو اُس نے کہا کہ شام تک میں کُرد تھا ، لیکن اللہ نے مجھے اپنی مہربانی سے دوسرے دن عرب بنا دیا ۔

شیخ ضیاء الحق حسام الدین ، مولانا روم کے خاص الخاص دوستوں اور مریدوں میں سے ہیں ۔ مولانا نے اپنی شہرۂ آفاق مثنوی ان ہی کی فرمائش پر لکھی تھی ، چنانچہ ہر دفتر کے آغاز میں اُن کا تذکرہ کیا ہے ، مثلاً دفتر چہارم کے آغاز میں لکھتے ہیں :

اے ضیاء الحق حسام الدین توئی
کہ گزشت از مہ بنورت مثنوی

گردنِ ایں مثنوی را بستہ ای
میکشی آں سو کہ تو دانستہ ای"[۱]

پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب نے ہمارے علم میں اس قدر اضافہ کیا کہ ان بزرگ کا نام متعین کردیا ۔ اور یہ بھی واضح کر دیا کہ یہ وہ حسام الدین چلپی ہیں ، جو مولانا روم کے مرید و خلیفہ تھے ، اور جن کی فرمائش پر مولانا نے مثنوی لکھی تھی ۔ لیکن انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ اس کے تعین میں اُن

---

(۱) شرح اسرار خودی (پروفیسر یوسف سلیم چشتی) مطبوعہ عشرت پبلیشنگ ہاؤس ۔ لاہور ۔ ص ۳۷۴ تا ۳۷۵ ۔

کا ماخذ کیا ہے ، اور انھوں نے کس بنا پر ان کی شخصیت کو متعین کیا ہے پھر کلیات اقبال فارسی (غلام علی ایڈیشن) کے حواشی میں ان کا نام شیخ حسام الحق ضیاء الدین لکھا ہوا ہے اور مولانا روم کے مرید و خلیفہ کا نام شیخ ضیاء الحق حسام الدین ہے ، اس بنا پر ہمیں نکلسن کا بیان زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی ایسے بزرگ تھے جن کی غیر معمولی شہرت نہیں ہوئی ، اگر یہ وہی حسام الحق ہوتے جو مولانا روم کے مرید تھے تو نکلسن ان کا حوالہ ضرور دیتا لیکن بہر حال اگر یہ وہی بزرگ ہیں ، جو مولانا روم کے مرید و خلیفہ تھے تو اختصار کے ساتھ ہم ان کے حالات لکھتے ہیں :

مولانا حسام الدین چلپی :

مولانا حسام الدین چلپیؒ ان اخی اصلاً ترک اور وطناً ارموی تھے ، اور روم کے مشہور خاندان اخی سے تعلق رکھتے تھے ، جب وہ مولانا روم کی خدمت میں آئے تو انھوں نے اپنا کل سملوکہ مولانا کی خدمت میں صرف کر دیا ، مولانا کا بے حد ادب کرتے تھے - پاس ادب اس قدر تھا کہ مولانا کے وضو خانے میں کبھی وضو نہ کرتے ، سخت سردی میں بھی جب برف پڑتی ہوتی گھر جا کر وضو کر کے آتے تھے ، مولانا بھی ان پر بے حد شفقت فرماتے تھے ، رفتہ رفتہ ان کو مولانا کی خدمت میں یہ قرب حاصل ہوا کہ جو کچھ فتوح مولانا کو حاصل ہوتیں ، سب آپ کے پاس بھیج دیتے ، اور وہ یہ سب مریدوں پر خرچ کردیتے ، حضرت شمس الدین تبریزی اور شیخ صلاح الدین سے بھی حضرت حسام الدین کو ارادت تھی ، اور ان بزرگوں کے فیض سے بھی متمتع ہوئے تھے ، حضرت چلپی حسام الدین مذہباً شافعی تھے ، ایک روز مولانا سے انھوں نے کہا کہ میں امام ابو حنیفہؒ کی اقتدا کرنا چاہتا ہوں کیوں کہ آپ بھی حنفی ہیں ، فرمایا نہیں تم شافعی مذہب پر رہو لیکن میرے طریقے پر چلو ، اور لوگوں کو میرے جادۂ عشق پر چلاؤ -

شیخ صلاح الدین کی وفات کے بعد مولانا روم نے شیخ حسام الدین چلپی کو اپنا خلیفہ بنایا ، مولانا چلپی نے دس برس تک مولانا کی زندگی میں خلافت کے فرائض انجام دیے۔ مولانا نے ۶۷۲ھ (۱۲۷۳-۷۴ء) میں وفات پائی ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے ان کو اپنا مستقل خلیفہ ۶۶۳ھ (۱۲۶۴-۶۵ء) میں بنایا۔

خلافت کے وقت مولانا روم نے اپنے تمام مریدوں کو حکم دیا کہ وہ تمام و کمال ان کی اطاعت کریں۔[1]

مثنوی :

علامہ شبلی نے سوانح مولانا روم میں لکھا ہے کہ حسام الدین چلپی کی فرمائش پر مولانا نے مثنوی لکھی تھی ، اور دفتر اول کے سوا ہر دفتر کو آن کے نام سے مزین کیا ہے : دفتر دوم میں فرماتے ہیں :

مدتے ایں مثنوی تاخیر شد
مہلتے بایست تا خوں شیر شد

چوں ضیاءالحق حسام الدین عناں
باز گر دانید ز اوجِ آسماں

چوں بمعراجِ حقائق رفتہ بود
بے بہارش غنچہا نشگفتہ بود

تیسرے دفتر میں فرماتے ہیں :

اے ضیاء الحق حسام الدین بیار
ایں سوم دفتر کہ سنت سہ بار

چوتھے دفتر میں مولانا نے نہایت خلوص و محبت سے آن کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا :

---

(۱) یہ تمام تفصیل صاحب المثنوی ، ص ۲۳۴ تا ۲۴۰ مطبوعہ اعظم گڑھ سے ماخوذ ہے۔

اے ضیاء الحق حسام الدین توئی
کہ گزشت از مہ بنورت مثنوی

زان ضیا گفتم حسام الدین ترا
کہ تو خورشیدی و ایں دو وصفہا

ہم چناں مقصود من زیں مثنوی
اے ضیاالحق حسام الدین توئی

قصدم از الفاظ ایں راز تو است
قصدم از انشاش آواز تو است

پیش من آوازت آواز خد است
عاشق از معشوق حاشا کے جد است

پانچویں دفتر میں لکھا کہ:

شہ حسام الدین کہ نور انجم است
طالب آغاز سفر پنجم است

چھٹے دفتر میں تحریر فرمایا:

اے جہان دل حسام الدین بسے
میل می جوشد بہ قسم سادسے

پیشکش می آرمت اے معنوی
قسم سادس در تمام مثنوی[1]

حضرت حسام الدین چلپی نے ۲۲ شعبان بروز چہار شنبہ ۶۸۳ھ یا ۶۸۴ھ میں وفات پائی۔[2]

---

(۱) سوانح مولانا روم (شبلی نعمانی) مطبوعہ مجلس ترقی ادب، ص ۸۰ تا ۸۴۔

(۲) صاحب المثنوی، ص ۲۶۸ - ۲۶۹۔

۱۷

حضرت شیخ فخرالدین عراقیؒ

علامہ کا عراقی کی بارگاہ میں خراج عقیدت :

حضرت جامی اور عراقی دونوں شاعرانہ عظمت کے ساتھ تصوف میں بلند مقام رکھتے ہیں، دونوں بحر معرفت کے شناور ہیں، دونوں کے کلام میں تصوف و عرفان کی چاشنی بدرجۂ اتم موجود ہے، علامہ اقبال نے ارمغان حجاز کے ایک قطعے میں دونوں کا ذکر یک جا نہایت عقیدت سے کیا ہے۔ فرماتے ہیں :

گہے شعر عراقی را بخوانم
گہے جامی زند آتش بجانم
ندانم گرچہ آہنگ عرب را
شریک نغمہائے ساربانم[1]

حالات :

حضرت عراقی کا پورا نام شیخ فخرالدین ابراہیم اور تخلص عراقی ہے۔ تاریخ گزیدہ میں ان کے والد کا نام بزر چمہر اور مراۃ الخیال، سیرالعارفین ، مخزن الغرائب میں ان کا نام شہریار مندرج ہے۔

(۱) ارمغان حجاز۔

سیرالعارفین کے مؤلف شیخ جمالی نے ان کو حضرت شیخ بہاء الدین زکریا کا بھانجا لکھا ہے، لیکن بعض تذکرہ نگار ان کو شیخ شہاب الدین عمر سہروردی[1] کا بھانجا لکھتے ہیں - یہ ہمدان کے ایک قصبے کمجان یا (کونجان ـ کمیجان) میں پیدا ہوئے -

ہمدان کے مدرسے میں علوم ظاہری کی تکمیل کی ، روحانی تعلیم کے لیے ہمدان سے بغداد آئے، اور حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی[1] سے عبادت و ریاضت کی منزلیں طے کیں، شیخ شہاب الدین سہروردی ہی نے ان کا تخلص عراقی قرار دیا ، اور حکم دیا کہ وہ ہندوستان جائیں -

بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ علوم ظاہری سے فارغ ہونے کے بعد وہ ہمدان کے مدرسے میں مدرس مقرر ہوئے ، ایک روز وہ درس دے رہے تھے کہ قلندروں کی ایک جماعت آئی ، اور ان کے سامنے یہ غزل پڑھنے لگی -

ما رخت ز مسجد بخرابات کشیدیم
خط بر ورق زہد و کرامات کشیدیم

در کوئے مغاں در صف عشا نشستیم
جام از کف رندان خرابات کشیدیم

از زہد و مقامات گزشتیم کہ بسیار
کاس تعنبٔ از زہد مقامات کشیدیم[2]

---

(۱) شیخ شہاب الدین سہروردی ، ولادت : رجب ۵۳۹ھ - وفات : یکم محرم ۶۳۲ھ (میخانہ عبدالنبی، حاشیہ نمبر ۱) -

(۲) میخانہ عبدالنبی ، ص ۳۰ -

ان اشعار کو سن کر حضرت عراقی پر ایک وجد کی کیفیت طاری ہو گئی ، پھر قلندروں کے ساتھ ہمدان سے روانہ ہو گئے ، آن کے ساتھ بر صغیر پاک و ہند میں آئے ، جب قلندر ملتان پہنچے تو یہ بھی ان کے ساتھ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کی خانقاہ میں ٹھہرے ۔ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی نے آن کو دیکھا تو عماد الدین سے فرمایا :

در این جوان استعداد تمام یافتم ، او را این جا می باید بودن ۔[1]

(میں اس جوان میں غیر معمولی صلاحیت پاتا ہوں ، اسے یہیں رہنا چاہیے) ۔

حضرت عراقی نے بھی حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانی کی ذات میں ایک جذب و کشش محسوس کی اور قلندروں سے کہا :

بر مثال مقناطیس کہ آہن را کشد ، شیخ مرا جذب می کند ، ازیں جا زود تر می باید رفت[2] ۔

(شیخ مجھ کو مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچتے ہیں ، اس جگہ سے جلد روانہ ہونا چاہیے) ۔

چنانچہ اس کے بعد حضرت عراقی ملتان سے دہلی آئے ۔ دہلی سے سومنات جا رہے تھے کہ راستے میں سخت اندھیاؤ آیا اس طوفان باد میں آپ قلندروں سے جدا ہو گئے ، اپنے ساتھیوں سے جدا ہو کر پریشانی کے عالم میں دوبارہ ملتان پہنچے ۔ حضرت شیخ بہاء الدین

---

(۱) میخانہ عبدالنبی ، ص ۳۱

(۲) ایضاً ، ص ۳۱

زکریا ملتانی نے آپ کو دیکھا تو فرمایا : عراقی! از ما بگریختی ، عراقی ! تم ہم سے بھاگ رہے ہو ، حضرت عراقی نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھے :

از تو نگریزد دل من یک زماں
کالبد را کے بود از جاں گریز
دایہ لطفت مرا در بر گرفت
داد پیش از مادرم صد گونہ شیر

ریاضتیں :

حضرت شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی نے ان کو خلوت میں بٹھایا ، جب چلے کے دس روز گزرے تو ان پر ایک عجیب وجد کی کیفیت طاری ہوئی ، اسی عالم کیف و مستی میں ایک غزل کہی ، جسے وہ رو رو کر پڑھتے تھے :

نختیں بادہ اندر جام کردند
ز چشم مست ساقی وام کردند
چو بے خود ساختند اہل طرب را
شراب بے خودی در جام کردند
برائے صید مرغ جان عاشق
ز زلف فتنہ جویاں دام کردند
بہ عالم ہر کجا رنج و بلا بود
بہم بردند عشقش نام کردند (۱)

---

(۱) میخانہ عبدالنبی ، ص ۳۲

چو خود کردند راز خویشتن فاش
"عراقی" را چرا بدنام کردند!

حضرت کے مریدوں نے آن کی یہ کیفیت دیکھی کہ وہ جھوم جھوم کر یہ غزل گا رہے ہیں تو یہ بات آداب خانقاہ کے خلاف تھی ، انھوں نے اس کی اطلاع حضرت شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی کو دی ۔ آپ نے فرمایا :

شما ازیں چیزہا منع است ، او را منع نیست

(تم کو یہ چیزیں منع ہیں ، ان کو منع نہیں -)

سرمستی کی یہ کیفیت بہت دن تک حضرت عراقی پر طاری رہی ، شیخ عماد الدین ایک دن شراب خانے کی طرف سے گزر رہے تھے دیکھا کہ شراب خانے میں کچھ رند چنگ و چغانہ پر یہ غزل گا رہے ہیں ، انھوں نے یہ واقعہ آکر اپنے مرشد کو سنایا ، یہ سن کر حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانی نے فرمایا : کار او تمام شد (ان کا کام پورا ہوگیا) - پھر حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی حضرت عراقی کے پاس خلوت میں گئے ، اور فرمایا : عراقی! مناجات در خرابات میکنی بیروں آئی - (عراقی اب تم مناجات خرابات میں کرتے ہو باہر آؤ) - حضرت عراقی حضرت شیخ کے ارشاد پر خلوت سے باہر آئے ، اور اپنا سر آپ کے قدموں پر رکھ کر زار زار رونے لگے ، آپ نے ان کو اٹھا کر سینے سے لگایا ، اور اپنے جسم سے خرقہ اتار کر ان کو پہنایا ، حضرت عراقی نے اسی وقت ایک غزل کہی ، جس کا مطلع یہ ہے :

---

(۱) میخانہ عبدالنبی ، ص ۴۳ - یہ تمام تفصیل نفحات الانس : ص ۵۴۲ - ۵۴۳ ، مطبوعہ نولکشور سے ماخوذ ہے -

در کوئے خرابات کسے را کہ نیاز است
ہشیاری و مستیش ہمہ عین نماز است[1]

پھر حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی نے اپنی صاحبزادی کی شادی حضرت عراقی سے کردی - پچیس سال تک عراقی اپنے مرشد اور خسر کی خدمت میں رہے ، یہیں آن کے صاحبزادے شیخ کبیر الدین پیدا ہوئے -[2]

خلافت :

حضرت شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی نے اپنی وفات کے وقت حضرت عراقی کو اپنا خلیفہ اور جانشین مقرر کیا - چونکہ حضرت عراقی کو شاعری سے غیر معمولی شغف تھا ، اور اس حلقے کے مرید شاعری کو اپنے مسلک کے خلاف سمجھتے تھے ، حضرت عراقی نے آن کی مخالفت کو محسوس کرلیا ، اور عدن کی طرف چلے گئے - اور وہاں سے خانۂ کعبہ کی حج و زیارت کا عزم فرمایا ، عراقی جب مکۂ معظمہ پہنچے تو ایک طویل قصیدہ کہا ، جس کا مطلع یہ ہے :

اے جلالت فرشِ عزت جاودان انداختہ
گوئے درمیدانِ وحدت کامران انداختہ

جب مدینۂ منورہ پہنچے تو عشق رسول ؐ میں سرشار ہو کر پانچ قصیدے کہے ، میخانۂ عبدالنبی میں پانچوں قصیدے تفصیل سے موجود ہیں -[3]

---

(۱) بزم ، صوفیہ ، ص ۱۵۷ -

(۲) ایضاً ، ص ۱۵۷ -

(۳) میخانہ عبدالنبی ، ص ۳۶ - ۳۷ -

مدینۂ طیبہ کی زیارت سے مشرف ہونے کے بعد روم تشریف لائے ، اور قونیہ پہنچ کر شیخ صدر الدین قوینی[1] کی خدمت میں رہ کر آن سے روحانی تربیت حاصل کی ، ان کی زبان سے فصوص کے درس کو سنا ، اور فتوحات مکی ان سے پڑھی ، یہیں معین الدین پروانہ امیر روم ان کا مرید ہوا ، اور ان کے لیے خانقاہ تعمیر کرائی ۔[۲]

لمعات :

یہیں آپ نے اپنی مشہور کتاب ''لمعات'' نثر میں تصنیف کی ، شیخ صدر الدین قوینی نے ان کی اس معرکہ آراء تصنیف کو دیکھا تو نہایت پسند فرمایا اور فرمایا کہ اے فخر الدین عراقی ! تم نے مردان حق آگاہ کے مغز سخن کو آشکارا کر دیا ۔ ارباب تصوف کے حلقے میں یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ مولانا جامی نے ''اشعتہ اللمعات'' کے نام سے اور مولانا صائن الدین علی ترکہ اصفہانی نے ''ضوء اللمعات'' کے نام سے اس کی شرحیں لکھیں ، صاحب میرالعارفین نے اس تصنیف پر حضرت عراقی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا کہ :

> ارباب بصیرت پر مخفی نہیں کہ ''لمعات'' ایک قطرہ سحاب فیض کا ہے ، جو دریائے معرفت سے شیخ بہاء الدین زکریا قدس سرہ العزیز کے مرید فخر الدین کی زبان پر ٹپکا ۔[۳]

(۱) بزم صوفیہ بحوالۂ سیر العارفین ، اردو ترجمہ ، ج ۱ : ص ۲۳ ۔

(۲) شیخ صدر الدین محمد ، بن مجد الدین اسحاق ، بن علی ، بن یوسف الملاطی ثم القونوی ، شیخ محی الدین ابن عربی کے مرید و خلیفہ تھے (میخانہ عبدالنبی ، حاشیہ نمبر ۲ ۔

(۳) بزرگان ایران ، ص ۲۱۲ ۔

میخانہ عبدالنبی کے مؤلف نے اس کو فصوص کا مغز بتایا ہے۔

نفحات الانس میں ہے کہ امیر معین الدین پروانہ نے آن کے لیے توقات میں خانقاہ تعمیر کرائی، جس میں وہ رہتے تھے، لیکن جب امیر معین الدین سیاست کا شکار ہوا، اور یہ سیاست حضرت عراقی پر بھی اثر انداز ہوئی تو وہ یثرب ہوتے ہوئے مصر پہنچے، وہاں جذب و سر مستی نے آن کو ٹھہرنے نہ دیا، اور وہ دمشق آئے۔ دمشق میں چھ ماہ کے بعد آن کے صاحبزادے شیخ کبیرالدین بر صغیر پاک و ہند سے آن کے ملنے کے لیے آئے اگرچہ وہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے یہاں تھے، لیکن ہر روز اپنے والد کے متعلق پوچھتے تھے، لوگ ان کو جانے سے روکتے تھے، یہاں تک کہ بعض لوگوں نے ایک رات خواب میں دیکھا حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی فرماتے ہیں، انھیں جانے دو، ان کا یہاں کا رزق ختم ہوچکا ہے، چنانچہ لوگوں نے انھیں رخصت کردیا صاحبزادے کے آنے کے کچھ دن بعد آپ بیمار ہوئے، یہی بیماری آپ کا مرض الموت ثابت ہوئی، وفات کے دن صاحبزادے اور اپنے مریدین کو بلایا، اور وصیتیں کر کے رخصت کیا اور یہ آیت پڑھی یوم یفرّ المرء من اخیہ و امہ و ابیہ و صاحبتہ و بنیہ لکل امرءٍ منہم یومئذٍ شانٌ یغنیہ۔ پھر فی البدیہہ یہ رباعی کہی:

در سابقہ چوں قرار عالم دادند
مانا کہ نہ بر مراد آدم دادند
زاں قاعدہ و قرار کاں روز افتاد
نہ بیش بکس دہند ونی کم دادند

(۱) میخانہ عبدالنبی، ص ۴۸۔

وفات :

پھر کلمۂ شہادت پڑھا ، اور واصل الی اللہ ہوئے[1]

شیخ عراقی نے اٹھاسی سال کی عمر میں ذیقعدہ ۶۸۸ھ (۱۲۸۹ء) میں وفات پائی[2] ان کا مزار مبارک دمشق میں جبل صالحیہ پر حضرت شیخ محی الدین ابن العربی کے مزار مبارک کے عقب میں واقع ہے۔

میخانہ عبدالنبی میں ہے کہ بیماری کے چھٹے دن ۸ ذیقعدہ ۶۸۰ھ کو اسّی سال کی عمر میں وفات پائی[3] ان کے صاحبزادے نے بھی وہیں وفات پائی ، اور اپنے والد کے پہلو میں مدفون ہوئے[4]

حضرت عراقی کی شاعرانہ عظمت ہر دور میں مسلم رہی ہے ، انہوں نے فارسی شاعری میں تصوف کی روایات کو نکھارا اور سنوارا، اور تصوف کے مضامین کو اپنے اشعار میں اس دلکشی سے سمویا ہے کہ آج بھی اہل نظر ان کے کلام کو حرز جان بنائے ہوئے ہیں ، عراقی کی تصانیف میں لمعات کے علاوہ ایک مثنوی اور ایک دیوان ہے۔ ان کے کل اشعار کی تعداد پانچ ہزار آٹھ سو بہتّر ہے ہم ان کے دیوان میں سے چند اشعار اور کچھ رباعیاں تبرکاً یہاں نقل کرتے ہیں :

گہے از درد بے درماں بنالم
گہے از زخم بے مرہم بگریم
نشد جاں محرم اسرار جاناں
بر آں محروم نا محرم بگریم

---

(۱) میخانہ عبدالنبی ، ص ۴۸ -
(۲) قصر عارفاں ، ص ۴۷ -
(۳) میخانہ عبدالنبی ، ص ۴۸ -
(۴) بزرگان ایران ، ص ۳۱۲ -

چه کرده ام که دلم از فراق خون کردی
چه افتاد که دردِ دلم فزون کردی
سیاه روئے دو عالم شدم که در خمِ فقر
گلیم بخت عراقی سیاه گون کردی

در میکده می کشم سبوئے
باشد که بیابم از تو بوئے

بزمین چو سجده کردم ز زمین ندا برآمد
که مرا خراب کردی تو به سجدهٔ ریائی
چو براهِ کعبه رفتم به حرم رہم ندادند
که برونِ در چه کردی که درونِ خانه آئی

۱۸

شیخ محمود شبستریؒ

(مصنف گلشن راز)

حضرت شیخ محمود شبستری کی تصنیف ''گلشن راز'' نے مشرق و مغرب کے اہل نظر اور دانشوروں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے، اور ارباب علم نے نہ صرف اس کے متن کو شائع کیا ہے، بلکہ نہایت کاوش و تحقیق سے اس کی شرحیں لکھیں ہیں، پروفیسر براؤن نے ''تاریخ ادبیات عجم'' میں ''گلشن راز'' کو تصوف کے مقالوں میں بہترین مقالہ لکھا ہے، علامہ شبلی نے بھی ان کی کتاب گلشن راز کو بے حد سراہا ہے۔ مولانا جامی نے لکھا ہے کہ کم و بیش اٹھائیس شرحیں گلشن راز کی میری نظر سے گزری ہیں، سب سے مشہور شرح محمد یحییٰ بن علی لاہجی کی ہے۔

یورپ کے مستشرقین نے بھی اس کتاب میں بڑی دلچسپی لی ہے، سب سے پہلے اس کتاب کو یورپ سے جس نے متعارف کرایا، وہ ٹولک ہے، یورپ کی متعدد زبانوں میں اس کے متعدد ترجمے ہوئے ہیں، ان میں هامر پرگس ٹال کا جرمنی ترجمہ اور وین فیلڈ کا انگریزی ترجمہ مشہور ہے۔

علامہ اقبال بھی حضرت شیخ محمود شبستری سے بے حد متاثر ہیں، ان کی عقیدت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے ''گلشن راز''

سے متاثر ہو کر ''گلشن راز جدید'' اسی طرز پر لکھی۔ ڈاکٹر اکبر حسین قریشی کا خیال ہے کہ جاوید نامہ میں جو اشعار ہمیں ملتے ہیں وہ انھیں کے متعلق کہے گئے ہیں۔

پیر مردے ریش او مانند برف
سالہا در علم و حکمت کردہ صرف

تیز بیں مانند دانایانِ غرب
کسوتش چوں پیر ترسایانِ غرب

دیر سال و قامتش بالا چو سرو
طلعتش تا بندہ چوں ترکانِ مرو

آشنائے رسم و راہِ ہر طریق
آشکار از چشم او فکرِ عمیق

آدمی را دید و چون گل بر شگفت
در زبان طوسی و خیام گفت[1]

نطق و ادراکش رواں چو آبجو
محوِ حیرت بودم از گفتار او

حالات:[2]

صاحب گلشن راز کا نام شیخ محمود، ان کے والد کا نام عبدالکریم بن یحیٰی اور لقب سعد الدین نجم الدین تھا، وہ تبریز

---

(۱) کلیاتِ اقبال فارسی (جاوید نامہ)، ص ۱۰۳، د۔

(۲) شیخ محمود شبستری کے یہ تمام حالات مضمون ڈاکٹر اکبر حسین قریشی بعنوان اقبال اور فارسی شعراء مطبوعہ رسالہ برہان، شمارہ ۱، جلد ۵۰، جنوری سنہ ۱۹۶۳ سے ماخوذ ہیں۔

سے آٹھ فرسنگ کے فاصلے پر شبستر نامی ایک گاؤں میں پیدا ہوئے، اور اسی اعتبار سے شبستری کہلائے، ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی، جوانی میں تبریز آئے، اور اس دور کے مشہور بزرگ شیخ امین الدولہ سے علوم ظاہری کی تحصیل کی، پھر آن ہی کے دست حق پرست پر بیعت ہو کر سلوک و معرفت کی تکمیل کی۔

آغا باقر سلمانی کا بیان ہے کہ شیخ محمود شبستری کی ولادت ہلاکو خان کے عہد میں ہوئی، آن کا سال ولادت ۱۲۵۰ء بتایا جاتا ہے، وہ آل چنگیز کے آخری فرمانروا سلطان ابو سعید کے زمانے میں زندہ تھے۔

شیخ محمود شبستری نے ۷۲۰ھ (۱۳۲۰ء) میں وفات پائی۔

تصانیف :

شیخ محمود شبستری کی جن تصانیف کا پتا اب تک چل سکا، آن کے نام یہ ہیں۔

(۱) گلشن راز (۲) حق الیقین فی معرفتہ رب العالمین
(۳) سعادت نامہ (۴) رسالہ شاہد۔

گلشن راز کی تصنیف کا واقعہ :

کہا جاتا ہے کہ رکن الدین حسین بن ابی الحسن الحسینی غوری ہراتی، ملقب بہ فخر السادات و مشہور بہ سید حسینی نے اپنے ایک قاصد کے ذریعے پندرہ سوال منظوم آپ کی خدمت میں بھجوائے تھے، شیخ نے اسی وقت ان کے مختصر جوابات نظم کر کے

فوراً بھجوادیے، بعد میں آن جوابات میں اضافہ کر کے ''گلشن راز'' کی تکمیل کی۔

پروفیسر براؤن نے گلشن راز کا سنہ تصنیف ۷۱۰ھ (۱۳۱۱ء) لکھا ہے لیکن ہندوستان، ایران اور یورپ کے مطبوعہ نسخوں، اور بمبئی کے قلمی نسخے میں یہ مصرعہ صاف لکھا ہوا ہے۔

ع ''گزشتہ ہفت و دہ از ہفت صد سال''

۱۹

حضرت شیخ بوعلی قلندر پانی پتی

علامہ اقبال کا خراجِ عقیدت :

با تو مگویم حدیثِ بوعلی
در سوادِ ہند نامِ او جلی
آن نوا پیرای گلزار کہن
گفت با ما از گلِ رعنا سخن
خطہ این جنت آتش نژاد
از ہوای دامنش مینو سواد[1]

مندرجہ بالا اشعار علامہ اقبال نے حضرت بوعلی قلندر پانی پتی کے ایک واقعہ سے متاثر ہو کر کہے ہیں ، اس واقعے کی تفصیل ہم آئندہ اوراق میں پیش کریں گے -

حالات :

(حضرت شیخ کا اسم گرامی شرف الدین ، لقب بو علی قلندر تھا ، آپ امام اعظم[2] امام ابو حنیفہ کی اولاد سے تھے -)

---

(۱) اسرار و رموز ، ص ۲۷-

(۲) امام اعظم : کا اسم گرامی نعمان بن ثابت ، کنیت ابو حنیفہ ، لقب امام اعظم ہے ، آپ ۸۰ھ (۶۹۹-۷۰۰ء) میں پیدا ہوئے ، (باقی حاشیہ بر صفحہ ۲۲۲)

سیرالاقطاب میں حضرت بو علی قلندر کا سلسلۂ نسب اس طرح مذکور ہے :

شیخ شرف الدین بو علی قلندر ، بن سالار فخرالدین ، بن سالار حسن ، بن سالار عزیز بن ابوبکر غازی ، بن فارس ، بن عبدالرحمٰن بن عبدالرحیم بن محمد بن دانک ، بن امام اعظم ابو حنیفہ کوفی ۔

حضرت بو علی قلندر کے والد محترم ۶۰۰ھ (۱۲۰۳-۴ء) میں عراق سے ہندوستان تشریف لائے ، جو علم و فضل کے بلند مرتبے پر فائز تھے ۔ انھوں نے یہاں تشریف لانے کے بعد پہلی شادی حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کی صاحبزادی سے کی ، لیکن ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی ، پھر دوسری شادی مولانا سید نعمت اللہ ہمدانی کرمانی کی ہمشیرہ بی بی حافظہ جمال سے کی ، ان ہی کے بطن سے حضرت بو علی قلندر کی ولادت با سعادت ۶۰۵ھ (۱۲۰۸-۹ء) میں پانی پت ضلع کرنال (ہندوستان) ہوئی ۔[1]

(خود اپنی تصنیفات میں شیخ بو علی قلندر نے لکھا کہ میرا اصل وطن ولایت عراق ہے ، اور شمس تبریز اور مولانا روم کے ساتھ میری صحبت رہی ہے ۔[2])

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲۱)

آپ فقہ حنفی کے مؤسس و بانی ہیں ، حضرت امام ابو حنیفہ نے بغداد میں رجب ۱۵۰ھ (۷۶۷ء) میں وفات پائی ، اور اپنی وصیت کے مطابق خیزران کے مقبرے میں مشرقی جانب مدفون ہوئے (سیرۃ النعمان، ص ۱۹ ، ۶۵-۶۶) ۔

(۱) بزم صوفیہ ، ص ۲۲۵ ۔

(۲) اخبارالاخیار، ص ۱۲۱ ۔

تعلیم :

حضرت بو علی قلندر نے کم عمری ہی میں علوم ظاہری کی تکمیل کی ۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ بیس برس تک دہلی میں قطب مینار کے قریب درس و تدریس میں مشغول رہے ، اس دور کے جلیل القدر علماء مثلاً مولانا قطب الدین، مولانا وجیہہ الدین پاٹلی، قاضی ظہور الدین بجواری، قاضی حمید الدین صدر شریعت ۔ مولانا فخر الدین پاٹلی وغیرہ ان کے غیر معمولی علم و فضل کے معترف تھے ۔

بیعت :

اس امر میں اختلاف ہے کہ حضرت بو علی قلندر نے کس سے بیعت کی تھی ۔ صاحب اخبار الاخیار، مولانا عبدالحق محدث دھلوی نے لکھا کہ : بعض کہتے ہیں کہ وہ شیخ نظام الدین محبوب الٰہی کے مرید تھے اور بعضوں کا خیال ہے کہ انھوں نے خواجہ بختیار کاکی سے بیعت کی تھی ، لیکن ان دونوں روایتوں میں سے کوئی بھی روایت صحت کے درجے کو نہیں پہنچتی ۔[1]

جذب و سکر :

مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ جب انھوں نے تزکیۂ باطن کے لیے تصوف کی وادی میں قدم رکھا ، اور مجاہدوں اور ریاضتوں میں مشغول ہوئے تو ان پر جذب و سکر کی کیفیت طاری ہو گئی ۔ اسی عالم جذب و سرمستی میں انھوں نے اپنی تمام کتابوں کو دریا میں غرق کر دیا ، اور پانی پت کو چھوڑ کر کرنال کے

---

(۱) مفتاح التواریخ ۔ باب ہشتم ، ص ۱۲۰–۱۲۱ ۔

قرب و جوار کے ایک گاؤں بلدھا کھیڑہ میں مقیم ہو گئے، جہاں وہ آخر وقت تک سکونت پزیر رہے۔[1]

اخبار الاخیار میں ہے کہ ایک دفعہ اسی عالم جذب و سرمستی میں، آپ کی مونچھیں حدود شرعی سے بڑھ گئیں، کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ ان کو کاٹ دے، آخر مولانا ضیاء الدین سنامی[2] نے جو شریعت کے بہت پابند تھے، آپ کی داڑھی کو پکڑ کر مونچھوں کو شریعت کی حدود میں کاٹ دیا، کہتے ہیں اس کے بعد سے شیخ بو علی قلندر ہمیشہ اپنی داڑھی کو چوم کر کہتے تھے

---

(۱) خزینۃ الاصفیاء، جلد ۱ : ص ۳۲۶

(۲) مولانا ضیاء الدین سنامیؒ : کا شمار عہد سلطان علاء الدین کے مشہور واعظوں اور مذکروں میں ہوتا ہے، یہ مفسر بھی تھے اور فقیہ بھی، ان کی ساری عمر عہد علائی میں وعظ کہنے اور تفسیر بیان کرنے میں گزری، صاحب تاریخ فیروز شاہی ضیاء الدین برنی نے ان کو حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی کے آستانے کا مخالف لکھا، واللہ اعلم بالصواب (ترجمہ تاریخ فیروز شاہی (برنی) از ڈاکٹر سید معین الحق، ص ۵۱۷-۵۱۸)۔

اخبار الاخیار میں ہے کہ: مولانا ضیاء الدین سنامی دیانت و تقویٰ میں اپنے وقت کے مقتدا تھے، اور اتباع شریعت میں نہایت راسخ تھے، حضرت شیخ نظام الدین اولیاء کے معاصر اور ہمیشہ حضرت محبوب الٰہی کو سماع پر ٹوکتے رہتے تھے، لیکن ہمیشہ حضرت اس کے جواب میں معذرت اور انقیاد سے کام لیتے تھے، اور مولانا کی نہایت تعظیم کرتے۔ (اخبار الاخیار، ص ۱۰۹)

کہ یہ داڑھی بھی کتنی مبارک داڑھی ہے کہ جو شریعت محمدی کی راہ میں پکڑی گئی ۔[1]

حضرت شمس الدین ترک اور بو علی قلندر کی باھمی محبت :

حضرت بو علی قلندر کے زمانے ہی میں سلسلۂ چشتیہ صابریہ کے مشہور بزرگ حضرت خواجہ شمس الدین ترک پانی پتی اپنے شیخ حضرت خواجہ علاء الدین صابر کے ارشاد کی بنا پر پانی پت میں سکونت پزیر ہوئے ، دونوں بزرگوں میں نہایت اخلاص و محبت تھا ۔ اور دونوں ایک دوسرے سے نہایت محبت سے پیش آتے تھے ۔

کبیر الاولیاء حضرت شیخ جلال الدین محمود پانی پتی ، جو بعد میں حضرت خواجہ شمس الدین ترک پانی پتی کے مرید ہوئے ، وہ حضرت بو علی قلندر ہی کے ارشاد پر آن کے مرید ہوئے تھے ، سیرالاقطاب میں ہے کہ کمسنی میں ایک دفعہ شیخ جلال پانی پتی گھوڑے پر سوار حضرت بو علی قلندر کے سامنے سے گزرے ، ان کو دیکھ کر حضرت بو علی قلندر نے فرمایا :

غ زہے اسپ و زہے سوار

یعنی کتنا اچھا گھوڑا اور کتنا اچھا سوار ہے ، یہ سنتے ہی شیخ جلال الدین پر غیر معمولی کیفیت طاری ہوگئی ، اور گھوڑے سے اُتر کر جنگل کی راہ لی اور کئی سال کی ریاضتوں اور مجاہدوں کے بعد وہ حضرت بو علی قلندر کی خدمت میں حاضر ہوئے ، اور حضرت بو علی قلندر سے بیعت ہونے کے لیے اصرار کیا ، آپ نے فرمایا :

اے فرزند عزیز کشائش تو موقوف بر مرد دیگر است

(۱) اخبار الاخیار ، ص ۱۲۱ ۔

یعنی تیری یہ مشکل ایک دوسرے شخص سے آسان ہوگی ، چنانچہ جب خواجہ شمس الدین ترک[1] پانی پت تشریف لائے تو آپ نے شیخ جلال سے فرمایا کہ وہ آن سے جا کر مرید ہوں ۔ شیخ جلال حضرت بو علی قلندر کے ارشاد پر آن سے بیعت ہوئے ۔

شاہان وقت کی عقیدت :- (جلال الدین خلجی)[2]

اس دور کے عوام و خواص کی محبت و عقیدت کا یہ عالم تھا کہ شاہان وقت حضرت شیخ بو علی قلندر کی عقیدت و محبت کو اپنے لیے سرمایہ نازش و افتخار سمجھتے تھے ، چنانچہ سلطان جلال الدین خلجی آپ سے غیر معمولی عقیدت و محبت رکھتا تھا ،

---

(۱) خواجہ شمس الدین ترک :- حضرت شیخ صابر کلیری کے مرید و خلیفہ تھے ۔ خواجہ احمد یسوی کی اولاد میں تھے ، یہ مرشد کی تلاش میں ترکستان چھوڑ کر ہندوستان آئے ، اور حضرت علاء الدین صابر کلیری کے مرید ہوگئے ، یہ کچھ دن غیاث الدین بلبن کی فوج میں بھی رہے تھے ، حضرت علاء الدین صابر کلیری نے ان کو پانی پت میں قیام کرنے کی ہدایت فرمائی ، چنانچہ یہ اپنے مرشد کے ارشاد کے مطابق آخر عمر تک پانی پت میں مقیم رہ کر ارشاد و تلقین میں مصروف رہے ، خواجہ شمس الدین ترک پانی پتی نے ۷۱۸ء میں وفات فرمائی۔ (گلزار ابرار (غوثی مانڈوی) ص ۵۸۶)۔

(۲) جلال الدین خلجی : سلطان معز الدین کی وفات کے بعد کیلو کھری کے محل میں ۶۸۹ھ (۱۲۹۰ - ۹۱ء) میں تخت نشین ہوا ، اور ۱۷ رمضان ۶۹۵ھ (۱۲۹۶ - ۹۷ء) میں علاء الدین کی سازش سے جو اس کا بھتیجا اور داماد بھی تھا قتل کیا گیا ۔ (تاریخ فیروز شاہی (برنی) اردو ترجمہ (ڈاکٹر معین الحق) ص ۲۷۸ - ۳۳۰ -

اور آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوگیا تھا ۔ اس پر ان ہی بزرگوں کی توجہ اور فیض نظر کا یہ اثر تھا کہ اس کا شمار نہایت ہی حلیم اور خدا ترس بادشاہوں میں ہوتا ہے ۔ برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں اس کی سیرت و کردار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ :

این چنیں بادشاہ حلیم و کریم و این چنیں فرماں روایاں و کارگزاران مہربان و خدا ترس بر بندگانِ خدا نتواند دید ۔

علاء الدین خلجی :

خزینۃ الاصفیا میں ہے کہ سلطان علاء الدین خلجی[۱] بھی آپ سے غیر معمولی عقیدت و محبت رکھتا تھا ، صاحبِ خزینۃ الاصفیا کی اصل عبارت یہ ہے :

جلال الدین و علاء الدین بادشاہان دہلی ہم حلقۂ ارادت آنحضرت بگردن خود داشتند ۔

حضرت بو علی قلندر اور امیر خسرو :

سلطان علاء الدین خلجی کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ اس نے شیخ بو علی قلندر کی خدمت میں نذر بھیجنا چاہی ۔ اس کے امرا و مصاحبین نے مشورہ دیا کہ شیخ نذر قبول نہیں کرتے ۔ اگر یہ نذر خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی کے توسط سے بھجوائی جائے تو امید ہے کہ وہ قبول فرمالیں گے ، چنانچہ سلطان علاء الدین

(۱) سلطان علاء الدین خلجی : تخت نشینی : ۶۹۵ھ (۱۲۹۶ء)
وفات ۶ شوال ۷۱۶ھ (۱۳۱۶ء)
(ترجمہ تاریخ فیروز شاہی (برنی) ۳۴۰ - ۵۳۵ - ۵۵۱) -

نے اس غرض کے لیے حضرت امیر خسرو کو حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی کے پاس بھیجا ، حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی پہلے تو متامل ہوئے ، لیکن بعد میں امیر خسرو کو نذر لے جانے کی اجازت دی ، ساتھ ہی ارشاد فرمایا کہ جو کچھ قلندر عاشق اللہ کہیں ، اُسے خاموشی سے سننا ۔ اور کسی قسم کا اعتراض نہ کرنا ، حضرت امیر خسرو دہلی سے پانی پت پہنچے ، جب وہ حضرت شیخ بو علی قلندر کے دروازے پر پہنچے تو کہلایا کہ حضرت خواجہ نظام الدین کا فرستادہ خسرو آپ کی خدمت میں حاضری کی اجازت چاہتا ہے ، حضرت بو علی قلندر نے ان کو بلا لیا ۔ جب وہ آپ کے سامنے جا کر بیٹھے تو فرمایا کہ کچھ سناؤ ، امیر خسرو نے آپ کے ارشاد پر یہ غزل سنائی :

اے کہ گوئی ہیچ سختی چون فراق یار نیست
گر امیدِ وصل باشد آں چناں دشوار نیست

عاشقاں را در جہاں یکساں نباشد روزگار
ز آنکہ ایں انگشتہا بر دستِ من ہموار نیست

خلق را بیدار باید بود از آبِ چشمِ من
ایں عجب کاں وقت میگریم کہ کس بیدار نیست

یک قدم بر نقشِ خود نہ و آں دگر در کوئے دوست
ہر چہ بینی دوست بیں با ایں و آنت کار نیست

چند میگوئی برو زنّار بندا اے بت پرست !
بر تنِ "خسرو" کدامی رگ کہ آں زنّار نیست

امیر خسرو کی یہ غزل سن کر حضرت بو علی قلندر بہت خوش ہوئے ، اور فرمایا کہ خسرو ! خوش رہو گے ، اور خوش جاؤ گے ، پھر آپ نے خود یہ غزل پڑھی :

دیہیم خسروان بر نعل اشتر است
خسرو کسے کہ حلقۂ تجرید بر سر است

گفتم بعلم و عقل بملکِ دگر شدم
ملکم زعقل و دین چو دیدم فزوں تر است

سیمرغ وار روئے نہفتم بقافِ عشق
کو عارفے کہ منظر او عرش اکبر است

عقل کل است علم لدنّی بعارفان
ایں عقل و علم جسمے ورسمے مختصر است

درس شرف نبود ز الواح ابجدی
لوحِ جمال دوست مرا در برابر است

حضرت امیر خسرو نے جب حضرت بو علی قلندر کی یہ غزل سنی تو بے اختیار ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے ۔ حضرت بو علی قلندر نے انھیں روتا دیکھ کر پوچھا کہ کچھ سمجھے بھی ؟ مفتاح التواریخ میں ہے کہ حضرت بو علی قلندر نے ۔ امیر خسرو سے ہندی میں فرمایا: روہدا نہ کچھ بجھندا ۔ یعنی ایں ہمہ کہ می گری چیزے فہم کنی[1] ۔ حضرت بو علی قلندر کا شمار اردو کے ان محسنین میں ہوتا ہے کہ جنھوں نے اردو کے ابتدائی دور میں اپنی شاعری سے اردو کے دامن کو مرصع و زر نگار بنایا ، ان کا ایک مشہور دوہا ہمیں ملتا ہے ، جسے ہم تبرکاً یہاں نقل کرتے ہیں ۔

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روے
بدہنا ایسی رین کو بھور کدھی نہ ہوے[2]

(۱) مفتاح التواریخ : باب ہشتم، ص ۱۲۰ - ۱۲۱ - مطبوعہ ۱۸۴۹ء

(۲) خسرو شیریں بیاں، ص ۱۳۵ -

حضرت امیر خسرو نے جواب دیا رونا تو اسی بات کا ہے کہ کچھ نہیں سمجھا ، یہ جواب سن کر شیخ بو علی قلندر بہت خوش ہوئے ، اور سلطان علاء الدین کی بھیجی ہوئی نذر قبول کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اگر خواجہ نظام الدین کا واسطہ درمیان میں نہ ہوتا تو میں ہرگز یہ نذر قبول نہ کرتا ، پھر اپنے خادموں سے ارشاد فرمایا کہ امیر خسرو کو نہایت تعظیم و تکریم کے ساتھ خانقاہ میں ٹھہراؤ ، تین دن کے بعد حضرت امیر خسرو نے واپسی کی اجازت طلب کی ۔ امیر خسرو کو رخصت کرتے وقت آپ نے ایک خط حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی کے نام دیا ، اور ایک خط سلطان علاء الدین خلجی کے نام ان کے حوالے کیا ، جس میں لکھا کہ :

علاء الدین فوطہ دارِ دہلی مقرر داند کہ با بندگانِ خدا نیکو کند ۔

(ترجمہ) علاء الدین فوطہ دار دہلی تاکید کے ساتھ جانے کہ اسے بندگانِ خدائے تعالیٰ کے ساتھ نیکی کرنی چاہیے ۔

جب یہ خط سلطان علاء الدین کے پاس پہنچا تو اُس کے امیروں اور مصاحبوں نے بادشاہ سے کہا کہ اس طرح سے آپ کو خط لکھنا نہایت بے ادبی ہے ، سلطان علاء الدین نے اپنے امیروں اور مصاحبوں کو جواب دیا کہ غنیمت ہے کہ اس مرتبہ تو آپ نے فوطہ دار دہلی لکھا ہے ، اس سے قبل ایک مرتبہ تو آپ نے مجھے شحنہ تحریر فرمایا تھا[1] ۔

---

(۱) مرآۃ الکونین ، ص ۳۸ - ۳۳۲ و تذکرۃ اولیائے ہند مؤلفہ میرزا محمد اختر ، ص ۱۲۲ -

سلطان علاء الدین خلجی کے عہد کا وہ واقعہ جس نے علامہ اقبال کو متاثر کیا :

یہ غالباً اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے ، جسے علامہ اقبال نے متاثر ہو کر اسرار و رموز میں نظم کیا ہے ، ایک مرتبہ ملک نائب نے جو ایک خواجہ سرا تھا ، اور سلطان علاء الدین کا نہایت منہ چڑھا تھا اس نے حضرت بو علی قلندر کے ایک درویش کو ایذا پہنچائی ، حضرت بو علی قلندر کو معلوم ہوا تو آپ نے سلطان علاء الدین کو ایک خط ملک نائب کے ظلم کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے لکھا کہ :

> علاء الدین شحنہ را اعلاًم آنکہ خواجہ سرائے . . . یکے از درویشاں را رنجانید ، و عرش الرحمٰن را بلرزہ آورد ، اگر او را بسزا رسانیدی بہتر ، والا بجائے تو شحنہ دیگر بہ دہلی نشاپندہ خواہد شد[1] ۔

(ترجمہ)

> علاء الدین شحنہ دہلی کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس کے ایک خواجہ سرا . . . نے ہمارے ایک درویش کو ایذا پہنچائی ہے ، اور اس طرح رحمان کے عرش کو لرزے میں لایا ہے ، اگر اس جرم کے بدلے میں تو نے اس کو سزا دی تو اچھا ہے ، ورنہ دہلی کا دوسرا شحنہ مقرر کیا جائے گا ۔

---

(۱) مراۃ الکونین ، مطبوعہ نولکشور پریس ، ص ۳۳۷ - ۳۳۸ -

(۲) ملک نائب : یہ ایک خواجہ سرا تھا جو سلطان علاء الدین کے نہایت منہ چڑھا تھا ، سلطان علاء الدین کی وفات کے بعد

(باقی حاشیہ بر صفحہ ۲۳۲)

اسی واقعے کو نظم کرتے ہوئے علامہ اقبال نے لکھا ہے کہ:
جب خودی محبت سے محکم ہوتی ہے، تو اس کی قوت، فرمانده عالم بن جاتی ہے، اس کا پنجہ، حق کا پنجہ ہوتا ہے، اور اس کی انگلی سے چاند شق ہو جاتا ہے، اس تمہید کے بعد علامہ اقبال مثال کے طور پر حضرت بو علی کے اس واقعے کو پیش کرتے ہیں۔ اور اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ خودی عشق و محبت سے مستحکم ہونے کے بعد کس طرح دنیا کے معاملات میں حکم بن جاتی ہے، اور کس طرح بڑے بڑے فرمانروا اس کے تابع ہوتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

با تو می گویم حدیث بو علی
در سواد ہند نام او جلی
آں نوا پیرائے گلزار کہن
گفت با ما از گل رعنا سخن!

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۳۱)
اسی نے اس کے چھوٹے بیٹے ملک شہاب الدین کو جو اس وقت پانچ سال کا تھا تخت پر بٹھایا، اور خود اس کے پردے میں حکمران بن بیٹھا۔ نہایت چھچھورا اور نادان انسان تھا، وزیروں کے رخصت ہونے کے بعد خواجہ سراؤں کے ساتھ کوڑیاں کھیلنے بیٹھ جاتا۔ اس نے خاندان علائی کو بے حد نقصان پہنچایا آخر چند غلاموں نے مشورہ کر کے سلطان علاء الدین کی وفات کے پینتیس روز بعد قصر ہزار ستون میں اس کو قتل کر دیا۔ اور سلطان قطب الدین کو جو اس زمانے میں مبارک خان کہلاتا تھا، ملک شہاب الدین کا نائب مقرر کیا۔ (ترجمہ اردو تاریخ فیروز شاہی (برنی)، ص ۵۳۳ - ۵۳۸ -

(۱) علامہ اقبال کا حضرت بو علی قلندر کے اس شعر کی طرف اشارہ ہے:

مرحبا اے بلبل باغ کہن
از گل رعنا بگو با ما سخن

خطبهٔ این جنت آتش نژاد
از ہوائے دامنش مینو سواد

کوچک ابدالش سوئے بازار رفت
از شراب بوعلی سرشار رفت

عامل آن شہر می آمد سوار
ہمرکاب او غلام و چوبدار

پیشرو زد بانگ اے نا ہوشمند
بر جلوداران عامل رہ مبند

رفت آن درویش سر افگندہ پیش
غوطہ زن اندر یم افکار خویش

چوبدار از جام استکبار مست
بر سر درویش چوب خود شکست

از رہ عامل فقیر آزردہ رفت
دل گران و نا خوش و افسردہ رفت

در حضور بوعلی فریاد کرد
اشک از زندان چشم آزاد کرد

صورت برقے کہ بر کہسار ریخت
شیخ سیل آتش از گفتار ریخت

از رگ جان آتش دیگر کشود
با دبیر خویش ارشادے نمود

خامہ را بر گیر و فرمانے نویس
از فقیرے سوئے سلطانے نویس

بندہ ام را عاملت بر سر زدہ است
بر متاع جان خود اخگر زدہ است

باز گیر این عامل بد گوہرے
ورنہ بخشم ملک تو با دیگرے

نامۂ آن بندۂ حق دستگاہ
لرزہ ہا انداخت در اندام شاہ

پیکرش سرمایۂ آلام گشت
زرد مثل آفتاب شام گشت

بہر عامل حلقۂ زنجیر جست
از قلندر عفو این تقصیر جست

خسرو شیرین زبان رنگین بیان
نغمہ ہایش از ضمیر کن فکان

فطرتش روشن مثال ماہتاب
گشت از بہر سفارت انتخاب

چنگ را پیش قلندر چون نواخت
از نوائے شیشۂ جانش گداخت

شوکتے کو پختہ چون کہسار بود
قیمت یک نغمہ در گفتار بود

نیشتر بر قلب درویشان مزن
خویش را در آتش سوزان مزن[1]

تبلیغ :

تذکروں اور تاریخوں سے حضرت بو علی قلندر کی ان کوششوں کا بھی پتا چلتا ہے، جو انھوں نے تبلیغ اسلام کے لیے فرمائی تھیں، پانی پت اور اس کے نواحی علاقے میں جو راجپوت مسلمان نظر آتے

---

(۱) کلیات اقبال فارسی (اسرار و رموز) ص ۲۵ تا ۲۷

ہیں ، اُن کے آباواجداد نے حضرت بو علی قلندر ہی کی کوششوں سے اسلام قبول کیا تھا ، اس دور کا ایک بڑا راجپوت امیر سنگھ بھی آپ کے دست حق پرست پر مسلمان ہوا تھا ۔

وفات :

حضرت شاہ بو علی قلندر ۱۳ رمضان ۷۲۴ھ (۱۳۲۴ء) کو واصل الی اللہ ہوئے ۔ ''شرف الدین ابدال'' سے آپ کی تاریخ وفات نکلتی ہے ، مفتاح التواریخ میں ہے کہ وفات کے وقت آپ کی عمر تقریباً ایکسو سال تھی ۔[1]

سیرالاقطاب میں ہے کہ آپ کرنال میں مدفون ہوئے ، لیکن آپ کے بعض رشتے داروں نے ایک رات پوشیدہ طور پر جسد مبارک کو نکال کر پانی پت لے جا کر دفن کر دیا ، چنانچہ کرنال ، بوڈھا کھیڑا، پانی پت اور باگھوٹی میں آج بھی آپ کے معتقدین کا ہجوم رہتا ہے ۔[2]

تصانیف :

حضرت بو علی قلندر کے مکتوبات پر تبصرہ کرتے ہوئے شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے لکھا کہ :

> او را مکتوب است بزبانِ عشق و محبت مشتمل بر معارف و حقائقِ توحید و ترکِ دنیا و طلبِ آخرت و محبتِ مولیٰ جملہ آں بنام اختیار الدین

---

(۱) مفتاح التواریخ ، باب ہشتم ص ۱۲۰ - ۱۲۱ - مطبوعہ ۱۸۴۹ء

(۲) سیر الاقطاب ، ص ۱۹۱ -

خزینۃ الاصفیا میں ہے کہ:

مکتوبات وی کہ بنام اختیار الدین مرید خود تحریر کردہ
است کتابے است جامع علوم توحید۔

ہم ایک دو مکتوب کا ترجمہ تبرکاً یہاں نقل کرتے ہیں، جو کمال انشا پردازی، معنویت اور اسرار و رموز تصوف کے شاہکار ہیں۔ ایک خط میں اختیار الدین کو لکھتے ہیں:

اے برادر! جب تم پر اللہ تبارک و تعالیٰ کی عنایت شروع ہو جائے، تم میں جذبہ پیدا ہونے لگے، اور تم کو تم سے دور کیا جائے تو گویا تم میں عشق کا آغاز اور تم پر حسن کا جلوہ ظاہر ہو گیا، اور جب تم پر حسن کا مشاہدہ ہو جائے تو معشوق کو پہچانو اور عاشق بن کر معشوق ہو جاؤ، جب عاشق بن کر معشوق ہو گئے تو اسی طرح کام کرو معشوق کی سنت اور عاشق کے فریضے کو قائم رکھو، اس وقت معشوق کو عاشق کے ذریعے سے پہچان لو گے۔

اے برادر! معشوق کو تمہاری ہی صورت میں تمہارے درمیان بھیجا گیا، تاکہ براہ راست وہ تم کو دعوت دے۔ اے برادر! خدائے عز و جل نے بہشت اور دوزخ پیدا کیے، اور اس کا حکم ہے کہ دونوں پر کیے جائیں گے، معشوق کو عاشقوں کے ساتھ بہشت میں جگہ دی جائے گی، اور شیطان اپنے ساتھیوں کے ساتھ دوزخ کو پر کرے گا، بہشت و دوزخ میں عاشقوں کے سوا کوئی نہیں ہوگا، دونوں عاشق ہی کے حسن سے پیدا ہوئے ہیں، اور دونوں مقام غیر نہیں ہوں

گے ، بہشت دوستوں سے وصال کا مقام ہے ، دوزخ دشمنوں کے لیے جائے فراق ہے ، یہ فراق کافروں اور منافقوں کو حاصل ہوگا ۔ اے برادر ! چشم دل کھولو ، اور اچھی طرح سے دیکھو اور یہ جانو کہ عاشق نے اپنے عشق سے تمھارے لیے کیا کیا چیزیں اور کیا کیا تماشے پیدا کیے ہیں ، اپنا حسن ایک درخت میں منتقل کر دیا ہے ، اور گوناگوں میوے پیدا کیے ، ہر میوے میں علیٰحدہ مزہ رکھا اور اس درخت کو نہ اپنی ذات کی اور نہ اپنے پھول کی خبر اور نہ اپنے میوے کی خبر ہے ، گنّا تمھارے لیے پیدا کیا ، اور اس کو شکر کی خبر نہیں ، مشک ہرن کی ناف میں رکھا ، جو تمھارے لیے ہے ، ہرن کو مشک کی کوئی خبر نہیں ، گائے سے عنبر کو تمھارے لیے پیدا کیا ، اور گائے کو عنبر کی خبر نہیں ، زباد کو بلی سے تمھارے لیے پیدا کیا اور بلی کو زباد کی خبر نہیں ، کافور کو تمھارے لیے درخت سے پیدا کیا ، اور درخت کو کافور کی خبر نہیں ، صندل کو تمھارے لیے پیدا کیا اور صندل کو اپنی خبر نہیں ۔ اے برادر ! عاشق ہو جاؤ ، اور دونوں عالم کو معشوق کا حسن جانو ، اور اپنے آپ کو معشوق کا حسن کہو ، عاشق نے اپنے عشق سے تمھارے وجود کا ملک بنایا ، تاکہ اپنے حسن و جمال کو تمھارے آئینے میں دیکھے ، اور تم کو محرم اسرار جانے اور الانسان سّری (انسان میرا بھید ہے) تمھاری شان میں آیا ہے ، عاشق ہو جاؤ ، تاکہ حسن کو ہمیشہ دیکھو ، اور دنیا و عقبیٰ کو پہچانو ، عقبیٰ محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ملک ہے ، اور دنیا شیطان

کی ملکیت ہے ، دونوں میں معلوم کرو کہ تمہارے لیے کس کو پیدا کیا ہے ۔ اے برادر! نفس کو اچھی طرح پہچانو جب تم نفس کو پہچان لوگے تو دنیا کو بھی پہچان سکو گے ، اگر روح کو پہچان لو گے تو عقبیٰ کو بھی پہچان لو گے ۔ اے برادر دنیا! کفر میں جو حسن رکھا گیا ہے ، عاشق جانتے ہیں کہ اس نے (یعنی حسن نے) کفر کو عاشقوں کے سامنے کس قدر آراستہ کر دیا ہے ، جو دنیا کا عاشق ہے ، اس کا معشوق کفر کا حسن ہے ۔ اے برادر! تم جانتے ہو کہ حسن کا جو غمزہ کفر میں رکھا گیا ہے ، اس نے کس قدر پُر لطف تیر دنیا پر مارا ہے ، اور ان کو اپنا عاشق بنا لیا ہے ۔ اے برادر! اپنی جستجو میں رہو ، اور اپنے کو پہچانو ، جب تم اپنے نفس کو پہچان لو گے تو عشق کو بھی جان سکو گے ، اور جب عشق کو اپنے حسن پر دیکھو گے تو توکل اللسان کی کیفیت اپنے میں پاؤ گے ، عاشق ہو جاؤ اور معشوق کو اپنی گود میں دیکھو ، اور حسن کو اپنے دل کے آئینے میں معائینہ کرو

آں شاہد معنی کہ ہمہ طالب اویند
ہم اوست کہ از چادر تو ساختہ سرپوش
در بادیۂ ہجر چرا بند بمانیم
در عین وصالیم نگار است در آغوش

اے برادر! قند کا ایک گولا لاؤ ، اور اس سے سو گولے بنالو ، اور ہر گولے سے ایک صورت بناؤ ، اور ہر صورت کا نام رکھو ، بعض کو گھوڑا ، بعض کو

> ہاتھی کہو ، تو قند کا نام جاتا رہے گا ، اور صرف
> وہ صورت باقی رہے گی ، جب کل صورتوں کو توڑ کر
> پھر قند کا گولہ بنالو تو قند کا نام ظاہر ہو جائے گا۔[1]

ان کے ماسوا حضرت بو علی قلندر کی جن تصانیف کا اب تک پتا چل سکا ان میں سے ایک حکم نامۂ شرف الدین بھی آن سے منسوب ہے ۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں "حکم نامۂ شرف الدین" کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ :

> و رسالۂ دیگر در عوام الناس شہرت دارد ، او را حکم نامۂ
> شرف الدین می گویند ، ظاہر آنست کہ آن از مخترعات
> عوام است ۔[2]

ان کے علاوہ حضرت شیخ بو علی قلندر کے نام سے دو مثنویاں کنزالاسرار اور رسالۂ عشقیہ منسوب ہیں ۔

اس کے ماسوا ایک اور منظوم رسالہ ۱۸۹۱ء میں مطبع نامی لکھنؤ سے مثنوی شاہ بو علی قلندر کے نام سے شائع ہوا ہے ، خیال ہے کہ یہی مثنوی آن کا رسالہ عشقیہ ہے کیوں کہ اس میں عشق پر کثرت سے اشعار ملتے ہیں ، مثلاً

عشق کو بے بال و پر طیراں کند
عشق کو در لا مکاں جولاں کند

عشق کو تا تاج سلطانی نہد
عشق کو ملک سلیمانی دہد

---

(۱) یہ مکتوب اخبار الاخیار، ص ۱۲۱ و ۱۲۲ سے لیا گیا ہے ۔

(۲) اخبار الاخیار، ص ۱۲۱ ۔

عشق کو تا چشم دل بینا کند
عشق کو تا سینہ پر سودا کند

عشق کو تا عقل را زائل کند
عشق کو تا عقل را حاصل کند

عشق کو تا جام مدہوشی دہد
عشق باید تا فراموشی دہد

عشق دہ تا بے خبر سازد مرا
بادہ کو بے پا و سر سازد مرا

عشق باید تا دہد جام شراب
عشق سازد ساغر بے آفتاب

ہیچ میدانی کہ اصل عشق چیست
عشق را از حسن جاناں زندگی ست

عشق چوں جبریل در معراج حسن
بر سر عاشق نہد صد تاج حسن

عاشق و معشوق گردند ہر دو یک
ہم توئی معشوق و عاشق نیست شک

اے کہ گشتی واقف اسرار عشق
نہ قدم مردانہ اندر کار عشق

سر برآور زیر پائے عشق نہ
بعد از آں سر در ہوائے عشق نہ

عشق بازی نیست کار بوالہوس
خام طبعان حاضر اند ہمچون مگس
گر کنی جاں را تو بر جانان نثار
در عوض یک جاں دہد صد جاں نگار
کشتگانِ عشق را جانِ دگر
ہر زماں از غیب احسان دگر[1]

(۱) یہ اشعار بزم صوفیہ، ص ۲۵۶ و ۲۶۰ سے ماخوذ ہیں

۲۰

حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی

علامہ اقبال کی عقیدت :

علامہ اقبال اوائل جوانی ہی سے جس بزرگ کے والا و شیدائی ہیں ، وہ حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی ہیں ۔ وہ آپ کے مزار مبارک کی زیارت کو دل کی زندگی بتاتے ہیں ۔ اور آپ کی محبت میں رنگ محبوبی کو نہاں فرماتے ہیں ، وہ حصولِ علم کے لیے یورپ جاتے ہوئے آپ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر بصد خلوص و نیاز حاضر ہوتے ہیں اور آپ کے آستانے پر دعا کے طالب ہوتے ہیں کہ دعا کیجیے کہ مجھے وہ مقام بلند عطا ہو کہ میں اپنے ہمسفروں کا منزل مقصود بنوں ، میرے قلم کو وہ تاثیر عطا ہو کہ میرا فکر مبیں اور حرف دل نشیں ہو ، دکھی انسانیت کا مداوا ہو ، میری زبانِ قلم سے کسی کی دل آزاری نہ ہو ، میری نوا کو وہ سوز عطا کر جو دلوں میں اتر جائے ۔ ان تمام تاثرات سے وہ نظم جو بانگ درا میں ہمیں التجائے مسافر کے عنوان سے ملتی ہے سملوء نظر آتی ہے ۔ ہم اس نظم کے کچھ اشعار یہاں نقل کرتے ہیں ۔ فرماتے ہیں :

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
بڑی جناب تری ، فیضِ عام ہے تیرا

ستارے عشق کے تیری کشش سے ہیں قائم
نظامِ مہر کی صورت نظام ہے تیرا
تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی
مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا
نہاں ہے تیری محبت میں رنگِ محبوبی
بڑی ہے شان ، بڑا احترام ہے تیرا

اگر سیاہ دلم داغِ لالہ زار تو ام
وگر کشادہ جبینم ، گلِ بہار تو ام

چمن کو چھوڑ کے نکلا ہوں مثلِ نکہتِ گل
ہوا ہے صبر کا منظور امتحاں مجھ کو
چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو
فلک نشین صفت مہر ہوں زمانے میں
تیری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھ کو
مقام ہمسفروں سے ہو اس قدر آگے
کہ سمجھے منزلِ مقصود کارواں مجھ کو
مری زبانِ قلم سے کسی کا دل نہ دکھے
کسی سے شکوہ نہ ہو زیرِ آسماں مجھ کو
دلوں کو چاک کرے مثلِ شانہ جس کا اثر
تری جناب سے ایسی ملے فغاں مجھ کو

شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے
یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے[1]

---

(۱) بانگ درا ، ص ۹۶ - ۹۷

علامہ کی ایک اور نظم جو حضرت سلطان المشائخ سے ان کی دلی عقیدت کی ترجمان ہے ، یہ نظم انھوں نے اُس وقت لکھ کر درگاہ حضرت نظام الدین دہلی بھجوائی تھی جب کہ اُن کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کسی مصیبت میں گرفتار تھے ، اور علامہ اُن کی وجہ سے سخت پریشان تھے ، یہ نظم اُن کے مجموعہٴ کلام میں شامل نہیں ، بلکہ باقیات اقبال مؤلفہ سید عبدالواحد معینی میں ہماری نظر سے گزری ، جس کے چند اشعار ہم یہاں تبرکاً نقل کرتے ہیں ۔

کیوں نہ ہوں ارمان مرے دل میں کلیم اللہ کے
طور در آغوش ہیں ذرے تری درگاہ کے

میں تری درگاہ کی جانب جو نکلا ، لے اُڑا
آسماں تارے بنا کر میری گرد راہ کے

ہے زیارت کی تمنا المدد اے سوز عشق
پھول لادے مجھ کو گلزار خلیل اللہ کے

شان محبوبی ہوئی ہے پردہ دار راز عشق
واہ کیا رتبے ہیں اُس سرکار عالی جاہ کے

تر جو تیرے آستانے کی تمنا میں ہوئی
اشک موتی بن گئے چشم تماشا خواہ کے

محو اظہار تمنائے دل ناکام ہوں
لاج رکھ لینا تیرے اقبال کا ہم نام ہوں

اے ضیائے چشم عرفاں ، اے چراغ راہ عشق
تنگ آیا ہوں جفائے چرخ ناہنجار سے

سینہٴ پاک علیؓ جن کا امانت دار تھا
اے شہہٴ ذی جاہ! تو واقف ہے اُن اسرار سے

ہند کا داتا ہے تو تیرا بڑا دربار ہے
کچھ ملے مجھ کو بھی اس دربار گوہر بار سے
اک نظر میں خسرو ملک سخن خسرو ہوا
میں کہیں خالی نہ پھر جاؤں تری سرکار سے
سخت ہے میری مصیبت سخت گھبرایا ہوں میں
بن کے فریادی، تری سرکار میں آیا ہوں میں
تو ہے محبوب الٰہی کر دعا میرے لیے
یہ مصیبت ہے مثال فتنہ محشر مجھے[1]

علامہ کی اس نظم کے بعد اُن کے بھائی شیخ عطا محمد کی وہ مصیبت ٹل گئی، جس میں وہ مبتلا تھے ، یہ امر اور بھی حضرت محبوب الٰہی سے علامہ کی مزید اضافہ عقیدت کا سبب بنا ۔

حالات :

اس برصغیر میں سلسلہ چشتیہ کے موسس و بانی حضرت خواجہ معین الدین اجمیری نے سلسلہ چشتیہ کی بنیاد ڈالی، اُن کے مرید خاص خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے دہلی میں مقیم رہ کر سلسلہ چشتیہ کی تحریک کو کامیاب بنانے کا سامان فراہم کیا، حضرت خواجہ قطب الدین کے خلیفہ خاص حضرت بابا فرید گنج شکر[2] نے اجودہن (پاک پٹن) میں اس سلسلے کو منظم کیا ،

---

(۱) باقیات اقبال ، ایڈیشن اول ، ص ۷۹ - ۸۳

(۲) حضرت بابا فرید گنج شکر : اسم گرامی : مسعود : لقب : فرید الدین و گنج شکر ، تاریخ ولادت : ۵۸۴ھ (۱۱۸۸ء) قصبہ کھتی وال (کھوتوال) ضلع ملتان ۔ مرشد : حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی ۔ عمر : ۹۵ سال ۔ وفات : ۵ محرم ۶۶۴ھ (۱۲۶۶ء) (شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور ان کی تعلیمات ، ص ۸۷ - ۹۸)

اور آن کے مرید و خلیفہ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی نے پھر دہلی میں رشد و ہدایت کا چراغ روشن کر کے اس کی روشنی کو اس برصغیر پاک و ہند کے گوشے گوشے میں پہنچا دیا۔

خاندان و نسب :

حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی کا اسم گرامی محمد، والد کا نام سید علی اور نانا کا نام سید عرب تھا، آپ کا سلسلۂ نسب چند واسطوں سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جا ملتا ہے۔ حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی کی ولادت ۲ صفر ۶۳۰ھ (۱۲۳۳ء) کو ہندوستان کے مشہور شہر بدایوں میں ہوئی، ابتدائی تعلیم بدایوں میں مولانا علاء الدین اصولی[1] سے حاصل کی۔ پھر دہلی میں آپ نے مولانا شمس الدین خوارزمی[2]، اور مولانا کمال الدین[3] سے تعلیم پائی۔

دستار فضیلت :

قدوری ختم کرنے کے بعد مولانا علاء الدین اصولی نے آن سے فرمایا، میاں! اب دستار فضیلت کی تیاری کریں۔ آپ نے آ کر اپنی

---

(۱) مولانا علاء الدین اصولی : نہایت بزرگ اور کامل انسان تھے، بدایوں کے رہنے والے تھے۔ (اخبار الاخیار، ص ۷۷-۷۸)

(۲) مولانا شمس الدین خوارزمی : غیاث الدین بلبن کے معاصر تھے، (تذکرہ علمائے ہند، ص ۵۷۳)

(۳) مولانا کمال الدین دہلوی : نہایت ہی متبحر عالم، زاہد و متقی و دیانت دار تھے۔ حضرت خواجہ محبوب الٰہی نے مشارق الانوار کی سند آن سے حاصل کی، سلطان غیاث الدین بلبن کی آرزو تھی کہ مولانا کمال الدین کو اپنا امام مقرر کرے، مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ (تذکرہ علمائے ہند، ص ۴۰۰)

والدہ سے عرض کیا کہ میرے استاد دستار فضیلت کے لیے کہتے ہیں ، میں دستار کہاں سے لاؤں ، آپ کی والدہ نے فرمایا بیٹا ! پریشان نہ ہو ، اس کا انتظام میں کروں گی ، چنانچہ وہ روئی خرید کر لائیں ۔ اسے کتوایا ، اور دستار تیار کی ، شہر کے عالموں اور صالحین کو اپنے بیٹے کی دستار بندی کی تقریب کی دعوت دی ، خواجہ علی مرید شیخ جلال الدین تبریزی نے دستار کا ایک پیچ باندھا ، اور تمام علماء اور بزرگوں نے مل کر آپ کے اضافۂ علم کے لیے دعا کی ۔

حضرت بابا فرید گنج شکر کی عقیدت :

حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی فرماتے ہیں کہ میری عمر تقریباً بارہ سال کی تھی ، اس وقت میں لغت پڑھتا تھا کہ ایک شخص ابوبکر خراطہ جسے ابوبکر قوال بھی کہتے تھے ، میرے استاد کے پاس آیا اور کہنے لگا میں ملتان گیا تھا ، اور وہاں حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کی خدمت میں حاضر ہوا تھا ، ان کے فضائل و مناقب بیان کرتے ہوئے اس نے کہا کہ ان کے پاس جو لوگ رہتے ہیں وہ بہت ذاکر و شاغل ہیں ، اور اوراد و نوافل میں ہر وقت مصروف رہتے ہیں ، یہاں تک کہ عورتیں بھی چکی چلاتے وقت ذکر میں مشغول رہتی ہیں ، لیکن کوئی بات میرے دل کو نہ لگی ، پھر اس نے حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کا تذکرہ کیا ، ان کے اوصاف و محامد سن کر ان کی محبت و عقیدت میرے دل نشین ہوگئی ، اور ان کا نام لینے میں مجھے مزا آنے لگا ، یہاں تک کہ میں ہر نماز کے بعد بڑے مزے لے کر آپ کے نام کی رٹ لگاتا [1] ۔

---

(۱) فوائد الفواد ۔

دہلی میں حصول تعلیم :

حضرت محبوب الٰہی کی عمر سولہ سال تھی جب حصول تعلیم کے لیے دہلی پہنچے ، اس وقت دہلی علماء کا مرکز تھی ، جس زمانے میں آپ دہلی پہنچے اس وقت دہلی کا حکمران سلطان ناصر الدین محمود اور غیاث الدین بلبن اس کا وزیر تھا ، اور مولانا شمس الدین جو مستوفی الممالک ہو کر شمس الملک کے لقب سے مشہور ہوئے سرکاری عہدے کے ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری کیے ہوئے تھے ، حضرت محبوب الٰہی بھی آن کے حلقۂ درس میں شریک ہوگئے ، مولانا شمس الدین حضرت محبوب الٰہی پر بڑی شفقت فرماتے ، وہ جس حجرے میں بیٹھ کر مطالعہ فرماتے تھے ، اس میں کسی شاگرد کو آنے کی اجازت نہ تھی ، مگر حضرت محبوب الٰہی ، اور آپ کے دو ساتھی مولانا قطب الدین ناقلہ ، اور مولانا برہان الدین باقی کو آنے کی اجازت تھی ۔

مولانا شمس الدین کی عادت تھی کہ اگر کوئی شاگرد ناغہ کر دیتا یا دیر سے آتا تو اس سے فرماتے تھے آخر مجھ سے کیا قصور ہوا تھا کہ آپ نہیں آئے ، حضرت محبوب الٰہی نے یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے تبسم فرمایا ، اور کہا کہ اگر کسی سے مزاح فرماتے تو کہتے مجھ سے کیا قصور ہوا کہ آپ نہیں آئے ۔ تاکہ میں پھر وہی قصور کروں ، کبھی مجھ سے ناغہ ہو جاتا ، اور میں دیر میں جاتا ، تو میری تمنا ہوتی کہ آپ مجھ سے بھی یہی کہیں ، لیکن آپ مجھے دیکھ کر یہ شعر پڑھتے :

آخر کم از آنکہ گاہ گاہے
آئی و بما کنی نگاہے[1]

---

(۱) فوائد الفواد ، ص ۳۷ ۔

یہ واقعہ سنا کر آپ آبدیدہ ہوگئے ، اور حاضرین پر بھی رقت طاری ہوگئی - پھر فرمایا کہ مجھے اپنے حجرے میں اپنے ساتھ بٹھاتے ۔ میں بے حد عذر کرتا ، مگر آپ منظور نہ فرماتے -

قوتِ حافظہ :

زمانۂ طالب علمی میں آپ کے حافظے کا یہ عالم تھا کہ مشہور کتاب مقامات حریری کے چالیس مقالے حفظ کیے تھے ، پھر اس کے کفاوے کے طور پر حدیث کی مشہور کتاب مشارق الانوار حفظ کی -[1]

درس حدیث و فقہ :

حدیث کا درس آپ نے اپنے عہد کے مشہور محدّث شیخ محمد بن احمد الماریکلی مشہور بہ مولانا کمال الدین زاھد سے لیا ، جو مشارق الانوار علامہ حسن بن محمد الصغانی کے شاگرد تھے ، فقہ میں آپ ایک واسطہ سے صاحبِ ہدایہ علامہ برہان الدین المرغینانی کے شاگرد تھے -

والدہ کی وفات :

حضرت محبوب الٰہی تعلیم کی غرض سے دہلی میں ہی مقیم تھے - کہ آپ کی والدہ نے وفات پائی ۔ آپ کو اپنی والدہ سے اس قدر محبت تھی کہ والدہ کی وفات کے ایک عرصے بعد اپنی والدہ کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے آپ پر اس قدر گریہ طاری ہوا کہ جو کچھ فرماتے تھے پوری طرح سننے میں نہیں آتا تھا ، اسی عالم میں یہ شعر پڑھا :

(۱) تاریخ دعوت و عزیمت جلد ۳ ، ص ۵۷ بحوالہ سیرالاولیاء ص ۱۰۱ -

افسوس دلم کہ ہیچ تدبیر نکرد
شبہائے وصال را بہ زنجیر نکرد

بیعت :

حضرت محبوب کو بارہ سال کی عمر سے حضرت بابا فرید گنج شکر سے غیر معمولی عقیدت و محبت تھی ، اور وہ حضرت بابا فرید گنج شکر کے بھائی شیخ نجیب الدین متوکل کے ذریعے آپ سے متعارف ہو چکے تھے ، حضرت محبوب الٰہی جب پہلی مرتبہ حضرت بابا فرید گنج شکر کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس ملاقات کی تفصیل کو خود بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب میں حضرت بابا فرید گنج شکر کی خدمت میں اجودھن حاضر ہوا تو آپ نے مجھے دیکھتے ہی یہ شعر پڑھا :

اے آتش فراقت دلہا کباب کردہ
سیلاب اشتیاقت جانہا خراب کردہ

میں نے چاہا کہ اپنے اشتیاق ملاقات کو تفصیل سے بیان کروں ، لیکن شیخ کے رعب نے زبان کی قوت گویائی کو سلب کرلیا ، اور صرف اتنا ہی کہہ سکا کہ مدت سے قدم بوسی کا شوق تھا ، شیخ نے میری مرعوبیت کو محسوس کرلیا ، اور فرمایا کہ : لکل داخل دھشۃ (ہر نئے آنے والے پر رعب ہوتا ہی ہے) پھر کلاہ چار ترکی اپنے سر سے آتار کر میرے سر پر رکھ دی [۱] - پھر آپ نے میری نہایت مدارات فرمائی ، حکم دیا کہ اس پردیسی طالب علم کی چارپائی جماعت خانے میں بچھائی جائے - جب چارپائی بچھ گئی تو میں نے اپنے دل میں خیال کیا کہ میں ہرگز اس چارپائی پر نہ سوؤں گا ، کتنے معزز مہمان ، حافظ کلام اللہ ، کتنے عاشقان خدا زمین

---

(۱) فوائد الفواد ، ص ۱۸۵

پر سو رہے ہیں، میں چارپائی پر کیسے لیٹ سکتا ہوں؟ یہ خبر جب منتظم خانقاہ خواجہ بدر الدین اسحاق[1] کو ملی تو انھوں نے کہلا بھیجا، تمھیں اپنے دل کی من مانی کرنا ہے یا شیخ کے حکم کی تعمیل کرنی ہے۔ میں نے کہا کہ میں شیخ کے حکم کی تعمیل کروں گا، فرمایا تو جاؤ اور چارپائی پر سوؤ۔[2]

اس پہلی ہی ملاقات میں حضرت محبوب الٰہی حضرت بابا فرید گنج شکر کے دستِ حق پرست پر بیعت ہوئے، اس وقت آپ کی عمر بیس سال کی تھی۔[3]

تعلیم علوم ظاہری :

حضرت محبوب الٰہی ۱۵ رجب ۶۵۵ھ (۱۲۵۷ء) سے ۳ ربیع الاول ۶۵۶ھ (۱۲۵۸ء) تک حضرت بابا فرید گنج شکر کی خدمت میں ریاضت اور مجاہدے اور علوم ظاہری و باطنی کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ بیعت ہونے کے بعد حضرت محبوب الٰہی نے اپنے پیر و مرشد سے عرض کیا کہ علوم ظاہری کی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھوں، یا اوراد و نوافل میں مشغول ہو جاؤں، فرمایا نظام! تم کو کچھ کتابیں مجھ سے پڑھنی ہوں گی، چنانچہ آپ نے قرآن مجید کے

---

(۱) خواجہ بدر الدین اسحاق : بابا فرید گنج شکر کے داماد اور خلیفہ تھے، علوم ظاہری کی طرف بہت راغب تھے، مرشد کی تلاش میں سفر کیے، آخر میں بابا کی خدمت میں حاضر ہو کر مرید ہو کر خلافت سے سرفراز ہوئے، حضرت محبوب الٰہی کو ان سے بڑی عقیدت تھی، جب تک وہ حیات رہے ان کی عزت و احترام کی وجہ سے کسی شخص کو مرید نہیں کیا۔

(۲) سیرالاولیاء، ص ۱۰۷

(۳) سیر الاولیاء، ص ۱۰۷۔

چھ پارے تجوید سے آپ سے پڑھے۔ اس کے علاوہ عوارف کے چھ باب پڑھ کر آپ سے سند حاصل کی، پھر اپنے شیخ سے ابو شکور سالمی بھی اول سے آخر تک سبقاً سبقاً پڑھی۔[1]

اپنے شیخ کے درس کی لذت و کیفیت کو بیان کرتے ہوئے حضرت محبوب الٰہی فرمایا کرتے تھے۔ کہ آپ کے بیان کی تاثیر کی یہ کیفیت تھی کہ جب آپ تقریر فرماتے تو یہ آرزو ہوتی کہ اگر اسی عالم میں موت آجاتی تو اچھا ہوتا۔[2]

بے نفسی کی تعلیم :

اسی زمانے میں جب کہ آپ بابا فرید گنج شکر کی خدمت میں حاضر تھے، ایک عالم جو حضرت محبوب الٰہی کے ہم درس بھی رہ چکے تھے اجودھن آئے، انھوں نے آپ کو پھٹے پرانے کپڑوں میں دیکھا تو افسوس کرتے ہوئے کہا، مولانا نظام الدین! تم نے یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے، اگر تم شہر میں درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے تو بڑی شان و شوکت سے رہتے۔ میں نے اپنے دوست کی یہ بات سنی، اور خاموش رہا، جب میری ملاقات اپنے شیخ سے ہوئی تو آپ نے خود ہی فرمایا کہ نظام! اگر تمھاری کسی دوست سے ملاقات ہو۔ اور وہ تم سے کہے کہ تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے، اگر تم درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھتے تو آج کتنے خوش حال ہوتے تو بھلا تم اس کا کیا جواب دو گے؟ میں نے عرض کیا، جو آپ ارشاد فرمائیں گے میں وہی جواب دوں گا۔ فرمایا اگر کبھی کوئی یہ بات کہے تو جواباً یہ شعر پڑھ دینا :

---

(۱) سیر الاولیاء، ص ۱۰۶ -

(۲) فوائد الفواد، ص ۵۷ -

نہ ہمرہی تو مرا راہ خویش گیر برو
ترا سلامتی بادا مرا نگو نساری

اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ جاؤ اور خانقاہ کے باورچی خانے سے مختلف کھانوں کا ایک خوان لے کر اور اپنے سر پر رکھ کر اپنے دوست کے پاس لے جاؤ، میں نے ارشاد کی تعمیل کی، میرے دوست نے جب یہ دیکھا تو روتا ہوا دوڑا، اور میرے سر سے کھانے کا خوان اتارا، اور کہنے لگا تم نے حد کردی کہ تم میرے لیے کھانے کا یہ خوان سر پر رکھ کر لائے، میں نے سارا واقعہ سنایا، اس نے سارا قصہ سن کر کہا کہ سبحان اللہ! تمھارے شیخ کتنے صاحب کمال ہیں کہ تمھیں بے نفسی کی اس منزل پر پہنچا دیا پھر انھوں نے اپنے ملازم سے کہا کہ یہ خوان سر پر اٹھا کر ہمارے ساتھ چلو۔ میں نے کہا یہ نہیں ہوگا، بلکہ میں خود اس خوان کو سر پر اٹھا کر لے چلوں گا، غرض ہم دونوں اسی طرح شیخ کی خدمت میں پہنچے، میرے دوست نے آپ کے ہاتھ پر بیعت ہو کر توبہ کی۔[1]

خلافت سے سرفرازی:

ریاضتوں اور مجاہدوں کے بعد حضرت بابا فرید گنج شکر نے حضرت محبوب الٰہی کو خلافت سے سر فراز فرمایا، رخصت کرتے وقت وصیت فرمائی کہ دہلی پہنچنے کے بعد بھی مجاہدوں میں مشغول رہنا، بیکار نہ رہنا۔ نفلی روزہ رکھنا نصف راہ ہے، اور دوسرے نفلی اعمال نماز و حج (نفلی) نصف راہ۔

پھر خلافت نامہ لکھ کر دیا اور ارشاد فرمایا کہ یہ خلافت نامہ ہانسی میں مولانا جمال الدین کو اور دہلی میں قاضی منتجب الدین کو دکھا دینا۔

---

(۱) سیر الاولیاء، ص ۲۳۹ - ۲۴۰ -

راستے میں جب یہ خلافت نامہ آپ نے مولانا جمال الدین ہانسوی[1] کو دکھایا تو وہ بہت خوش ہوئے ، اور یہ شعر پڑھا :

خدائے جہاں را ہزاراں سپاس
کہ گوہر سپردہ بگوہر شناس[2]

دہلی واپس ہونے کے وقت منجملہ اور نصائح کے یہ نصیحت بھی فرمائی تھی کہ اگر کسی سے قرض لینا تو اس کو جلد ادا کرنے کی فکر کرنا ، اور اپنے دشمنوں کو ہر حال میں خوش رکھنے کی کوشش کرنا ۔

جب آپ دہلی واپس آئے تو حضرت محبوب الٰہی فرماتے ہیں کہ مجھے ۲۰ جیتل ایک شخص کے دینے تھے جو بزاز تھا ، اور جس سے کبھی میں نے کپڑا ادھار لیا تھا ، ایک مرتبہ دس جیتل مجھے ملے ، میں اس بزاز کے پاس گیا ، اور اسے دس ٹنکے دے کر کہا کہ یہ دس تو لے لو ، باقی پھر ادا کروں گا ، بزاز نے وہ دس ٹنکے تو لے لیے باقی معاف کردیے ، اسی طرح میں نے اپنے ایک عزیز سے ایک کتاب مستعار لی تھی ، جو اتفاق سے مجھ سے گم ہو گئی تھی ،

---

(۱) مولانا جمال الدین ہانسوی : امام ابو حنیفہ علیہ الرحمۃ کی اولاد میں سے تھے ، اور حضرت بابا فرید گنج شکر کے جلیل القدر خلفاء میں تھے ، حضرت بابا صاحب ان کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ جمال ہمارا جمال ہے ، جس مرید کو خلافت نامہ دیتے ، ان کے پاس بھیجتے ، اگر وہ قبول کرلیتے تو وہ قبول کیا جاتا ، اگر وہ رد کر دیتے تو حضرت بابا صاحب ان کے متعلق فرماتے کہ جمال کا پھاڑا ہوا فرید نہیں جوڑ سکتا ، مولانا جمال کا مزار ہانسی میں ہے (اخبار الاخیار ، ص ۱۶۷ - ۱۶۸)

(۲) سیر الاولیاء ، ص ۱۱۶ - ۱۱۷ -

میں اس کے پاس گیا، وہ اس معاملے کو بھول بھی چکا تھا، میں نے اس سے کہا کہ میں نے تم سے ایک کتاب لی تھی، وہ گم ہو گئی، میں اب اس کی نقل تمھیں تیار کر کے دوں گا، اس نے کہا کہ میں نے وہ کتاب تم کو بخش دی ۔[1]

دهلی میں قیام :

صاحب تاریخ دعوت و عزیمت نے صاحب سیر الاولیاء کے حوالے سے دہلی میں ابتدا سے جہاں جہاں آپ کا قیام رہا تفصیل دیتے ہوئے لکھا کہ :

جتنے سال حضرت محبوب الٰہی شہر دہلی میں رہے، کوئی مکان آپ کی ملکیت میں نہ تھا، پہلی مرتبہ جب آپ بدایوں سے آئے تو سرائے میاں بازار میں جس کو نمک کی سرائے بھی کہتے ہیں آترے، اپنی والدہ اور ہمشیرہ کو بھی وہیں رکھا، اور خود ایک قوّاس (کمان گر کی بارگاہ میں جو سرائے مذکور کے سامنے تھی مقیم ہوئے، امیر خسرو کا مکان بھی اسی محلے میں تھا کچھ عرصے بعد راوت عرض کا مکان خالی ہوا، اس کے لڑکے علاقوں میں چلے گئے، امیر خسرو کی معرفت جو راوت عرض کے نواسے تھے، آپ کو یہ مکان مل گیا، آپ دو سال اس میں مقیم رہے، یہ مکان شہر پناہ کے متصل مندہ دروازہ اور مندہ پُل کے نزدیک تھا، اس طرح کہ شہر پناہ کا برج اس عمارت کے اندر آگیا تھا، مکان کے ایوان، رواق، بڑے شاندار تھے ۔ چوں کہ راوت عرض کے بیٹے واپس آچکے تھے ۔ اس لیے وہ مکان آپ کو چھوڑنا

(۱) فوائد الفواد، ص ۳۰

پڑا آپ کی کتابیں جن کے سوا آپ کے پاس اور کوئی سامان نہ تھا ، سید مبارک محمد کرمانی فرماتے ہیں سروں پر رکھ کر چھپر والی مسجد میں (جو سراج بقال) کے سامنے تھی لے آئے ، دوسرے روز سعدی کاغذی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ، اور نہایت عزت و احترام سے اپنے مکان پر لے گیا ۔ اس مکان کے بالا خانے پر ایک بہت اچھی بارگاہ بنی ہوئی تھی ، اس میں آپ کو ٹھہرایا ، حضرت محبوب الٰہی ایک مہینے اس مکان میں رہے ، اس کے بعد اس مکان کو چھوڑ کر رکابدار کی سرائے میں جو قیصر پُل کے متصل تھی ، اور اس سرائے کے درمیان ایک مکان تھا اس میں اٹھ آئے ، ایک مدت تک اس میں رہے ، پھر وہاں سے بھی منتقل ہو کر شادی گلابی کے مکان میں جو محمد میوہ فروش کی دکانوں کے درمیان واقع تھا چلے آئے ، اسی زمانے میں میاں شمس الدین شراب دار[1] کے لڑکے اور اعزہ جو آپ کے معتقد تھے نہایت تعظیم و تکریم کے ساتھ میاں شمس الدین شراب دار کے مکان میں لے آئے ، کئی سال آپ اس مکان میں رہے، اس مکان میں آپ کو بڑی راحت و سکون ملا ۔[2]

سیرالاولیا کے ایک اقتباس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت محبوب الٰہی طلب علم کے سلسلے میں دہلی تشریف لائے تو ہلال طشت دار کی مسجد کے نیچے ایک حجرے میں قیام فرمایا ، اسی مسجد کے قریب حضرت بابا فرید گنج شکر کے چھوٹے

---

(۱) شراب دار بادشاہ کے پانی پلانے کے عہدے کو کہتے تھے ۔

(۲) تاریخ دعوت و عزیمت حصہ سوم ، ص ۱۰۷ - ۱۰۸ بحوالہ سیرالاولیاء ، ص ۱۰۸ ۔

بھائی شیخ نجیب الدین متوکل کا مکان تھا ، ان ہی بزرگ نے حضرت محبوب الٰہی کے قلب میں حضرت بابا فرید گنج شکر کی محبت و عقیدت کا چراغ روشن کیا ۔[1]

دور ابتلا :

دہلی تشریف لانے کے بعد حضرت محبوب الٰہی کو نہایت ابتلا و آزمائش کے دور سے گزرنا پڑا ۔ خود ابتدائی زمانے میں قیام دہلی کے فقر و فاقے کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک روز ارشاد فرمایا کہ یہ وہ زمانہ تھا کہ سارے ہندوستان کی دولت دہلی میں آنند آئی تھی ، ہر طرف خوش حالی اور فارغ البالی کا دور دورہ تھا ، ارزانی کا یہ عالم تھا کہ دو سیر میدے کی روٹیاں ایک جیتل میں مل جاتی تھیں ، اور دو جیتل میں ایک من خربوزے بازار میں ملتے تھے ، لیکن اس وقت میرے گھر میں فقر و فاقے کی یہ کیفیت تھی کہ میرے پاس ایک دانگ بھی نہ ہوتا تھا کہ اس سے روٹیاں خرید کر کھاؤں اور اپنی والدہ اور ہمشیرہ کو کھلاؤں ، خربوزوں کے اتنا سستا ہونے کے باوجود پوری فصل گزر جاتی اور خربوزہ چکھنا نصیب نہ ہوتا تھا ، لیکن میں اس حال میں بھی خوش تھا ۔[2]

دہلی کے قیام کے زمانے میں شیخ کی خدمت میں حاضری :

دہلی تشریف لانے کے بعد حضرت محبوب الٰہی تین مرتبہ اپنے شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ آخری مرتبہ حضرت بابا فرید گنج شکر کی وفات سے تین چار ماہ پہلے آپ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے ، رخصت کرتے وقت حضرت بابا صاحب نے ان سے فرمایا کہ : خدائے تعالیٰ تمھیں نیک بخت بنائے ، تم ایسا درخت

---

(۱) بزم صوفیہ ، ص ۱۸۳ ۔

(۲) سیر الاولیاء ، ص ۱۱۳ ۔

ہوگے کہ جس کے سائے میں مخلوق آرام پائے گی اور نصیحت فرمائی کہ ہمیشہ مجاہدے کرتے رہنا اپنے شیخ کی وفات کے وقت حضرت محبوب الٰہی اجودہن میں نہ تھے، وفات کے وقت حضرت بابا صاحب نے انھیں یاد کرتے ہوئے فرمایا کہ نظام الدین اس وقت دہلی میں ہیں، اور میں بھی اپنے شیخ حضرت قطب الدین بختیار کاکی کی وفات کے وقت ہانسی میں تھا، پھر آپ نے مولانا بدر الدین اسحاق کے حوالے اپنا جامہ، مصلیٰ اور عصا کیا، اور ارشاد فرمایا کہ یہ چیزیں نظام الدین کے حوالے کردینا، چنانچہ جب آپ اجودھن تشریف لائے تو خواجہ بدر الدین اسحاق نے یہ تبرکات آپ کے حوالے کیے۔[۱]

غیاث پورہ کی سکونت :

فوائد الفواد میں ہے کہ حضرت محبوب الٰہی نے فرمایا کہ شہر کے شور و شغب کی وجہ سے میرا دل دہلی میں نہ لگتا تھا، کبھی سوچتا تھا کہ پٹیالی چلا جاؤں، وہاں ان دنوں ایک ترک تھا، کبھی خیال کرتا تھا کہ بشنالہ چلا جاؤں کہ وہاں کی آب و ہوا اچھی ہے، چنانچہ میں بشنالہ چلا گیا، تین روز تک وہاں رہا مگر کوئی مکان رہائش کے لیے نہ مل سکا، وہاں سے دہلی واپس چلا آیا، لیکن میں دہلی کے قیام سے بڑا بد دل تھا، ایک روز میں نے حوض رانی کے پاس ''باغ حیرت'' میں خدا سے بصدق دل دعا کی کہ الٰہی! میں اس شہر سے چلا جانا چاہتا ہوں، لیکن جہاں تیری مرضی ہو وہاں جانا چاہتا ہوں، اچانک ایک غیبی آواز آئی ''غیاث پورہ''، مجھے معلوم نہ تھا کہ غیاث پورہ کہاں ہے میں نے جب یہ آواز سنی تو اپنے ایک دوست کے پاس گیا، معلوم ہوا کہ وہ غیاث پورہ گیا ہوا ہے، میرے دل نے کہا کہ یہ وہی

---

(۱) فوائد الفواد۔

(۲) [illegible]

غیاث پورہ ہے ، میں غیاث پورہ آیا ، اس وقت یہ مقام زیادہ آباد نہیں تھا ، یہاں کم لوگ آباد تھے ، میں نے یہیں پر سکونت اختیار کرلی ۔

حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی نے غیاث پورہ کو اپنا مرکز بنا کر وہیں اپنے رشد و ہدایت کے چراغ کو روشن کیا ، انھوں نے بگڑے ہوئے انسانوں کو ہدایت کی راہ دکھائی ، اخلاقی قدروں کو بلند کیا ، اپنے قول و عمل سے غربا کے ساتھ ہمدردی اور شفقت کا درس دیا ، پروانہ وار ہزاروں انسان اس شمع معرفت کے گرد جمع ہونے لگے ، شیخ کی عسرت فارغ البالی میں بدلی ، فقر کی شان نے بادشاہوں کی شوکت کو ماند کردیا ۔ آپ کے مرید خاص حضرت امیر خسرو نے اس فقیرانہ عظمت کی تصویر کشی کرتے ہوئے کہا ہے :

در حجرۂ فقر بادشا ہے
در عالم دل جہاں پنہا ہے

شاہنشہے بے سریر و بے تاج
شاہاں ہمہ بخاک پائے محتاج

لیکن اس فارغ البالی کے باوجود کیہ بقول حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی فتوحات کا یہ حال تھا کہ دولت کا دریا دروازے کے آگے بہتا تھا ، کوئی دن فتوحات سے خالی نہ ہوتا تھا ۔ لیکن تعیش کی زندگی اور لذت کام و دہن سے آپ نے کبھی کوئی تعلق نہ رکھا ، جو کچھ آتا وہ فقرا ، درویشوں اور آنے جانے والوں پر تقسیم فرمادیتے ، کوئی آنے والا آپ کے دروازے سے محروم نہ جاتا ، حضرت چراغ دہلی نے لکھا ہے کہ لینے والے لانے والوں سے زیادہ رہتے تھے ، جو بھی آتا ، جس وقت بھی آتا محروم نہ

جاتا ، اور جو کوئی کچھ لاتا اس سے زیادہ حضرت کی عنایت سے پاتا ۔[1]

امیر حسن علا سجزی کا بیان ہے کہ میں ایک مرتبہ آپ کی خدمت میں حاضر تھا ، ایک امیر نے باغ اور بہت سی زمین کی دستاویز آپ کی خدمت میں بھجوائی ، لیکن حضرت نے اسے قبول نہ فرمایا اور تبسم کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اگر میں اس کو قبول کرلوں تو لوگ کہا کریں گے کہ شیخ باغ کی سیر کو گئے ہیں، اپنی زمین اور کھیتی دیکھنے تشریف لے گئے ہیں، میرے فرائض کو اس کام سے کیا نسبت ، ہمارے بزرگوں اور مشائخ میں سے کسی نے زمین اور جائیداد قبول نہیں کی ۔[2]

حضرت محبوب الٰہی کے دستر خوان پر انواع و اقسام کے کھانے ہوتے، غربا اور مساکین اور دوسرے لوگ آپ کے دسترخوان سے فیض یاب ہوتے ، لیکن آپ کی غذا ایک یا آدھی روٹی اور کچھ کریلے وغیرہ کی سبزی یا تھوڑے سے چاول کے سوا کچھ نہ تھی ۔ مولانا شمس الدین یحییٰ کا بیان ہے کہ میں ایک مرتبہ آپ کے دستر خوان پر افطار کے وقت حضرت محبوب الٰہی کو دیکھ رہا تھا ، میں نے دیکھا کہ کھانا شروع ہوتے وقت آپ نے لقمے کے لیے ہاتھ بڑھایا ، لیکن کھانے کے ختم ہونے تک ہاتھ کے منہ تک پہنچنے کی نوبت نہ آئی یہاں تک کہ دستر خوان بڑھا دیا گیا۔

حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی نے پانچ فرمانرواؤں کا زمانہ دیکھا تھا، لیکن آن کا عمل طبقۂ اول کے صوفیہ کی طرح تھا کہ وہ دربار سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے فرمانروا آپ سے ملاقات کی تمنا رکھتے ، لیکن آپ ہمیشہ اس سے احتراز کرتے ، مگر آن کی

---

(۱) سراج المجالس اردو ترجمہ خیر المجالس ، ص ۲۰۲ ۔
(۲) فوائد الفواد ، ص ۹۹ ۔

بے راہ رویوں اور ان کی غلطیوں پر ان کو متنبہ کرتے ، سیاست کے خار زار سے انھوں نے اپنے دامن کو علیحدہ رکھا ، لیکن جب دین کے لیے ضرورت پیش آئی تو وہ بڑے سے بڑے فرمانروا کے سامنے حق کے کہنے سے باز نہیں رہے -

سیر العارفین اور سیر الاولیا میں ہے کہ : جب سلطان معزالدین کیقباد نے غیاث پورہ کے قریب کیلوکھڑی میں اپنا شاندار محل بنایا ، اور وہاں سکونت اختیار کرلی تو حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی کی خدمت میں بادشاہ ، امرا اور عوام کثرت سے آنے لگے ، اس ہر وقت کے ہجوم سے عبادت و ریاضت کے معاملات میں فرق آنے لگا ، آپ نے غیاث پورہ کی سکونت سے دل برداشتہ ہو کر کسی دوسری جگہ سکونت اختیار کرنے کا ارادہ کیا ، حضرت محبوب الٰہی اسی فکر میں تھے کہ اچانک ایک خوب صورت نوجوان آپ کے پاس آیا ، اور یہ دو شعر پڑھے :

آں روز کہ مہ شدی نمی دانستی
کانگشت نمائے عالمے خواہد شد

امروز کہ زلفت دلے خلقے بربود
در گوشہ نشست نمی دارد سود

سیر الاولیا میں ہے کہ یہ اشعار پڑھنے کے بعد اس نوجوان نے کہا :

اول مشہور نمی بایستے شد ، چوں ایں کس مشہور شد ، چناں سعی کند کہ در روز قیامت از روئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شرمندہ نگردد ، و از خلق گوشہ گرفتن (۱)
و بحق مشغول شدن سہل است ، اما مردانگی و کار مردی ! (۲)

آنست که خلوت در انجمن باشد و باوجود انبوہِ خلق و پیشغولی خلل نیفتد۔¹

(ترجمہ)

اول تو آپ کو مشہور نہ ہونا چاہیے تھا، جب آپ اس قدر مشہور ہو گئے ہیں تو اب آپ کو ایسی کوشش کرنی چاہیے کہ قیامت کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے سامنے شرمندگی نہ ہو۔ مخلوق سے دور ہو کر تنہائی اختیار کرلینا، اور حق میں مشغول ہوجانا آسان ہے، لیکن مردانگی اور مردوں کا کام یہ ہے کہ اُن کی خلوت انجمن میں ہو، اور باوجود خلقت کے ہجوم کے ان کی مشغولی میں کوئی فرق نہ پڑے۔

اخبارالاخیار میں خواجہ محبوب الٰہی کا بیان ہے کہ: وہ نوجوان جب یہ کہہ چکا تو میں اس کے لیے کھانا لایا، لیکن اس نے نہ کھایا، میں نے اسی وقت پختہ ارادہ کرلیا کہ اب میں غیاث پورہ سے کہیں نہ جاؤں گا، جب میں نے یہ نیت کی، تب اس نوجوان نے کھایا پیا، پھر میں نے اس نوجوان کو کبھی نہیں دیکھا۔ اس کے بعد آپ آخر عمر تک غیاث پورہ میں ہی رہے۔²

رشد و ہدایت:

سیر العارفین میں ہے کہ اکثر امرا جو فسق و فجور میں مبتلا تھے، آپ کی توجہ سے تائب ہو کر غیاث پورہ میں ہی رہنے لگے۔

---

(۱) سیر الاولیاء، ص ۱۱۰ ۔ سیر العارفین، ص ۲۵

(۲) اخبارالاخیار، ص ۵۶

سلطان المشائخ حضرت محبوب الٰہی کا ابتدائی زمانہ عہدِ غلاماں میں گزرا ۔ لیکن خلجیوں کے دور حکومت میں آپ کی غیرمعمولی شہرت ہوئی ۔ شاہان وقت آپ سے ملاقات اپنا شرف سمجھتے تھے ، لیکن آپ کسی سے ملنا پسند نہ فرماتے تھے ، سلطان جلال الدین خلجی نے کئی مرتبہ آپ سے ملاقات کی خواہش کی ، لیکن آپ نے ہمیشہ ٹال دیا ۔

سلطان علاء الدین آپ سے بے حد عقیدت رکھتا تھا ، یہ جلال الدین خلجی کے بعد تخت سلطنت پر متمکن ہوا بعض لوگوں نے اسے حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی سے بدگمان کرنے کی کوشش کی ۔ اور اس سے کہا کہ ملک میں حضرت محبوب الٰہی کی مقبولیت کسی وقت آپ کی سلطنت کے لیے خطرہ بن سکتی ہے ، اس نے امتحاناً اپنے بیٹے خضر خاں کے ہاتھ آپ کی خدمت میں ایک عریضہ بھجوایا ، آپ نے وہ خط بغیر پڑھے رکھ دیا ۔ اور فرمایا کہ ہم دعا کرتے ہیں اس کے بعد ارشاد فرمایا درویشوں کا بادشاہوں سے کیا کام ۔ میں ایک فقیر آدمی ہوں ، گوشہ نشین ہوں ۔ بادشاہ اور مسلمانوں کے لیے دعا کرتا ہوں ؟ اگر بادشاہ کو اس پر بھی کوئی اعتراض ہے ، تو میں یہاں سے چلا جاتا ہوں ؟ اللہ کی زمین وسیع ہے ، سلطان علاء الدین کو جب آپ کا یہ جواب معلوم ہوا تو وہ بہت خوش ہوا ، اور کہا کہ بدخواہ چاہتے ہیں کہ مجھے مردانِ خدا سے لڑا دیں ، اور اس طرح ملک تباہ ہوجائے ۔

ایک دفعہ کسی نے سلطان علاء الدین سے کہا کہ اس بے انتہا عقیدت کے باوجود جو آپ حضرت محبوب الٰہی سے رکھتے ہیں ۔ آپ نے کبھی ان سے ملاقات نہیں کی ؟ سلطان علاء الدین نے جواب دیا کہ : میں بادشاہ ہوں ۔ سر سے پاؤں تک دنیا میں آلودہ

ہوں ، اس آلودگی کی وجہ سے مجھے شرم آتی ہے کہ میں ان جیسی پاک ہستی کو دیکھوں ۔۱

آپ نے سلطان علاء الدین کے بعد جن بادشاہوں کا زمانہ دیکھا ان کے نام یہ ہیں ۔ قطب الدین مبارک شاہ ۔ خسرو خان ، سلطان غیاث الدین تغلق اور سلطان محمد تغلق ۔۲

تعلیمات :

خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی کے آئینۂ تصوف میں ہمیں شریعت و طریقت کا عکس ہم آہنگ نظر آتا ہے ۔ وہ اپنی تعلیمات میں زیادہ زور علم پر دیتے ہیں ، مرشد کے متعلق رہبری کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

پیر آنچناں باید کہ در احکام شریعت و طریقت و حقیقت عالم باشد ، و چوں ایں چنیں باشد ، او خود ہیچ نامشروع نفرماید ۔۳

(ترجمہ)

پیر ایسا ہونا چاہیے کہ جو احکام شریعت و طریقت و حقیقت کا عالم ہو ، اور جب وہ ایسا ہوگا تو وہ خود کسی نا مشروع بات کا حکم نہ دے گا ۔

صوفیائے کرام پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ وہ ترک دنیا کی تعلیم دے کر لوگوں کو راہبانہ زندگی کی ترغیب دیتے ہیں ۔ یہ اعتراض غلط فہمی پر مبنی ہے کیونکہ صوفیہ کا

---

(۱) بزم صوفیہ ، ص ۱۹۳ ۔
(۲) بزم صوفیہ ، ص ۲۰۲ تا ۲۰۸ ۔
(۳) فوائد الفواد ، ص ۱۴۷ ۔

مقصد ہرگز یہ نہیں کہ انسان کائنات کی نعمتوں سے مستفید نہ ہو، بلکہ اُن کا مقصد یہ ہے کہ وہ دنیا ضرور حاصل کرے لیکن دنیا کی محبت کو اپنے دل میں رچائے بسائے نہیں، حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی صوفیانہ نقطۂ نظر سے ترک دنیا کی وضاحت بے حد دل نشین انداز میں کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

ترکِ دنیا آں نیست کہ کسے خود را برہنہ کند مثلاً لنگوتہ بہ بندد، و بنشیند۔ ترکِ دنیا آنست کہ لباس بپوشد، و طعام بخورد، و آنچہ می رسد روا بدارد۔ و بجمع او میل نکند، و خاطر را متعلق چیزے ندارد۔[1]

(ترجمہ)

ترکِ دنیا کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی اپنے آپ کو برہنہ کرلے، اور لنگوٹا باندھ کر بیٹھ جائے، ترکِ دنیا کا مطلب یہ ہے کہ آدمی لباس بھی پہنے، اور کھائے بھی، اور حلال کی جو چیز اُسے پہنچے، اُسے روا رکھے، لیکن اُس کے جمع کرنے کی طرف رغبت نہ کرے اور اپنے دل کو اُس میں نہ لگائے۔

انھوں نے اپنی تعلیمات میں محبتِ الٰہی پر سب سے زیادہ زور دیا ہے، اپنے ایک مرید مولانا فخرالدین مروزی[2] کو انسان کی تخلیق کا مقصد بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

اتفاق اصحاب طریقت و ارباب حقیقت است کہ اہم مطلوب و اعظم مقصود از خلقتِ بشر محبتِ رب العالمین است۔[3]

---

(۱) فوائد الفوائد، ص ۹۔

(۲) مولانا فخرالدین مروزی: حافظ قرآن کریم تھے، زہد و تقویٰ سے آراستہ تھے، کلام مجید کی کتابت کرتے تھے، حضرت محبوب الٰہی سے بیعت تھے۔ (اخبار الاخیار، ص ۹۲)۔

(۳) سیرالاولیاء ص ۴۵۵–۴۵۴

(ترجمہ)

اصحاب طریقت اور ارباب حقیقت سب اس پر متفق ہیں
کہ انسان کی پیدائش کا اہم مطلوب اور مقصود
رب العالمین کی محبت ہے۔

صاحب سیرالاولیاء نے لکھا ہے کہ خود حضرت محبوب الٰہی کا محبت الٰہی میں یہ عالم تھا کہ وہ خدا کی طرف اس محویت کے ساتھ متوجہ رہتے تھے کہ گویا اس کو دیکھ رہے ہیں۔

تصوف کی بنیادی تعلیم خدمت خلق ہے، صوفیائے کرام کی زندگیاں خدمت خلق میں گزرتی تھیں، حضرت محبوب الٰہی کے آئینہؑ اخلاق میں محبت الٰہی، اتباع رسولؐ، خدمت خلق اور غربا پر شفقت کا عکس نمایاں نظر آتا ہے، ان کی ساری عمر ہمدردی اور مخلوق خدا کی خدمت گزاری میں گزری۔

اپنے مریدوں کو تلقین کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ قیامت کے بازار میں دلوں کو راحت پہنچانے سے زیادہ کسی چیز کی قدر نہ ہوگی۔[۱]

خواجہ عزیز الدین ایک دفعہ ایک دعوت میں شریک ہونے کے بعد حضرت محبوب الٰہی کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے ان سے پوچھا کہاں سے آرہے ہو، عرض کیا کہ میں ایک دعوت سے آرہا ہوں، اس دعوت میں لوگ کہہ رہے تھے کہ: شیخ نظام الدین کو بڑی فراغ باطنی حاصل ہے کہ انہیں اس جہان کا کوئی غم اور فکر نہیں ہے۔ حضرت محبوب الٰہی نے فرمایا کہ: جتنا غم و اندوہ مجھے ہے کسی کو اس دنیا میں نہ ہوگا، اس لیے کہ اتنی مخلوق میرے پاس آتی ہے، اور اپنا درد دکھ

(۱) سیرالاولیا، ص ۱۲۸۔

مجھ سے کہتی ہے ، ان سب کا بوجھ میری جان و دل پر پڑتا ہے، وہ عجب دل ہوگا کہ اپنے مسلمان بھائی کا غم سنے، اور اس پر اثر نہ ہو ۔۱

فرمایا کرتے تھے کہ دستور یہ ہے کہ لوگ نیک کے ساتھ نیک اور بد کے ساتھ بد ہوتے ہیں ، لیکن ہم درویشوں میں یہ دستور نہیں ۔ یہاں نیک و بد دونوں کے ساتھ نیک ہونا چاہیے ۔۲

سیرالاولیا میں ہے کہ حضرت محبوب الٰہی کی خانقاہ کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ، امیر و غریب ، جاہل و عالم ، بوڑھے اور جوان سب آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آپ سب کے ساتھ محبت سے پیش آتے ۔۳

تاریخ فیروز شاہی کے مؤلف ضیا برنی نے آپ کے متعلق لکھا ہے کہ : خدائے تعالیٰ نے شیخ نظام الدین کو پچھلی صدیوں میں شیخ جنید اور شیخ با یزید کے مثل پیدا کیا تھا ۔۴

مختصر یہ کہ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی کی ذات گرامی اسلامی اخلاق و اتباع شریعت کا مجسم نمونہ تھی ،

حضرت بابا فرید گنج شکر نے جب حضرت محبوب الٰہی کو خلافت سے سرفراز فرمایا تو آپ کے اوصاف و اخلاق پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا ۔

باری تعالیٰ ترا علم و عقل و عشق داده است و ہر کہ بدین صفت متصف باشد ، از او خلافت مشائخ نیکو آید ۔۵

---

(۱) تاریخ مشائخ چشت ، ص ۸۳ بحوالہ خیرالمجالس۔ مجلس سی و یکم
(۲) فوائد الفواد ، ص ۸۷ ۔
(۳) سیرالاولیا
(۴) تاریخ فیروز شاہی (ضیا برنی) ص ۳۳٦ ۔
(۵) تاریخ دعوت و عزیمت حصہ دوم ، ص ۱۲۳ ۔

(ترجمہ)

اللہ تعالیٰ نے تم کو علم و عقل و عشق سے نوازا ہے ،
اور جو ان صفات سے متصف ہوتا ہے ، وہ مشائخ کی
خلافت کی ذمہ داریاں نہایت خوبی سے ادا کرسکتا ہے ۔

وفات :

وفات سے چالیس روز پہلے حضرت محبوب الٰہی پر استغراق و تحیّر کی کیفیت طاری ہو گئی تھی ، نور تجلی سے آپ کا باطن معمور تھا ، اسی عالم میں آپ اپنے گھر میں تشریف لائے ، گریہ میں ترقی ہوئی ، روزانہ کئی مرتبہ استغراق کی کیفیت طاری ہو جاتی ، جب استغراق سے آنکھیں کھولتے تو فرماتے آج جمعہ کا دن ہے ، دوست کو دوست کا وعدہ یاد آتا ہے ، پھر فرماتے نماز کا وقت ہو گیا ہے ، اور میں نے نماز پڑھ لی ہے ؟ لوگ کہتے کہ آپ تو نماز ادا فرما چکے ہیں ، فرماتے پھر پڑھ لیں ، ہر نماز کو مکرر ادا کرتے ۔ بار بار فرماتے آج جمعہ کا دن ہے ، ہم نماز پڑھ چکے ہیں ، کبھی یہ مصرع پڑھتے :

می رویم و می رویم و می رویم

اسی زمانے میں جب کہ تمام مریدین اور خدام موجود تھے فرمایا تم سب گواہ رہنا کہ اگر اقبال خادم نے کوئی چیز بھی گھر کی جنس سے بچالی ہے ، تو قیامت کے دن اسے خدا کے سامنے جواب دینا ہوگا ۔ اسی بیماری میں کچھ احباب و خدمتگار حاضر ہوئے ، انہوں نے پوچھا کہ آپ کے بعد ہمارا کیا حال ہوگا ، فرمایا کہ یہاں اتنا ملتا رہے گا کہ جس سے تمہارا گزر ہو جائے ، لوگوں نے سوال کیا کہ ہم میں کون نصیبے والا ہوگا ، غالباً اس سے ان کی مراد جانشینی و خلافت سے تھی ، فرمایا جس کی قسمت یاوری کرے گی ۔ بعض خادموں نے میرے نانا مولانا شمس الدین دامغانی سے عرض کیا کہ وہ حضرت محبوب الٰہی سے دریافت کریں کہ ہر شخص نے

اپنے اپنے اعتقاد کے مطابق آپ کے احاطے میں بلند بلند عمارتیں بنالی ہیں ، اور ان سب کی خواہش یہ ہے کہ آپ اس کی بنائی ہوئی عمارت میں آرام فرمائیں ، اگر وہ وقت آپہنچا ہے تو آپ کو کس عمارت میں دفن کریں ؟ مولانا شمس الدین نے آپ سے دریافت کیا ، فرمایا کہ میں کسی عمارت میں دفن ہونا نہیں چاہتا ، میں جنگل میں آسودہ خاک ہونا چاہتا ہوں ، چنانچہ آپ کو باہر میدان میں دفن کیا گیا ، بعد میں سلطان محمد تغلق نے آپ کے مزار پر گنبد تعمیر کرایا ۔

وفات سے چالیس دن پہلے حضرت محبوب الٰہی نے غذا بالکل ترک فرمادی تھی ، یہاں تک کہ کھانے کی خوشبو بھی آپ کو پسند نہ آتی تھی ۔ اسی زمانے میں ایک مرید اخی مبارک آپ کے لیے مچھلی کا شوربہ لے کر آئے ، مریدین و خدام نے بہت کوشش کی کہ آپ تھوڑا سا نوش فرمالیں ۔ حضرت محبوب الٰہی نے پوچھا یہ کیا ہے؟ عرض کیا گیا تھوڑا سا مچھلی کا شوربہ ہے ، فرمایا اسے بہتے ہوئے پانی میں ڈال دو ، آپ نے اس میں سے بالکل تناول نہیں فرمایا ۔ میرے چچا سعید حسن نے عرض کیا کہ کئی دن سے آپ نے کچھ تناول نہیں فرمایا ، کمزوری بڑھتی جا رہی ہے ، فرمایا سعید ! جو حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملاقات کا مشتاق ہو ، اس سے اس دنیا میں کیسے کھانا کھایا جا سکتا ہے ۔

آخر ۱۸ ربیع الآخر ۷۲۵ھ (۲۵-۱۳۲۴ء) کو حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین دہلوی نے وفات پائی ، نماز جنازہ حضرت شیخ الاسلام رکن الدین نبیرہ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی نے پڑھائی ۔

اولاد :

حضرت محبوب الٰہی نے ساری عمر تجرد میں گزاری ، اس لیے آپ کی کوئی اولاد نہیں تھی ۔

خلفاء و مریدین :

آپ کے بعد سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے فیوض و برکات کو آپ کے جن خلفاء نے اس برصغیر پاک و ہند کے گوشے گوشے میں پھیلا دیا ، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں[1]:

(۱) مولانا شمس الدین یحیٰی ۔ (۲) شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی (۳) شیخ قطب الدین منور ہانسوی (۴) شیخ حسام الدین ملتانی (۵) مولانا فخر الدین زرادی (۶) مولانا علاء الدین نیلی (۷) مولانا برہان الدین غریب (۸) مولانا یوسف چندیری (۹) مولانا سراج الدین اخی سراج (۱۰) مولانا شہاب الدین ۔

مریدین میں جن کو خاص تقرب حاصل تھا ، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں (۱) خواجہ ابو بکر (۲) امیر حسن علا سجزی ، (۳) امیر خسرو (۴) خواجہ ضیاء الدین برنی (۵) مولانا فخر الدین مروزی (۶) خواجہ سالار وغیرہ ۔

مولانا فخر الدین مروزی کو حضرت محبوب الٰہی نے ایک خط میں لکھا کہ : اصحاب طریقت اور ارباب حقیقت کا اس پر اتفاق ہے کہ انسان کی پیدائش کا اہم مقصود رب العالمین کی محبت ہے[2]۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنی تالیف تاریخ دعوت و عزیمت حصہ دوم میں ، حضرت محبوب الٰہی کے متعلق لکھا کہ :

سرور عشق کا نتیجہ یہ تھا کہ شب کی خلوت اور رات کے راز و نیاز کے بعد جب دن میں تشریف لاتے تو بقول امیر خورد معلوم ہوتا کہ شراب چھلک رہی ہے[3]۔

---

(۱) آپ کی وفات کے حالات اور خلفاء و مریدین کی فہرست ، تاریخ دعوت و عزیمت حصہ دوم ، ص ۹۶ تا ۱۰۱ و ص ۱۵۰ سے ماخوذ ہے ۔

رات کی بیداری سے آنکھیں سرخ ہوتیں ، امیر خسرو نے یہی دیکھ کر کہا ہے :

تو شبانہ می نمائی بہ برِ کہ بودی امشب
کہ ہنوز چشم مستت اثرِ خمار دارد

اور اسی حرارتِ عشق اور سرور و سرمستی کا نتیجہ تھا کہ پیرانہ سالی میں برابر روزہ رکھتے ، ثقیل غذا ، طویل شب بیداری اور سخت مجاہدات کے باوجود ضعف و ناطاقتی ظاہر نہ ہوتی تھی ، اسّی سال سے عمر مبارک متجاوز ہونے کے باوجود چہرے پر وہی سرخی اور نشاط و انبساط کی وہی کیفیت پائی جاتی تھی جو جوانی میں رہی ہوگی ، بلکہ اس میں روز افزوں اضافہ تھا ۔[1]

آپ شریعت کے بیحد پابند اور اتباع رسول کا پیکر تھے ، اور اپنی تعلیمات میں سب سے زیادہ زور پابندیِ شریعت[2] اور اتباعِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر دیتے ۔ اپنے مریدوں سے فرمایا کرتے تھے :

استقامت می باید کہ بر متابعت رسول علیہ السلام والصلواۃ باشد ، و ہیچ مستحبے و آدابے فوت نہ شود

(ترجمہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کی پیروی و اتباع پر مضبوطی سے ثابت قدم رہنا چاہیے ، یہاں تک کہ کوئی مستحب اور آداب بھی فوت نہ ہونا چاہیے ۔

پیری و مریدی کے لیے شریعت کے علم کو لازمی قرار دیتے تھے ، تاکہ پیر خود بھی اس پر عامل ہو ، اور مریدوں کو بھی

---

(۱) سیرالاولیاء ، ص ۲۲۵ ۔

(۲) تاریخ مشائخ چشت ، ص ۳۳ بحوالہ سیرالاولیاء ، ص ۲۵۵-۲۵۴

خلاف شرع امور سے روکے - ایک روز پیر کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا :

پیر آنچناں باید کہ در احکام شریعت و طریقت و حقیقت عالم باشد ، و چوں این چنیں باشد او خود ہیچ نا مشروع نہ فرماید ۔

(ترجمہ)

پیر ایسا ہونا چاہیئے کہ احکام شریعت و طریقت و حقیقت کا عالم ہو ، جب ایسا ہوگا تو وہ کسی خلاف شرع کام کے لیئے نہ کہے گا۔

(۱) تاریخ دعوت و عزیمت حصہ دوم ، ص ۱۰۴ تا ۱۰۵ ، بحوالہ سیرالاولیاء ، ص ۱۲۸ ۔

۲۱

حضرت امیر خسروؒ

حضرت امیر خسرو کے متعلق علامہ اقبال کا تاثر

حضرت امیر خسرو ان بزرگوں میں ہیں کہ جن کے سوز و گداز سے متاثر ہو کر علامہ اقبال نے خدائے تعالیٰ سے دعا کی ہے کہ خدائے تعالیٰ انہیں اپنی نعمتوں کے خزانے سے سوز خسرو عطا فرمائے؛ ارمغان حجاز میں اس تمنا کا اظہار کرتے ہوئے یوں نغمہ سرا ہیں :

عطا کن شور رومی، سوز خسرو
عطا کن صدق و اخلاص سنائی

چناں با بندگی در ساختم من
نہ گیرم گر مرا بخشی خدائی[1]

وہ نگاہ سطح بیں کو حقیقت کی طرف موڑتے ہیں، اور ایبک و غوری کی فتوحات اور معرکوں کو فانی، اور نوائے رومی اور نغمۂ خسرو کو لافانی اور سدا بہار قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں :

ہر اک مقام سے آگے گزر گیا مہِ نو
کمال کس کو میسر ہوا ہے بے تگ و دو

نفس کے زور سے وہ غنچہ وا ہوا بھی تو کیا
جسے نصیب نہیں آفتاب کا پر تو

رہے نہ ایبک و غوری کے معرکے باقی
ہمیشہ تازہ و شیریں ہے نغمۂ خسرو[2]

---

(۱) ارمغان حجاز، ص ۱۲۸

(۲) بال جبریل، ص ۱۰۷

حالات :

حضرت امیر خسرو کا نام ابوالحسن لقب یمین الدین اور تخلص خسرو ہے - ان کے والد محترم امیر سیف الدین محمود ترکستان کے شہر کش[1] کے رہنے والے تھے اور مغلوں کے یلغار کے زمانے میں وہ وہاں سے فرار ہو کر ہندوستان کے ایک شہر پٹیالی عرف موسن آباد ضلع ایٹہ (یو۔ پی) میں آ کر سکونت پذیر ہو گئے تھے ، انھوں نے فارسی کی قدیم کتابوں اور شاعری کا گہرا مطالعہ کیا ، یہاں تک کہ فارسی میں غیر معمولی رسوخ اور ملکہ حاصل کرلیا -

''خسرو شیریں زبان'' میں اقبال صلاح الدین صاحب نے بحوالہ بدخشانی لکھا ہے کہ ان کے والد امیر سیف الدین محمود کو فوجی خدمات کے صلے میں امیر کے لقب سے نوازا گیا ، اور پٹیالی میں جاگیر عطا کی گئی -

امیر خسرو کے نانا عماد الملک تھے ، جو ایک بڑے معزز اور مفتخر خاندان کے فرد تھے ، یہ سلطان شمس الدین التمش کے زمانے میں کسی بڑے عہدے پر فائز تھے ۔ دیوان غرۃ الکمال کے دیباچے میں خود امیر خسرو نے عماد الملک کی مختلف حیثیتوں پر روشنی ڈالی ہے ۔ اور ان کی عمر ایکسو تیرہ سال بتائی ہے -

عماد الملک کی صاحبزادی کے بطن سے امیر سیف الدین محمود کے تین صاحبزادے پیدا ہوئے ، بڑے کا نام عزالدین علی شاہ ، منجھلے کا نام خسرو اور چھوٹے کا نام حسام الدین قتلغ تھا -

ولادت :

امیر خسرو ۶۵۱ھ (۵۴ - ۱۲۵۳ء) ہندوستان ہی میں پیدا ہوئے ، جیسا کہ خود انھوں نے ''مثنوی نہ سپہر'' میں اپنا مولد و ماوی

---

(۱) کش : ماوراء النہر میں جرجان سے تین فرسنگ کے فاصلے پر ہے (میخانہ عبدالنبی ، ص ۵۹) حاشیہ نمبر ۱-

ہندوستان کو بتایا ہے ۔ دیباچہ دیوان غرّۃ الکمال میں بھی انھوں نے اپنے ہندوستانی نژاد ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے

ترک ہندوستانیم ہندوی گویم چو آب

ان کی خود اس داخلی شہادت کے بعد والہ داغستانی کا یہ بیان کہ وہ اپنے والد کے ہمراہ ترک وطن کر کے اس برصغیر میں آئے تھے، بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔

امیر خسرو کی عمر آٹھ سال کی تھی کہ ان کے والد کا سایۂ شفقت ان کے سر سے اٹھ گیا وہ ایک مرثیے میں اپنے والد کی وفات پر نوحہ کناں ہوتے ہوئے فرماتے ہیں

سیف از سرم گزشت و دلِ من دو نیم ماند
دریای من روان شد و دُرّمِ یتیم ماند

تعلیم و تربیت :

امیر خسرو کے والد بڑے صاحب علم و فضل بزرگ تھے، ان کے نانا عماد الملک معارف نواز اور علم پرور امیر تھے۔ اس علمی ماحول نے خسرو کے قلب میں ذوقِ علم کے چراغ کو روشن کیا، اور انھوں نے بھی مروّجہ علوم و فنون بڑی توجہ سے حاصل کیے، چنانچہ ڈاکٹر رضا زادہ شفق نے لکھا کہ :

بہمان طور کہ پدرش از اہلِ فضل بود، خودش نیز بتحصیلِ علوم و فنون پرداخت۔

یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ امیر خسرو مختلف زبانوں سے واقف تھے۔ فارسی۔ ترکی، ہندی، سنسکرت اور عربی سے واقفیت پر ان کی تصانیف میں ہمیں داخلی شہادتیں ملتی ہیں۔ مثنوی نہ سپہر، وسط الحیواۃ، اعجاز خسروی، دیباچۂ غرّۃ الکمال، ان کی مندرجہ بالا زبانوں سے واقفیت کے قراین فراہم کرتے ہیں، ان کی ہندوی زبان سے واقفیت کی دلیل خود ان کی ہندی شاعری ہے۔

شاعری :

خسرو کی شاعری کی ابتدا کب ہوئی ، اور انھوں نے کس عمر میں شعر کہنا شروع کیا ، اس کے ثبوت میں ہم خسرو کی تصانیف سے خود ان کا بیان پیش کرتے ہیں ، انھوں نے اپنے دیوان تحفۃ الصغر کے دیباچے میں لکھا کہ :

در آں سن کہ دندان من افتاد سخن می گفتم

(ترجمہ)

میں اس وقت سے شعر کہہ رہا ہوں ، جس زمانے سے میرے دودھ کے دانت گر رہے تھے ۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابتداءً سلطانی تخلص کرتے تھے ، چنانچہ ان کے پہلے دیوان تحفۃ الصغر میں یہ تخلص اکثر غزلوں میں موجود ہے ۔

تحفۃ الصغر کے دیباچے میں اپنی شاعری کی ابتدا کی داستان کو بیان کرتے ہوئے لکھا کہ :

میں بارہ سال کا تھا ، مختلف قسم کی شاعری کی بنیاد میرے دماغ میں مستحکم ہوگئی ، جب اس زمانے کے شاعروں اور علماء نے فن شعر میں میری مہارت دیکھی تو وہ حیران رہ گئے ، ان کی یہ حیرانی میرے لیے مزید فخر کا باعث ہوئی ...... مجھے اپنی دلکش فن کا اتنا خبط ہو گیا تھا کہ صبح سے شام تک قلم کی طرح میرا سر جھکا رہتا ، اور رات دن میری آنکھیں اوراق کی سیاہی اور سفیدی پر جمی رہتی تھیں ، تاکہ میں عقل و دانش اور ذوق صحیح میں شہرت حاصل کرسکوں ، کبھی کبھی میرے ہمعصر استاد میرے ہنر کی آزمائش کیا

کرتے تھے ۔ اور میں اپنا کلام ان کے سامنے ان کو
زبانِ قلم کی فصاحت سے دکھایا کرتا تھا ، چونکہ
کسی ایسے مشہور استاد نے میری تربیت نہ کی تھی جو
مجھے شاعری کے رموز و حقائق بتا سکتا اور میرے قلم
کو گمراہی کے رستے پر پڑنے سے روک سکتا ، یا اس
خوبی کو نمایاں کرسکتا ، جو میری برائیوں میں دبی
پڑی تھی ، اس لیے میں نے کچھ عرصے کے لیے وہی
کیا جو طوطے کو بولنے کے لیے کیا جاتا ہے ، یعنی میں
نے اپنے سامنے خیال کے آئینے کو رکھا ، اور ان شکلوں
سے جن کا عکس اس آئینے میں پڑتا رہا ۔ میں نے شاعری
سیکھنا شروع کی ، اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے دماغ
کے آئینے کو صیقل کوشش سے چلا دی ، اور ان مختلف
انواعِ شعر کا مطالعہ کیا ، جو قوتِ تخیل سے پیدا ہوسکتے
ہیں ، اور بڑے بڑے اساتذہ کے کلام کو برابر دیکھتا
رہا ، ان کے کلام میں جہاں کہیں مجھے شیرینی نظر آئی ،
میں نے لے لی ، اور اس طرح آخرکار شاعری کا حقیقی ذوق
مجھے حاصل ہوگیا ۔ جب میں نے انوری[1] اور سنائی
کے کلام کو پڑھا تو میرا دل اور میری آنکھیں

---

(۱) انوری : کا نام اوحد الدین محمد ، تخلص انوری تھا ، چھٹی صدی ہجری کے اوائل میں وہ قصبۂ مہنہ نواح خاوران میں پیدا ہوئے ، سلطان سنجر سلجوقی کے ہمعصر تھے ۔ ۵۴۸ھ میں جب ترکان غز نے سلطان سنجر کو مغلوب کر کے قید کر لیا تو انوری نے فرار ہو کر جان بچائی ، اور خراسان کے شہروں میں پناہ لی ، وہ شہر مرو سے نیشاپور آئے ، پھر دوبارہ بلخ گئے اور وہیں ۵۸۷ھ (۹۲--۱۱۹۱ء) میں وفات پائی (ماخوذ از بزرگانِ ایران ، ص ۱۹۲ -- ۱۱۹۱ء)

اور جہاں کہیں بھی مجھے کوئی نظم آبِ زر کی طرح چمکتی ہوئی دکھائی دی، میں نے جوئے رواں کی طرح اس کا پیچھا کیا، جو دیوان بھی مجھے مل سکا، میں نے نہ صرف اس کا مطالعہ کیا بلکہ اس کی نقل بھی اپنے کلام میں ضرور کی۔

خسرو نے اس اقتباس میں اپنی ابتدائی سخن گوئی پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ اس اقتباس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ شاعری میں وہ تلمیذ رحمٰن تھے، اور انھوں نے کسی سے اصلاح نہیں لی تھی۔ شاعری میں ان کا طرز عمل اس کی بھی رہنمائی کرتا ہے کہ ایک شاعر کے شعری رفعت اور بلندی کے لیے اساتذہ کے کلام کا مطالعہ کس قدر ضروری ہے، اس سے اس کا بھی پتا چلتا ہے کہ انوری اور سنائی کے مطالعے نے ان کی شاعری کو نکھارا اور سنوارا ہے۔

نانا کی وفات:

امیر خسرو اپنے نانا کی وفات حسرت آیات کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے تاثر کو اس طرح قلم بند کرتے ہیں:

بیست سالہ بودم کہ بزرگ صد و سیزدہ سالہ شد، و در بہشت کہ ہزار سالہ راہ بود بیک نفس برسید، زہی قدم کہ در دم زدنی ہزار سالہ راہ چشم پیش کردہ برود۔(۱)

(ترجمہ)

میں بیس سال کا تھا کہ ایکسو تیرہ سال کے بزرگ (عمادالملک) نے بہشت کی ایک ہزار سالہ راہ ایک لمحے میں طے کی، مبارک ہیں وہ قدم کہ چشم زدن میں ایک سال کی راہ طے کر کے پہنچتے ہیں۔

(۱) خسرو شیریں زبان، ص ۳۲-۳۳

عماد الملک نے ۱۷۲ھ (۳-۱۲۷۲ء) میں وفات پائی ۔ اس وقت امیر خسرو کی عمر بیس سال کی تھی ۔

بیعت :

جب امیر خسرو کے نانا عماد الملک اور آن کے والد بزرگوار امیر سیف الدین لاچین اور آن کا پورا خاندان حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی کی بیعت سے مشرف ہوا تو اپنے خاندان کے ساتھ ہی امیر خسرو آٹھ سال کی عمر میں حضرت محبوب الٰہی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے ۔[1]

اقبال صلاح الدین صاحب نے اپنی تالیف ''خسرو شیریں زبان'' میں اس کو بیعت اول قرار دیتے ہوئے لکھا کہ جب امیر خسرو کے والد اندر جانے لگے تو حضرت امیر خسرو نے آن سے دریافت کیا کہ آپ مجھے کہاں لیے جاتے ہیں ؟ انھوں نے فرمایا کہ میں تمھیں حضرت سلطان المشائخ کا مرید کرانے لایا ہوں، امیر خسرو نے اپنے والد سے کہا کہ پیر کا پسند کرنا میرا فعل ہے ، نہ کہ آپ کا ۔ امیر خسرو کے والد یہ سن کر ان کو دروازے پر چھوڑ گئے ، امیر خسرو نے دروازے پر بیٹھے بیٹھے یہ رباعی کہی :

تو آں شاہی کہ بر ایوانِ حضرت
کبوتر گر نشیند باز گردد
غریبے مستمندے بر در آمد
بیاید اندروں یا باز گردد

اور دل میں خیال کیا کہ اگر پیر روشن ضمیر ہیں تو وہ اس کا جواب دیں گے ، ورنہ میں دروازے ہی سے لوٹ جاؤں گا ۔

---

(۱) خسرو شیریں زبان ، ص ۸۰ تا ۸۱ بحوالۂ تذکرۂ اولیائے ہند و پاکستان ، ص ۱۲۱ ۔

اُن کے والد کے تھوڑی دیر پہنچنے کے بعد حضرت سلطان المشائخ نے ایک رباعی لکھ کر اپنے خادم کو دی، اور فرمایا دیکھو دروازے پر ایک بچہ بیٹھا ہے ، تم یہ رباعی اس کے پاس جا کر پڑھو ، رباعی یہ تھی :

بیا یدے اندرون مرد حقیقت
کہ با ما یک نفس ہمراز گردد
اگر ابلہ بود آں مرد ناداں
ازاں را ہے کہ آمد باز گردد

خادم نے جب یہ رباعی امیر خسرو کے سامنے آکر پڑھی تو وہ اندر گئے ، اور جا کر فوراً مرید ہو گئے ۔[1]

بیعت اول کے بعد وہ وقتاً فوقتاً سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے ۔ ڈاکٹر وحید مرزا کا بیان ہے کہ امیر خسرو ۶۷۱ھ (۷۳-۱۲۷۲ء) میں باقاعدہ مرید ہوئے اور تجدید بیعت کی ، لیکن انہوں نے اپنے اس قول کے لیے کوئی دلیل پیش نہیں کی ۔[2] نفحات الانس میں ہے کہ :

سلطان مبارک شاہ خلجی کی وفات کے بعد امیر خسرو ، شیخ نظام الدین اولیا کی خدمت میں رہنے لگے ، اور ریاضتوں اور مجاہدوں میں مشغول ہو گئے ، کہتے ہیں چالیس سال تک صائم الدہر رہے ، اور کہتے ہیں کہ حضرت شیخ نظام الدین کے ہمراہ بطریق طی ارض حج کیا ، اور پانچ مرتبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خواب میں زیارت کی ۔[3]

---

(۱) خسرو شیریں زباں ، ص ۸۰ تا ۸۱ ۔
(۲) خسرو شیریں زباں ، ص ۸۱ تا ۸۲ ۔
(۳) نفحات الانس اُردو ترجمہ ، ص ۴۶۵ ۔

پیر و مرید کی محبت :

رفتہ رفتہ مرشد اور مرید میں عقیدت و محبت کا اتنا گہرا تعلق ہوا کہ :

ہم میں تم اور تم میں ہم گم ہوگئے
ہوتے ہوتے ایک ہم تم ہوگئے

(بابا ذہین شاہ تاجی)

میخانہ' عبد النبی کے حواشی میں بحوالہ' سیر الاولیاء منقول ہے کہ جس زمانے میں سلطان المشائخ راوت عرض کے گھر میں جو امیر خسرو کی ماں کے دادا تھے مندہ پل کے قریب مقیم تھے اسی زمانے میں امیر خسرو نے شاعری شروع کی تھی ، وہ جو نظم کہتے آتے پہلے سلطان المشائخ کی نظر سے گزرانتے ، ایک روز سلطان المشائخ نے ان سے فرمایا میاں ! صفاہانیوں کے طرز پر کہو ، یعنی عشق انگیز و زلف و خال آمیز ۔ اسی روز سے امیر خسرو نے اس طرز پر کہنا شروع کیا ، اور اس نوع کی شاعری کو انتہائے کمال پر پہنچا دیا ؛ بعد میں انھوں نے اپنا ابتدائی اور آخری دیوان قاضی معز الدین پایچہ کے ذریعے سے جو سولانا رفیع الدین پایچہ کے والد تھے ، یہ دونوں مکمل دیوان سلطان المشائخ کی نظر سے گزرانے ۔ اور شعر کے رموز و نکات آپ سے معلوم کیے ، یہاں تک کہ وہ اپنے عہد کے شعرا میں اس دور کے مختلف فرمانرواؤں کے درباروں سے منسلک رہے ۔

سلطان المشائخ حضرت محبوب الٰہی سے امیر خسرو کو اس قدر محبت اور عقیدت تھی کہ وہ محبوب الٰہی کے محرم اسرار قرار پائے ۔ ایک روز انھوں نے حضرت سلطان المشائخ کی مدح میں کچھ شعر آپ کی خدمت میں پیش کیے ، حضرت محبوب الٰہی نے خوش ہو کر فرمایا کہو کیا چاہتے ہو؟ چونکہ وہ شاعری کو مطمح نظر بنائے ہوئے تھے ، عرض کیا کہ میں شیرینیِ سخن کا خواستگار ہوں ، فرمایا وہ شکر کا طشت جو چارپائی کے نیچے رکھا ہے ، اٹھا کر لاؤ ، اور

اپنے سر پر نثار کرو ۔ اور کچھ اس میں سے کھالو ۔ امیر خسرو نے ایسا ہی کیا ، آخر اُن کے سخن کی شیرینی و حلاوت مشرق سے مغرب تک پھیلی ، اور وہ قدیم اور متاخر شعرا کے لیے باعث افتخار ہوئے ، اس طرح وہ درخواست جو انھوں نے سلطان المشائخ سے کی تھی مقبول ہوئی ۔ کہتے ہیں کہ امیر خسرو کو تمام عمر اس کا افسوس رہا کہ انھوں نے اس قبولیت کے وقت میں اس سے بہتر کوئی چیز کیوں نہ طلب کی ، اجابت دعا کا یہ اثر تھا کہ اُن کی تصانیف سے ان کا کتب خانہ بھر گیا ، جب وہ کوئی تصنیف مکمل کرلیتے تو اسے سب سے پہلے حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں پیش فرماتے ، حضرت سلطان المشائخ اسے ہاتھ میں لے کر فرماتے کہ ہم نے اس پر فاتحہ پڑھ دی ، پھر امیر خسرو کو واپس فرمادیتے ، کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ اسے کھولتے چند سطریں پڑھتے ، اور فرماتے یہ بھی امیر خسرو کے کمال حال کے لیے ہے ، تاکہ وہ فن شعر پر فریفتہ نہ ہو ، اور اس کے بعد اس سے بہتر کام کرے ۔

امیر خسرو کا اکثر وقت عبادت و ریاضت میں گزرتا تھا ، اُن کا معمول تھا کہ ہر شب میں تہجد کے وقت سات پارے کلام اللہ کے پڑھتے ۔ ایک روز سلطان المشائخ نے اُن سے پوچھا ترک ! تمھاری مشغولیت کا کیا عالم ہے ؟ امیر خسرو نے عرض کیا مخدوم من رات کے پچھلے پہر مجھ پر گریہ کا غلبہ ہوتا ہے ، فرمایا : الحمد للہ اب تم پر زندگی کی حقیقت منکشف ہونے لگی ۔

امیر خسرو کی انتہائی سعادت و خوش نصیبی یہ ہے کہ حضرت سلطان المشائخ نے انھیں کئی خطوط اپنے ہاتھ سے لکھے ہیں ، امیر خسرو اُن کی بارگاہ میں اس قدر مقرب تھے کہ وہ جب چاہتے آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتے ، اور آپ تمام اہم امور میں اُن سے مشورہ فرماتے ، اگر کوئی خادم یا مرید آپ سے کچھ

درخواست کرنا چاہتا تو امیر خسرو کے توسط سے وہ اپنی درخواست پیش کرتا۔

اُن عنایتوں اور شفقتوں کو جو حضرت سلطان المشائخ کی امیر خسرو پر مبذول تھیں، امیر خسرو نے انھیں ایک کتاب کی صورت میں جمع کیا تھا۔ غالباً محشّی میخانہ عبد النبی کی مراد اس سے سلطان المشائخ کے وہ ملفوظات ہیں جو امیر خسرو نے افضل الفوائد کے نام سے جمع کیے تھے۔

غالباً ان ہی ملفوظات کے حوالے سے محشّی میخانہ عبد النبی گلچین معانی نے نقل کرتے ہوئے لکھا کہ: ایک بار سلطان المشائخ نے مجھ (امیر خسرو) سے فرمایا کہ میں ہر ایک سے تنگ آجاتا ہوں، لیکن تجھ سے کبھی تنگ نہیں ہوتا۔

ایک روز سلطان المشائخ نے مجھ سے فرمایا میرے لیے دعا کرو کہ تیری بقا میری بقا پر موقوف ہے؛ لوگوں کو چاہیے کہ وہ تجھے میرے پہلو میں دفن کریں، یہ بات آپ نے بار بار کہی، تاکہ یہ بات لوگوں کو یاد رہے، پھر فرمایا انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔

امیر خسرو کو محمد کاسہ لیس اور ترک اللہ کا خطاب:

امیر خسرو نے اُن خطابات کی تفصیل دیتے ہوئے جو بارگاہِ سلطان المشائخ سے آپ کو ملے اپنے جمع کردہ ملفوظات افضل الفوائد میں لکھا ہے کہ: ایک روز میں نے سلطان المشائخ کی زبانِ مبارک سے سنا کہ فرماتے تھے کہ آج رات سروش غیبی نے مجھ سے کہا کہ خسرو، درویشوں جیسا نام نہیں، آیندہ خسرو کو "محمد کاسہ لیس" کے نام سے پکارو۔ خسرو کہا کرتے تھے کہ یہ خطاب مجھ کو غیب سے ملا ہے۔

امیر خسرو بیان کرتے ہیں کہ میرے شیخ نے مجھ کو ترک اللہ کا خطاب اپنے دست مبارک سے لکھ کر دیا تھا ، میں اس فرمان مبارک کو حرز جان بنائے ہوئے ہوں ، تاکہ میرے دفن کے وقت اس کو میرے ساتھ دفن کیا جائے ، اور قیامت کے دن یہ کاغذ میرے لیے حق تعالیٰ کے سامنے مغفرت کا باعث ہو۔[1]

ایک روز سلطان المشائخ نے امیر خسرو کو طلب فرما کر آن سے فرمایا کہ رات میں نے ایک خواب دیکھا ، تم بھی سنو ، میں جمعہ کی رات کو خواب دیکھتا ہوں کہ شیخ صدر الدین بن شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی علیہ الرحمہ تشریف لائے ، میں ان کی انتہائی تعظیم و تکریم بجا لایا ہوں ، اور وہ خود بھی نہایت تواضع سے میرے ساتھ پیش آئے اسی اثنا میں میں نے دیکھا کہ خسرو! تم دور سے چلے آرہے ہو ، جب تم میرے پاس آئے تو معرفت کے رموز و حقائق بیان کرنے لگے ، اسی عرصے میں صالح موذن نے فجر کی اذان دی ، اور میں خواب سے بیدار ہو گیا ، اس خواب کے بیان کرنے کے بعد فرمایا دیکھو یہ کتنا بلند مرتبہ ہے ، مجھ پر گریہ و زاری طاری ہو گیا ، میں نے عرض کیا کہ میں غریب اس بلند مرتبے کے کہاں قابل ہوں ، یہ سن کر آپ کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے ، اور بلند آواز سے رونے لگے ۔ پھر آپ نے اپنی خاص ٹوپی منگوائی ، مجھے پہنائی ، اور فرمایا کہ تمھیں چاہیے کہ بزرگوں کے ارشادات کو ہمیشہ پیش نظر رکھو۔[1]

روحانی تربیت:

حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی کی روحانی تربیت نے حضرت امیر خسرو میں عشق الٰہی کی وہ سوزش پیدا کی تھی کہ

---

(۱) یہ تمام واقعات حواشی میخانہ عبدالنبی ، حواشی ص ۶۷ تا ص ۶۹ سے ماخوذ ہیں ۔

مرشد ان کی سوزشِ عشق کو اپنے لیے سرمایۂ افتخار سمجھتے تھے ، فرمایا کرتے تھے کہ :

روزِ قیامت از ہر کس خواہند پرسید کہ چہ آوردی ؟ از من پرسند خواہم گفت کہ سوز سینۂ ایں تُرک اللہ ۔[1]

(ترجمہ)

قیامت کے دن ہر ایک سے پوچھا جائے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے ؟ جب مجھ سے پوچھیں گے تو میں کہوں گا اس اللہ کے تُرک کے سینے کا سوز ۔

حضرت امیر خسرو کا اپنے مرشد سے والہانہ عشق اور عقیدت کا یہ عالم تھا کہ باوجود امیر کبیر ہونے کے وہ اپنے مرشد کی خدمت میں ایک ادنیٰ خادم کی طرح نظر آتے ہیں ، کبھی وہ ایک شاعر ہونے کی حیثیت سے اپنی غزلیں مرشد کو سناتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ، کہیں وہ اپنے مرشد کے کفش بردار نظر آتے ہیں ، اور لاکھوں روپے دے کر ایک درویش سے اپنے شیخ کی جوتیوں کو خریدتے ہیں ، اور ان جوتیوں کو اپنے سر پر رکھ کر اپنے شیخ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں ، اور عرض کرتے ہیں کہ :

درویش بر ہمیں اکتفا کرد ، ورنہ اگر تمام جان و مال من بعوض ایں کفش طلب می کرد ، حاضر می کردم ۔[2]

(ترجمہ)

درویش نے ان ہی (پانچ لاکھ ٹنکوں) پر اکتفا کیا ، ورنہ

---

(۱) سفینۃ الاولیا ، ص ۱۶۰ و اردو ترجمہ ص ۱۳۵ - ۱۳۶ -

(۲) سفینۃ الاولیا ، ص ۱۳۶ -

اگر وہ میرا تمام مال اور میری جان ان جوتیوں کے عوض مانگتا تو میں حاضر کر دیتا۔

سفینتہ الاولیا میں ہے کہ پھر وہ ان جوتیوں کو سر پر رکھ کر حضرت محبوب اللٰہی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضرت محبوب اللٰہی سے سارا واقعہ بیان کیا، حضرت محبوب اللٰہی نے فرمایا خسرو! تم نے سستے خرید لیے۔[1]

حضرت سلطان المشائخ، امیر خسرو سے اس درجہ محبت فرماتے تھے کہ ایک روز فرمایا: اگر شریعت میں ممانعت نہ ہوتی تو میں وصیت کرتا کہ:

او را در قبر من دفن نمایند، تا ہر دو یک جا باشیم۔[2]

(ترجمہ)

(خسرو) کو میری قبر میں دفن کیا جائے، تا کہ دونوں یک جا رہیں۔

آخر میں وصیت فرمائی کہ:

امیر خسرو بعد از من نخواہد زیست، چون رحلت کند، پہلوئے من دفن کنند کہ او صاحب اسرار من است، و من بے او قدم در بہشت نہ نہم۔[3]

---

(۱) سفینتہ الاولیا، ص ۱۰۳۔

(۲) ایضاً

(۳) خزینتہ الاصفیا، جلد اول، ص ۳۴۱۔

(ترجمہ)

امیر خسرو میرے بعد زندہ نہ رہیں گے جب وہ رحلت کریں تو میرے پہلو میں دفن کر دینا کہ وہ میرے صاحبِ اسرار ہیں ، اور میں اُن کے بغیر بہشت میں قدم نہ رکھوں گا ۔

ایک شعر میں ارشاد فرمایا

گر برائے ترکِ تُرکم ارّہ بر تارک نہند
ترکِ تارک گیرم و ہرگز نگیرم ترکِ تُرک

افضل الفوائد کے مرتب کرنے کے بعد ، جب وہ ملفوظات حضرت امیر خسرو نے اپنے مرشد حضرت محبوب الٰہی کی خدمت میں بنظرِ اصلاح پیش کیے تو اُس وقت حضرت محبوب الٰہی نے جو امیر خسرو کے متعلق تبصرہ فرمایا ، وہ حضرت امیر خسرو کی غیر معمولی صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے ، جہاں یہ تبصرہ ان کے متعلق اصل حقیقت کو واضح کرتا ہے ، وہیں حضرت امیر خسرو سے حضرت محبوب الٰہی کے قلبی تعلق اور شفقت کو بھی ظاہر کرتا ہے جو حضرت محبوب الٰہی کو اُن سے تھا ، خود حضرت امیر خسرو نے اس واقعہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا کہ :

ستائیسویں تاریخ ماہِ جمادی الاخریٰ کو حضور کی پا بوسی کی دولت حاصل ہوئی، اُس روز بندے نے چند جزو کاغذ کے جس میں خواجہ داستان کے الفاظِ دُر بار ، گوہر نثار لکھے ہوئے تھے مخدوم عالمیان کی نظر مبارک کے سامنے رکھے ، اور عرض کی کہ آج تک یہ بیچارہ جو کچھ زبان فیض بیان مخدوم سے سنتا رہا ہے ، جہاں تک فہم و ادراک یاری دیتا ہے ، اس کو لکھ لیتا ہوں ،

اور ''افضل الفوائد'' نام رکھا ہے ۔ جب بندے نے یہ عرض کی تو جزوں کو دست مبارک میں لے کر ملاحظے سے مشرف فرمایا ، فرماتے تھے کہ خوب لکھا ہے اور عمدہ نام رکھا ہے ، اور جہاں کہیں بندے سے کوئی بات رہ گئی تھی اپنے دستِ مبارک سے اس کو صحیح کرتے جاتے تھے ۔

بعد ازآں حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا کہ خسرو سے یہ بہت ہے کہ اس قدر فوائد قلم بند کیے ہیں ۔ اس سبب سے کہ وہ ہر وقت سر تا پا بحرِ معانی میں غرق رہتا ہے ، لیکن حق سبحانہ تعالیٰ نے خسرو کے تمام اعضا عقل و فضل سے گوندھے ہیں کیوں کہ وہ تمام دن بحرِ معانی میں شناوری کرتا ہے اور صد ہزار دُرِّ معانی نکال کر زیبِ قرطاس کرتا ہے ۔

حضرت سلطان المشائخ نے امیر خسرو کی تعریف میں اپنی ایک رباعی میں ان کو اقلیم سخن کا تاجدار کہہ کر اِن کی فنی عظمت کو اس طرح نمایاں کیا ہے :

خسرو کہ بہ نظم و نثرش کم خواست
ملکِ است کہ ملکِ سخن خسرو راست

ایں خسروِ ماست ناصر خسرو[1] نیست
زیرا کہ خدائے ناصرِ خسروِ ماست

---

(۱) حکیم ناصر خسرو : بن حارث قبادیانی ۳۹۴ھ قصبہ قبادیان حوالیِ بلخ میں پیدا ہوا ، اور تحصیلِ علم اور تحقیقِ ادیان و عقائد میں مشغول ہو گیا ، یہاں تک کہ مقام دانش پر فائز ہوا ، اس نے محمود اور مسعود غزنوی کے دربار بھی دیکھے تھے ،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۹)

حضرت محبوب الٰہی کو حضرت امیر خسرو سے اس قدر محبت تھی جیسا کہ ہم گزشتہ اوراق میں ذکر کر آئے ہیں کہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ اگر شریعت میں ممانعت نہ ہوتی تو میں وصیت کرتا کہ:

او را در قبر من دفن نمایند، تا ہر دو یک جا باشیم۔[۱]

(ترجمہ)

(خسرو) کو میری قبر میں دفن کیا جائے تا کہ دونوں یک جا رہیں۔

پھر آخر میں وصیت فرمائی کہ:

امیر خسرو بعد از من نخواہد زیست، چون رحلت کند،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۸)

بعد میں سلجوقی دربار میں خدمت دیوانی اور دبیری پر مقرر ہوا، اس نے جوانی میں ہندوستان، افغانستان اور ترکستان کا بھی سفر کیا تھا اور اپنا سفر نامہ بھی ترتیب دیا تھا، ان سفروں کے بعد وہ بلخ آیا، اور عقاید اسماعیلی کی تبلیغ کرنے لگا، جس کی وجہ سے علماء اہل سنت اس کے مخالف ہو گئے، اور سلجوقی فرمانروا بھی اس سے برہم ہو گئے جس کی وجہ سے اسے شہروں شہروں مارا مارا پھرنا پڑا، اس پریشان مسافرت میں بھی اس نے کتاب زاد المسافرین لکھی، اس کے علاوہ اس کی تصانیف میں دلیل المتحیّرین، روشنائی نامہ، سعادت نامہ اور دیوان اشعار ہے۔ ناصر خسرو نے ۴۸۱ھ (۱۰۸۸-۸۹ء) میں یمگان نواح بدخشان میں وفات پائی، ناصر خسرو شاعری میں بھی بلند مرتبہ شاعر تھا (تاریخ ادبیات ایران۔ تالیف ڈاکٹر رضا زادہ شفق، ص ۱۴۶-۱۴۸۔

(۱) بزم صوفیہ، ص ۱۹۱ بحوالہ سفینۃ الاولیا۔

پہلوئے من دفن کنند کہ او صاحبِ اسرارِ من است ،
و من بے او قدم در بہشت نہ نہم ۔[1]

(ترجمہ)

امیر خسرو میرے بعد نہ زندہ رہیں گے ، جب وہ رحلت کریں تو انھیں میرے پہلو میں دفن کرنا کہ وہ میرے صاحبِ اسرار ہیں ، اور میں ان کے بغیر بہشت میں قدم نہ رکھوں گا ۔

حضرت خواجہ نظام الدین کی بارگاہ میں ان کو یہ تقرب حاصل تھا کہ وہ ہر روز بلا ناغہ عشا کی نماز کے بعد خلوت میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ، اور ہر قسم کی باتیں ، ہوتیں اور مریدین میں سے اگر کسی کی کوئی درخواست ہوتی تو آپ تک پہنچاتے ۔ ایک دفعہ حضرت محبوب الٰہی نے امیر خسرو سے فرمایا کہ میں ہر ایک سے تنگ ہو جاتا ہوں ، یہاں تک کہ خود اپنے سے بھی تنگ ہو جاتا ہوں ، لیکن تم سے کبھی تنگ نہیں ہوتا ۔ اس دفعہ ایک شخص نے حضرت امیر خسرو پر آپ کی غیر معمولی نگاہِ الطاف کو دیکھ کر عرض کیا ، جو نظر خسرو پر ہے : کبھی مجھ پر بھی تو فرمائیے ، اس وقت آپ نے اس شخص کو کوئی جواب نہیں دیا ، بعد میں تنہائی میں امیر خسرو سے فرمایا کہ میں چاہتا تھا کہ اس شخص سے کہوں کہ خسرو جیسی قابلیت بھی تو پیدا کرو ، لیکن میں خاموش رہا ۔[2]

شاعری :

اس برصغیر پاک و ہند کے فارسی گو شعرا میں امیر خسرو کا مرتبہ بہت بلند ہے یہاں تک کہ ان کی عظمت شاعرانہ کو اہلِ ایران

---

(۱) بزمِ صوفیہ ، ص ۱۹۱ بحوالہ تاریخ فرشتہ ، ج ۱ : ص ۳۰۳ ۔
(۲) اخبار الاخیار ، ص ۹۹ ۔

بھی تسلیم کرتے ہیں ۔ حضرت امیر خسرو فارسی کے صاحب طرز شاعر ہیں اُن کا ایک مخصوص جادہ و اسلوب ہے ، علوئے تخیل ، لطافت و شیرینی ، سوز و گداز اور تصوف کے مضامین کے امتزاج نے ان کی شاعری کو ایک نیا رنگ و آہنگ دیا ہے ۔ اور وہ اپنی شاعری میں اُن تمام ایرانی شاعروں سے جو اس وقت ہندوستان میں مقیم تھے ۔ منفرد اور یگانہ نظر آتے ہیں خسرو کے بعض ناقدین کا خیال ہے کہ خسرو کی شاعری میں گل و بلبل زیادہ اور تصوف کے رموز و نکات کم ہیں ، لیکن ان ناقدین کو معلوم ہونا چاہیے کہ اُن کی شاعری کے جادے کو بھی ان کے پیر حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی نے متعین فرمایا تھا ، چنانچہ انھوں نے اپنے پیر و مرشد کے حکم کے مطابق اصفہانی شعرا کے طرز سخن کو اپنایا ہے ، کیوں کہ ان کے شیخ نے اُن سے فرمایا تھا کہ اصفہانیوں کے طرز میں کہو ۔

اخبار الاخیار میں ہے کہ جب امیر خسرو پیدا ہوئے تو اُن کے والد امیر لاچین ان کو چادر میں لپیٹ کر ایک مجذوب کے پاس لے گئے ، جو اُن کے پڑوس میں رہتے تھے ، اُن مجذوب نے امیر خسرو کو دیکھ کر کہا کہ تم اس بچے کو میرے پاس لے کر آئے ہو جو خاقانی[1] سے بھی دو قدم آگے جائے گا ۔[2]

---

(۱) خاقانی : افضل الدین بدیل ابراہیم بن علی نجار خاقانی شروانی کا ایران کے صف اول کے شعرا میں شمار ہوتا ہے ۔ ۵۲۰ھ (۲۷-۱۱۲۶ء) میں شروان میں پیدا ہوا ، اور خاقان اکبر منو چہر بن فریدون شیروان شاہ کی مناسبت سے اس نے اپنا تخلص خاقانی رکھا ۔ باوجود یگانۂ روزگار شاعر ہونے کے تمام عمر تنگی معیشت اور غم و آلام کا شکار رہا ۔ خاقانی نے ۵۹۵ھ (۹۹-۱۱۹۸ء) میں تبریز میں وفات پائی ، اور مقبرۃ الشعرا تبریز میں مدفون ہوا ۔

(باقی حاشیہ بر صفحہ ۲۹۲)

صاحب سیر الاولیا کا بیان ہے کہ ممکن ہے کہ دو قدم سے مجذوب کی مراد مثنوی اور غزل ہو، جہاں تک کہ قصیدے کا تعلق ہے، بعض قدیم کا کہنا ہے کہ قصیدے میں خاقانی کی رسائی فکر جہاں تک ہے، امیر خسرو اس کی برابری تو کرتے ہیں لیکن اس سے آگے نہیں بڑھتے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۱ نمبر ۱ و ۲)

سجو کوچہ سرخاب میں واقع ہے۔ خاقانی کے قصائد ندرت تخئیل، شکوہ الفاظ اور معنویت کے اعتبار سے نہایت آب و تاب رکھتے ہیں اس کی مثنوی "تحفۃ العراقین" کو خلوفیہ میں غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ خاقانی کی نکتہ وری کے علامہ اقبال مداح و معترف ہیں۔ ضرب کلیم میں خاقانی کو ارباب نظر کا قرۃ العین، اور محرم عالم مکافات قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

وہ صاحب تحفۃ العراقین
ارباب نظر کا قرۃ العین

ہے پردہ شگاف اس کا ادراک
پردے ہیں تمام چاک در چاک

خاموش ہے عالم معانی
کہتا نہیں حرف لن ترانی

پوچھ اس سے یہ خاکدان ہے کیا چیز
ہنگامہ این و آں ہے کیا چیز

وہ محرم عالم مکافات
اک بات میں کہہ گیا ہے سو بات

خود بوئے چنیں جہاں تواں برد
کابلیس بماند و بوالبشر مرد

(۱)

شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے امیر خسرو کی ولایت اور شاعری کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا کہ :

وے سلطان الشعر و برہان الفضلا است، در وادیِ سخن یگانہ عالم و نقادہ نوع بنی آدم است، وے در سخن عالمے است از عوالمِ خداوندی کہ پایان ندارد، وآنچہ از مضامین و معانی و اطوارِ سخن و انواعِ آن دست داد، ہیچ کس از شعرائے متقدین و متاخرین ندادہ ۔ و طرزِ سخن بہ فرمودہ شیخ خود رفتہ است کہ فرمودہ بر طرز اصفہانیان بگو ۔[1]

علامہ شبلی نے حضرت امیر خسرو کی شاعری کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے شعر العجم میں لکھا ہے :

فردوسی ، سعدی ، انوری، حافظ ، عرفی ، نظیری بلا شبہ اقلیم سخن کے جم و کے ہیں، لیکن ان کے حدود حکومت ایک اقلیم سے آگے نہیں بڑھتے ، فردوسی مثنوی سے آگے نہیں بڑھ سکتا ، سعدی قصیدے کو ہاتھ نہیں لگا سکتے ، انوری مثنوی اور غزل کو نہیں چھو سکتا ، حافظ ، عرفی اور نظیری غزل کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتے ، لیکن خسرو کی جہانگیری میں غزل ، مثنوی ، قصیدہ ، رباعی سب کچھ داخل ہے اور چھوٹے خطہ ہائے سخن یعنی تضمین ، مستزاد اور صنائع و بدائع کا تو شمار نہیں ، تعداد کے لحاظ سے دیکھو تو اس خصوصیت میں کسی کو ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں ہو سکتا ۔[2]

---

(۱) اخبار الاخیار ۔ ص ۹۹ ۔

(۲) شعر العجم ، حصہ دوم ، ص ۱۳۲-۱۳۳ ۔ مطبوعہ الناظر پریس لکھنؤ

مختصر یہ کہ اصناف سخن میں کوئی صنف ایسی نہیں جس میں امیر خسرو نے طبع آزمائی نہ کی ہو، اور اس صنف کو آسمان پر نہ پہنچا دیا ہو۔

خسرو کے متعلق ان کے بعض ناقدین کا یہ خیال ہے کہ انھوں نے اپنے قصیدوں میں بادشاہوں اور فرمانرواؤں کی مدح سرائی کی طرف توجہ دی ہے، سو اس کے متعلق ہم صرف اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتے ہیں کہ صوفیہ کے کردار کو پیمبرانہ کردار کے معیار سے نہیں جانچنا چاہیے، سوائے پیغمبروں کے ہر انسان میں بشری کمزوریاں موجود ہیں، ہماری نظر ان کے اعلیٰ کردار ان کی پاکیزہ سیرت اور اخلاقی بلندی پر ہونی چاہیے، جس کے وہ پیکر مجسم تھے، ان کی فارسی شاعری میں جہاں ہمیں قصائد ملتے ہیں، وہیں حمد باری تعالیٰ، نعت و عشق رسول ؐ، منقبت اصحاب رسول رضؓ، رموز تصوف، حکمت و اخلاق، مدح مرشد کے وہ پاکیزہ نمونے بھی ملتے ہیں، جنھیں فارسی شاعری کی روح کہا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ ان کی شاعری وہ سدا بہار اور حسین گلدستہ ہے جو صدیاں گزرنے پر بھی اہل نظر کے مشام جاں کو معطر بنائے ہوئے ہے۔

وہ موسیقی میں بعض راگ اور راگنیوں کے موجد و مخترع ہیں ڈاکٹر وحید مرزا نے لکھا کہ خسرو کی علم موسیقی میں مہارت کے متعلق کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں:

حضرت امیر خسرو نے ہندی اور فارسی راگوں کے امتزاج سے نئے راگ ایجاد کیے ان کی تعداد تیرہ بتائی جاتی ہے۔

اردو کی تاسیس:

حضرت امیر خسرو کی شخصیت بڑی پہلو دار شخصیت ہے،[1] امارت و فقر، علم و فضل، شاعری و موسیقی یہ تمام صفات

بیک وقت آن کی ذات میں جمع تھے ، اس کے علاوہ وہ ہماری قومی زبان اُردو کے مؤسس و بانی ہیں ، اگر ہم اردو زبان کے ماضی کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہماری نظر امیر خسرو سے آگے نہیں بڑھتی -

یہ تمام اوصاف و کمالات حضرت امیر خسرو کی عظمت و شہرت و مقبولیت کے وہ تاج ہیں ، جو خدائے تعالیٰ نے امیر خسرو کے سر پر رکھے ، زمانہ جوں جوں آگے بڑھتا جائے گا ، ان تاجوں کی ضیا باری و تابانی اور بڑھتی جائے گی اور ان کی عظمت و شہرت کا چراغ اور بھی زیادہ سے زیادہ روشن ہوتا جائے گا -

تصانیف :

امیر خسرو نہ صرف اس بر صغیر کے بلند پایہ شاعر تھے ، بلکہ نثر نگاری میں بھی ان کا مرتبہ بہت بلند ہے ان کی جن تصانیف کا اب تک پتا چل سکا ہے ، ان کے نام یہ ہیں :

(۱) تحفتہ الصغر : اس میں ان کے ۱۶ برس سے ۱۹ برس کی عمر تک کے اشعار ہیں ۔ اور عمدہ قصائد و غزلیات ، ترجیع بند وغیرہ ہیں ، اس میں سلطان غیاث الدین بلبن ، اور اس کے بیٹے اور حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی کی مدح میں قصائد بھی ہیں -

(۲) دیوان وسط الحیات : اس میں ان کا بیس اور تیس سال کی عمر کے درمیان کا کلام ہے -

(۳) غرة الکمال : یہ مجموعہ اُن کے تیس اور چالیس کی درمیان کی عمر کے کلام پر مشتمل ہے۔

(۴) نہایتہ الکمال : اس مجموعے میں اُن کی آخری عمر کا کلام ہے۔

امیر خسرو حکیم نظامی[1] سے خاص اعتقاد رکھتے تھے ، اُن کے تتبع میں انھوں نے کئی خمسے کہے ہیں ، جن کے نام یہ ہیں۔

(۱) مطلع الانوار : جسے انھوں نے نظامی کے خمسہ مخزن الاسرار کے مقابل میں کہا۔

(۲) شیریں خسرو : یہ مثنوی انھوں نے نظامی کی مثنوی خسرو و شیریں کے جواب میں کہی ہے۔

(۳) مجنوں و لیلیٰ : یہ مثنوی بھی انھوں نے نظامی کی لیلیٰ و مجنوں کے جواب میں کہی۔

(۴) آئینۂ اسکندری : یہ مثنوی بھی انھوں نے نظامی کے سکندر نامہ کے تتبع میں کہی تھی۔

(۵) ہشت بہشت : یہ مثنوی انھوں نے نظامی کی مثنوی ہفت پیکر کے مقابل میں کہی۔

ان کے علاوہ امیر خسرو کی تصانیف میں قرآن السعدین ،

---

(۱) حکیم نظامی : حکیم ابو محمد الیاس بن یوسف بن زاکی بن موید نظامی ۵۳۵ ھ (۴۱ - ۱۱۴۰ ء) میں شہر گنجہ حوالیٔ آذر بائیجان میں پیدا ہوئے ، بلند پایہ شاعر ہونے کے ساتھ وہ نجوم میں بھی دسترس کامل رکھتے تھے ، اس یگانۂ روزگار حکیم اور شاعر نے اندازاً ۵۹۹ ھ (۰۳ - ۱۲۰۲ ء) میں وفات پائی - (تاریخ ادبیات ایران (شفق) ، ص ۲۴۰ - ۲۴۵) -

نہ سپہر مفتاح الفتوح ، خزائن الفتوح ، دول رانی ، تغلق نامہ اور تاج الفتوح ہیں فن انشاء میں بھی امیر خسرو نے ایک کتاب رسائل الاعجاز تصنیف کی تھی ۔[1]

دولت شاہ نے اُن کے اشعار کی تعداد پانچ لاکھ بتائی؛ میرزا با یسنغر ان کے ایک لاکھ ، بیس ہزار اشعار جمع کرنے میں کامیاب ہوا، لیکن جب اُسے ان کی غزلوں کے دو ہزار اشعار اور ملے جو اُن کے دیوان میں نہ تھے، تو اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ شاعر کا کلام جمع کرنا بہت مشکل ہے ، اور اس خیال کو ترک کر دیا ۔[2]

وفات :

امیر خسرو اپنے مرشد حضرت محبوب الٰہی کی وفات کے وقت سلطان محمد تغلق کے ساتھ مہم بنگالہ پر تھے ، باوجود اس قدر دوری کے امیر خسرو کے دل پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی ، اور وہ بادشاہ سے اجازت لے کر دہلی روانہ ہو گئے ؛ دہلی پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ حضرت محبوب الٰہی کا وصال ہو چکا ہے ، یہ سن کر بیتاب ہو گئے ، اور اپنی ساری ملکیت اپنے مرشد کے ایصالِ ثواب کے لیے راہِ خدا میں لٹا دی ، اور ماتمی لباس پہن کر مرشد کے مزار پر حاضر ہوئے ، مزار سے سر ٹکرا کر ایک چیخ ماری اور کہا :

---

(۱) امیر خسرو کی تمام تصانیف کے نام اور اُن کی تفصیل تاریخ ادبیات ایران (شفق) ص ۳۱۴-۳۱۹ سے اور شعر العجم حصہ دوم سے ماخوذ ہیں ۔

(۲) ترجمہ اُردو تاریخ ادبیات ایران بعہد مغولان (بترجم محمد داؤد رہبر) ص ۱۸۰ ۔

سبحان اللہ آفتاب زیر زمین و خسرو زندہ۔

(ترجمہ)

سبحان اللہ آفتاب زمین میں چھپ گیا ، اور خسرو ابھی تک زندہ ہے ۔

یہ کہہ کر بے ہوش ہو گئے مرشد کے بغیر زندگی بے لطف ہو کر رہ گئی ، چھ ماہ اسی رنج و الم میں مبتلا رہ کر ۵۲۷ھ (۱۳۲۵ء) میں رحمت حق سے جا ملے ، اور اپنے شیخ کے پائین مدفون ہوئے۔[1] وفات کے وقت امیر خسرو کی عمر اکہتر سال کی تھی۔

امیر خسرو پانچ سلاطین کی عنایات سے مستفیض ہوئے۔

امیر خسرو کے چند شعر :

دیوان امیر خسرو جو ایران کے متبحر محقق آقای سعید نفیسی نے ایڈٹ کیا ہے ، ہم اس سے امیر خسرو کے چند شعر تبرکاً ذیل میں درج کرتے ہیں :

طبیب عاشقاں درماں نسازد
مریض عاشقاں درماں نخواہد

(۱) اے ز رویت چشم جاں را روشنی
زلف مشکن تا دلم را نشکنی

---

(۱) بزم صوفیہ ، ص ۱۹۱ -

عمر بگذشت ، حدیثِ دردِ ما آخر نشد
شب بہ آخر شد کنون کوتہ کنم افسانہ را

کسے کو روئے تو دید ست ہرگز
نظر بر پندِ غم خوارے ندارد

عاشق شدم و محرمِ این کار ندارم
فریاد کہ غم دارم و غم خوار ندارم

زاہدان تسبیح میخوانند و ''خسرو'' نام دوست
ذکر ہر کس آنچنان باشد کہ تلقین کردہ اند

۲۲

خواجہ اقبال علیہ الرحمہ

علامہ اقبال کا خواجہ اقبال کے متعلق اظہار عقیدت :

علامہ اقبال نے اپنے ہمنام خواجہ اقبال علیہ الرحمہ کو جو حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین کے خادم خاص تھے وسیلہ بنا کر بارگاہ حضرت سلطان المشائخ میں گزارش کی ہے :

ہے جو اظہار تمنائے دل ناکام ہوں
لاج رکھ لینا ترے ''اقبال'' کا ہمنام ہوں

یہ نظم اگرچہ ان کے مجموعہائے کلام میں موجود نہیں ، لیکن جناب سید عبد الواحد صاحب معینی، نائب صدر، اقبال اکیڈیمی، نے اپنی تالیف '' باقیات اقبال'' میں اس نظم کو نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ علامہ نے یہ نظم اس وقت لکھ کر دہلی بھجوائی تھی جب کہ ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد ایک مقدمے کی مصیبت میں گرفتار تھے ۔ اور علامہ ان کی وجہ سے سخت پریشانی میں مبتلا تھے، چنانچہ اس نظم کے بعد خدائے تعالیٰ نے ان کی پریشانی کو دور کیا ۔ اور انھوں نے پریشانی سے اور ان کے بڑے بھائی نے مقدمے سے نجات پائی ۔

حالات :

خواجہ اقبال کی زندگی کے مفصل حالات ہمیں نہیں ملتے ، مگر سیر الاولیاء سے ان کی زندگی کے جو ٹکڑے ہمیں ملتے ہیں، ہم انہیں تسلسل سے پیش کرتے ہیں ۔

آپ کا نام خواجہ محمد اقبال تھا ، حضرت سلطان المشائخ کے خادم خاص اور مزید تھے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وضو کے لیے پانی بھر کر رکھنا ، لنگر خانے کی اجناس کا انتظام ، اور دوسرے گھریلو انتظام آپ سے متعلق تھے ۔

سیر الاولیا میں ہے کہ جب سلطان المشائخ نماز عشاء با جماعت ادا کر لیتے تو اپنے مکان کی اوپر کی منزل میں قیام فرماتے ، اس وقت امیر خسرو(۱) کے سوا کسی کی مجال نہ ہوتی کہ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو ، امیر خسرو آپ کی خدمت میں بیٹھ کر ہر قسم کی باتیں کرتے ، سلطان المشائخ امیر خسرو کی رضا مندی کی خاطر سر ہلا دیا کرتے ، اور کبھی کبھی فرماتے "ترک! آج کیا خبر ہے ؟ خسرو یہ سن کر خوب دل کھول کر بیان کرتے ۔ اس موقع پر بعض چھوٹے رشتے دار اور بعض صاحبزادے جنہیں وہاں جانے کی جرأت تھی حاضر ہو کر سر قدموں اور آنکھوں سے ملتے ، جب امیر خسرو اور چھوٹے بڑے سب جا چکتے تو اقبال نامی خادم چند لوٹے پانی کے وضو کے لیے رکھتے ، اور خود باہر آجاتے ، تقرب خاص کی وجہ سے ایسا بھی ہوتا کہ یہ آپ کا پیغام خاص یا کوئی خوش خبری آپ سے سنتے تو مریدوں اور خلفا تک پہنچاتے ۔

ایک دفعہ حضرت محبوب الٰہی نے اس موقع پر جب کہ مجلس میں حضرت بایزید بسطامی(۱) کا ذکر ہو رہا تھا ارشاد فرمایا کہ ہم بھی ایک بایزید رکھتے ہیں ، ایک صاحب نے فرمایا وہ کہاں ہے ؟ فرمایا جماعت خانے میں ہے ، اقبال خادم جلدی سے جماعت خانے میں آئے اس وقت جماعت خانے میں سوائے حضرت برہان الدین غریب(۱)

---

(۱) سیر الاولیا ، ص ۱۱۲ ۔

کے اور کوئی موجود نہ تھا ، اقبال نے حضرت برہان الدین غریب[۱]
کو یہ مژدہ سنایا کہ آج سلطان المشائخ نے آپ کو بایزید کے
خطاب سے نوازا ہے ۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تقرب خاص کی وجہ سے جو
خواجہ محمد اقبال کو حاصل تھا ، لوگ سلطان المشائخ کے پاس
اپنی معروضات میں خواجہ محمد اقبال کو وسیلہ بناتے تھے ، اور
سلطان المشائخ ان کے صائب الرائے ہونے کی وجہ سے ان کی
اصابت رائے پر اعتماد فرماتے تھے ۔ چنانچہ جب سلطان المشائخ کے
مرض وفات میں اجازت و خلافت کے سلسلے میں چرچے شروع ہوئے
تو صاحب سیر الاولیاء کا بیان ہے کہ کاتب الحروف کے چچا
سید خاموش اور خواجہ مبشر نے جو سلطان المشائخ کے خدمتگار
قدیم تھے اور جنہوں نے مثل فرزندوں کے آپ کے پاس پرورش پائی
تھی ، سید حسین قدس سرہ سے عرض کیا کہ مولانا برہان الدین غریب
سلطان المشائخ کے قدیم مرید ہیں ، اور تمام مریدوں سے
ممتاز ہیں ، اور مستحق خلافت ہیں ، ان کی خلافت کے لیے بھی
سلطان المشائخ سے عرض کیا جائے ۔ ان سب حضرات نے خواجہ
محمد اقبال سے مشورہ کیا ، اور وہ بھی ان کی رائے سے متفق ہو گئے ۔
خواجہ اقبال نے فرصت کے وقت مولانا برہان الدین غریب کو
سلطان المشائخ کی خدمت میں پیش کیا ۔ اس وقت سلطان المشائخ
چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے ، اور لحاف بھی جسم مبارک پر پڑا ہوا
تھا ، خواجہ اقبال نے عرض کیا کہ مولانا برہان الدین غریب جو
بندۂ قدیم ہے ، مخدوم کی پائے بوسی کرتا ہے ، اور لطف و رحمت
کا امیدوار ہے ۔ آپ نے آنکھیں کھولیں اور مولانا اور اقبال کی طرف
دیکھنے لگے ۔ مولانا برہان الدین غریب نے قدم بوسی کی سعادت

---

(۱) روضۃ الاولیاء ، ص ۱۱ ۔

حاصل کی ، خواجہ اقبال نے سلطان المشائخ کے پاس خاص کپڑوں کا بقچہ لا کر رکھا ، اور پیراہن و کلاہ جو آپ کے جسم مبارک سے مس ہوا تھا ، نکالا ، سلطان المشائخ نے اپنا دست مبارک اس پیراہن و کلاہ پر رکھا ، اور اقبال نے مولانا کو پہنایا ، اور کہا تم بھی خلیفہ ہو ۔[1]

سلطان المشائخ کے آخر وقت ہیں جس مجلس شوریٰ نے سلطان المشائخ کی خدمت میں ۳۲ مریدوں کے نام خلافت کے لیے حضرت امیر خسرو کے ہاتھ سے لکھا کر پیش کیے تھے ، اس مجلس شوریٰ کے ایک فرد خواجہ اقبال بھی تھے ۔[2]

علی زنبیلی اور ملک نصرت کی وجہ سے کچھ دن سلطان المشائخ مولانا غریب سے ناراض رہے ان دونوں نے کہا تھا کہ برہان الدین شیخی کے سجادے پر بیٹھتا ہے ، سلطان المشائخ یہ سن کر ناراض ہوئے ، خواجہ اقبال خادم نے فی الفور سلطان المشائخ کا پیغام پہنچایا کہ اسی وقت گھر چلے جاؤ بالآخر حضرت امیر خسرو کے التماس پر صفائی ہوئی ۔[3]

مرض وفات میں حضرت محبوب الٰہی نے اپنے مریدوں اور خادموں سے متوجہ ہو کر فرمایا کہ تم گواہ رہنا کہ اگر اقبال خادم نے کوئی چیز بھی گھر میں جنس سے بچالی ہے تو کل قیامت کے روز اس کو خدا کے سامنے جواب دینا ہوگا ، خواجہ اقبال نے عرض کیا کہ میں نے کچھ نہیں چھوڑا ہے ، سب آپ پر صدقہ کردیا ہے ۔

---

(۱) روضۃ الاولیاء ، ص ۱۲ – ۱۵ ، بحوالہ سیر الاولیا ۔
(۲) روضۃ الاولیا ، ص ۱۳ ۔
(۳) ایضاً ، ص ۱۲ ۔

صاحب سیر الاولیاء نے لکھا ہے کہ : میرے چچا سعید حسین نے اطلاع دی کہ غلّے کے سوا ہر چیز محتاجوں کو پہنچ گئی ، حضرت محبوب الٰہی اقبال سے ناراض ہوئے اور فرمایا اس مردار ریت کو کیوں رکھ چھوڑا ہے ، اقبال نے عرض کیا کہ غلّے کے سوا جو کچھ موجود تھا سب کچھ تقسیم ہو گیا ہے ، آپ نے فرمایا خلقت کو بلاؤ ، جب لوگ حاضر ہوئے تو فرمایا غلّے کے انبار خانے توڑ ڈالو ، اور تمام غلّہ بے تکلف اٹھا لے جاؤ ، اور وہاں جھاڑو دے دو ، دیکھتے ہی دیکھتے خلقت جمع ہو گئی اور انہوں نے غلّہ لوٹ لیا ۔[۲]

وفات :

خواجہ اقبال نے ۲۷ صفر ۷۲۵ھ (۱۳۲۵ء) کو محمد تغلق کے سال جلوس میں وفات پائی ،[۲] ان کا مزار امیر خسرو کی قبر سے گوشۂ جنوب مغرب میں متصل درگاہ قطبی شریف بہت بلند چبوترے پر واقع ہے ، اور کٹھرا پتھر کا بنا ہوا ہے ۔[۳]

---

(۱) تاریخ دعوت و عزیمت حصہ دوم ، ص ۹۹ ۔

(۲) مطلوب الطالبین قلمی (عرف ارشاد نظامی) تالیف محمد بلاق (مملوکہ ۔ نیشنل میوزیم ، کراچی) ۔

(۳) اولیائے دہلی (تالیف ۔ محمد عالم فریدی) مطبوعہ جیّد برقی پریس ، دہلی

۴۳

حضرت سید علی ہمدانی رح

علامہ اقبال کی نذرِ عقیدت :

سید السادات ، سالارِ عجم
دستِ او معمارِ تقدیرِ اُمم
تا غزالی درسِ اللہ ہو گرفت
ذکر و فکر از دودمانِ او گرفت
مرشدِ آں کشورِ مینو نظیر
میر و درویش و سلاطیں را مشیر
خطہ را آں شاہِ دریا آستیں
داد علم و صنعت و تہذیب و دیں
آفرید آں مرد ایرانِ صغیر
با ہنر ہائے غریب و دل پذیر
یک نگاہِ او کشاید صد گرہ
خیز و تیرش را بدل راہے بدہ[1]

جاوید نامہ میں علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے عالم تصور میں جنت الفردوس کی سیر کرتے ہوئے ملا محمد طاہر غنی کی زبان سے

---

[1] (جاوید نامہ ، ص ۱۵۸) از کلیات اقبال فارسی ، ص ۶۳۶ -

امیر کبیر حضرت سید علی ہمدانی کی شان میں جو نغمہ سرائی کی ہے ، وہ اشعار ہم نے اوپر نقل کردیے ہیں ، اگرچہ یہ اشعار ملا محمد طاہر غنی[1] کی زبان سے ادا کرائے گئے ہیں ، لیکن درحقیقت یہ اشعار علامہ اقبال علیہ الرحمہ کی اس دلی عقیدت کے ترجمان ہیں ، جو وہ حضرت سید علی ہمدانی سے رکھتے ہیں -

حضرت سید علی ہمدانی کے متعلق ہمیں مختلف تذکروں اور تاریخوں میں جو مواد ملتا ہے ہم اسے بترتیب درج ذیل کرتے ہیں -

نفحات الانس میں مولانا جامی نے آپ کے متعلق لکھا ہے کہ :
امیر سید علی بن شہاب بن محمد الهمدانی (قدس اللہ سرہ)

---

(۱) ملا محمد طاہر غنی : تاریخ اعظمی میں ہے کہ : مولانا محمد طاہر متخلص بہ غنی ، کشمیر کے رہنے والے تھے ، اور قبیلہ آشائی سے تعلق رکھتے تھے ، صاحب طبع عالی تھے ، اور انھوں نے پایۂ سخنوری کو درجۂ کمال تک پہنچایا تھا ، ملا محسن فانی کے شاگرد تھے ، تمام ارباب سخن اس پر متفق ہیں کہ خطۂ کشمیر میں بلکہ تمام ہندوستان میں ، اس زمانے میں آن جیسا خوش فکر اور نازک خیال شاعر پیدا نہیں ہوا ، غنی کا دیوان جو سرتاپا انتخاب ہے، سرزا محمد علی ماہر نے ترتیب دیا تھا، لفظ ''غنی'' سے ان کی شعرگوئی کی ابتدا کی تاریخ ، اور تخلص کی تاریخ نکلتی ہے ، ساری عمر اپنے وطن سے باہر نہیں نکلے ، باوجود احتیاج کے دولت قناعت سے مالامال ہوکر فارغ البال زندگی بسر کرتے تھے ، عین عالم جوانی میں ۱۰۷۹ ھ میں عہد عالمگیری میں وفات پائی ، سلیم اور کلیم کے پہلو میں کشمیر میں مزار الشعرا میں مدفون ہوئے ، تاریخ اعظمی میں ہے کہ کشمیر میں تخت سلیمان میں مدفون ہوئے -
غنی کا وہ دیوان جو مرزا محمد علی ماہر نے مرتب کیا تھا ناپید ہے اور آج تک وہ قلمی نسخہ دیکھنے میں نہیں آیا -

علوم ظاہری اور باطنی کے جامع تھے ، اور علوم اہل باطن میں ان کی تصانیف مشہور ہیں، مثلاً اسرار النقطہ (الیقضہ) اور شرح اسماء اللہ ، اور شرح فصوص الحکم ، شرح قصیدہ خمریہ فارضیہ، اور ذخیرۃ الملوک وغیرہ ، آپ شیخ شرف الدین محمود بن عبد اللہ المزدقانی سے بیعت تھے، لیکن فیوض باطنی کا اکتساب آپ نے صاحب السرّ بین الاقطاب حضرت تقی الدین علی دوستی سے کیا تھا - لیکن جب شیخ تقی الدین کی وفات ہوگئی تو پھر آپ شیخ شرف الدین محمود کی طرف رجوع ہوئے ، اور اپنے مرشد سے عرض کیا کہ اب کیا حکم ہے؟ آپ کے مرشد نے فرمایا کہ اب فرمان یہ ہے کہ تم اقصائے بلاد عالم کی سیر کروگے ، چنانچہ آپ نے تین مرتبہ ربع مسکون کی سیر کی ، اور ایک ہزار چار سو اولیائے کرام کی صحبت سے فیضیاب ہوئے ، اور چار سو اولیائے کرام سے ایک مجلس میں ملاقات کی -[۱]

صاحب مجالس العشاق نے اپنے تذکرے میں حضرت سید علی ہمدانی کے متعلق لکھا کہ : دارا لملک معانی امیر سید علی ہمدانی بہت بڑے بزرگ تھے ، اور بہت سے عمدہ رسائل آپ نے لکھے ، ذوق اور آپ کی کیفیت آپ کے کلام سے ظاہر ہے ، آپ نے سلوک کے منازل اس طرح طے کیے تھے کہ بہت کم بزرگ لوگوں کو یہ بات میسر ہوسکی ہوگی -[۲]

حبیب السیر میں آپ کے حالات کے ضمن میں وہی ہے ، جو صاحب نفحات الانس نے لکھا ہے ، اس لیے ہم یہاں اس کے اعادے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے -

---

(۱) تذکرہ شعرائے کشمیر مرتبہ سید حسام الدین راشدی ، مطبوعہ اقبال اکادمی کراچی ، بخش دوم ، ص ۸۸۵ -

(۲) ایضاً بحوالہ مجالس العشاق ، ص ۱۳۶ -

صاحب ہفت اقلیم کا بیان ہے کہ سلطان الجائتو نے سلطانیہ[۱] میں اپنے لیے ایک محل اور گنبد تعمیر کرایا تھا ، اور حکم دیا تھا کہ افاضل و اکابر اور علمائے نامی گرامی ، اور سادات و مشائخ ممالک سے جمع کیے جائیں ، اور وہ اس محل اور گنبد میں اپنے ارشادات عالیہ سے مستفید فرمائیں ، تاکہ ، اُن کے افادات اس محل کے لیے موجب زیب و زینت ہوں ، حضرت سید علی ہمدانی کی عمر اُس وقت سات سال کی تھی ، آپ کے خالو آپ کو اپنے کاندھے پر بٹھا کر اس مجلس میں لے کر آئے ، اس مجلس میں علمائے کرام نے جو آیات و احادیث بیان کیں ، آپ نے اُن سب کو اپنے حافظے میں محفوظ کرلیا ، پھر انھیں ترتیب دے کر ایک کتاب کی صورت میں جمع کردیا ، جس کا نام آپ نے "اوراد فتحیہ" رکھا ۔ آپ بُلند پایہ شاعر بھی تھے ، لیکن سوائے اِن اشعار کے دوسرے اشعار سننے میں نہیں آئے :

گر بدر منیری و سما منزلِ تو
در کوثر اگر سرشتہ باشد گلِ تو

گر مہر علی ، نباشد اندر دلِ تو
مسکین تو و سعیہائے بیحا صلِ تو

گر حبِ علی و آل بتولت نبود
امید شفاعت ز رسولت نبود

---

۱) سلطانیہ : زنجان میں ہے ۔ (تذکرہ شعرائے کشمیر ، بخش اول ، مرتبہ سید حسام الدین راشدی یہ گنبدخدا بندہ کے عہد میں ۷۰۲ھ تا ۷۱۳ھ کی مدت میں تعمیر ہوا ، اور ابھی تک موجود ہے ، (حاشیہ تذکرہ شعرائے کشمیر ، بخش دوم ، مرتبہ سید حسام الدین راشدی ، ص ۸۸۹)

گر طاعتِ حق جملہ بجا آری تو
بی مہر علی ہیچ قبولت نبود

در کنار خویش می یابم دمادم بوی یار
زاں ہمی گیرم، بہردم خویشتن را در کنار[1]

تاریخ اعظمی میں آپ کا اسم گرامی سید علی ہمدانی لقب امیر کبیر؛ آپ کے والد کا نام سید شہاب الدین ہے ۔ آپ کا سلسلہٗ نسب یہ ہے جناب امیر کبیر ، بن میر شہاب الدین ، بن میر سید محمد بن سید علی، بن سید یوسف، بن سید شرف الدین، بن سید محب اللہ، بن سید محمد ثانی، بن سید جعفر، بن سید عبداللہ، بن سید محمد اول بن سید علی حسن ، بن سید حسین ، بن سید جعفر الحجہ ، بن سید عبداللہ زاہد ، بن امام ہمام ، زین العابدین ، بن الحسین الشہید (رضی اللہ تعالے عنہم)

ولادت: صاحب تذکرہ بزرگان و سخن سرایان ہمدان نے آپ کی عمر ۷۳ سال ماننے کے بعد آپ کا سنۂ ولادت ۷۰۶ھ (۷۲-۱۳۷۱ء) قرار دیا ہے ۔

صاحبِ تاریخ اعظمی نے حضرت سید علی ہمدانی کے حالات بضمن سلطان قطب الدین بنسبت دوسرے تذکروں کے زیادہ تفصیل سے دیے ہیں ، وہ لکھتے ہیں کہ : حضرت سید علی ہمدانی سلطان قطب الدین کے زمانے میں ۷۸۱ھ (۱۳۸۰ء) میں کشمیر جنت نظیر تشریف لائے ، آپ کی کشمیر میں تشریف آوری کی تاریخ نکلتی ہے ۔

مقدم شریف او
۷۸۱ھ

---

(۱) تذکرہ شعرائے کشمیر ، بخش دوم ، ص ۸۸۹

کشمیر کے مشہور شاعر سید محمد خاوری[۱] نے آپ کی تشریف آوری کے متعلق کہا :

میر سید علی شہِ ہمدان
میرِ اقلیم سبع کردہ نکو
شد مشرف ز مقدمش کشمیر
اہل آں شہر زو ہدایت جو
سالِ تاریخِ مقدم او را
یابی از : مقدم شریف او

۷۸۱ھ

رفقاء :

حضرت سید علی ہمدانی کے ساتھ آپ کے جو رفقا و سادات اور خادم کشمیر آئے ، وہ تقریباً سات سو تھے ، آپ کے ارشاد کے مطابق ان لوگوں نے بھی اس علاقے میں رشد و ہدایت کے چراغ روشن کیے - ان میں سے چند کے نام اور حالات محترمی سید حسام الدین راشدی نے تذکرہ شعرائے کشمیر کے حواشی میں درج کیے ہیں جنھیں ہم ذیل میں اختصار کے ساتھ نقل کرتے ہیں :

(۱) میر سید حسین سامانی (سمنانی)

یہ حضرت سید علی ہمدانی کے چچا سید محمد کے صاحبزادے تھے ، جو سب سے پہلے حضرت سید علی ہمدانی کے حکم سے اپنے

---

(۱) سید محمد خاوری : کشمیر کا بلند پایہ شاعر اور صاحب کمالات صوری و معنوی تھا ، صاحب تصانیف تھا ، اس کی تصانیف میں شرح لمعات اور خاور نامہ ہیں - فتح کدل میں سید احمد سامانی کے مزار کے قریب مدفون ہے (تذکرہ شعرائے کشمیر ، بخش دوم ، تالیف سید حسام الدین راشدی ، ص ۲۲۶ بحوالہ تاریخ اعظمی ، ص ۴۵)

اہل و عیال و متعلقین کے ساتھ سلطان شہاب الدین کے زمانے میں کشمیر کے حالات معلوم کرنے کے لیے یہاں تشریف لائے، اور کشمیر میں سکونت اختیار کی اس وقت سید علی ہمدانی غور میں تھے، اور دریائے ویشود کے کنارے موضع گولہ گام میں سکونت اختیار کی، جب انھوں نے دیکھا کہ کشمیر امیر تیمور کے تصرف سے خالی ہے تو یہاں کی تمام صورت حال حضرت سید علی ہمدانی کو لکھ کر تحریر کیا کہ اگر آپ یہاں تشریف لے آئیں تو مناسب ہے، چنانچہ آپ اُن کے لکھنے پر یہاں تشریف لائے۔

میر سید حسین سامانی نے گولہ گام میں سکونت اختیار کر کے ارشاد و تلقین کا کام شروع کر دیا، اور ایک عالم ان کے فیوضات ظاہری و باطنی سے مستفید ہونے لگا، کشمیر کے مشہور بزرگ شیخ نورالدین اپنے موضع کیموہ سے اکتساب معنوی اور سلوک کے معارف و رموز حل کرنے کے لیے اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔

(۲) سید جلال الدین عطائی:

سید جلال الدین عطائی خاندان سادات سے تعلق رکھتے تھے، کشمیر میں شادی کرلینے کی وجہ سے، حضرت سید علی ہمدانی کی وفات کے بعد کشمیر کے موضع جہتر، پرگنہ کہادر میں مقیم ہو گئے تھے، وفات کے بعد اطراف بارہ مولہ میں موضع کیجنہامہ میں مدفون ہوئے۔

(۳) سید کمال:

آپ خاندان سادات کے چشم و چراغ تھے، صاحب کشف و کرامات اور قوی الحال بزرگ تھے، حضرت سید علی ہمدانی کے

ارشاد پر یہ سلطان قطب الدین [1] والیِ کشمیر کو شریعت حقّہ کے احکام کی تعلیم دینے اور اس کی تربیت پر مقرر ہوئے ، سید کمال آخر وقت تک کشمیر میں مقیم رہے اور آج بھی محلۂ قطب پورہ میں محو استراحت ابدی ہیں ۔

(۴) حضرت جمال الدین محدّث :

یہ بزرگ بھی حضرت سید علی ہمدانی کے تربیت یافتگان میں سے تھے ، سلطان قطب الدین کے التماس پر تعلیم شریعت اور آدابِ دین سکھانے کے لیے آپ کے پاس بھیجے گئے تھے ، جب تک حیات رہے فیض بخش کاینات رہے ، وفات کے بعد محلۂ اریوت میں دریائے جہلم کے کنارے مدفون ہوئے آج بھی آپ کا مزار مرکز فیوض و برکات ہے ۔

(۵) حضرت سید فیروز :

سید فیروز معروف بہ سید جلال الدین ، نہایت عالی مرتبت بزرگ تھے ، موضع سپور ، پرگنۂ دہر میں دریائے جہلم کے کنارے جہاں سے زعفران زار شروع ہوتے ہیں مقیم ہوئے اور اسی موضع میں مدفون ہوئے ۔

---

(۱) سلطان قطب الدین : کشمیر کے فرمانروایانِ اسلام میں پانچواں فرمانروا ہے ، جو اپنے بھائی شہاب الدین کے بعد ١٣٧٨ء میں تخت نشین ہوا ، اسی کے زمانے میں حضرت سید علی ہمدانی کشمیر تشریف لائے ، اس نے سولہ سال ، سات دن حکومت کر کے ١٣٩٤ء میں وفات پائی ، سلطان قطب الدین بڑا منتظم ، عادل اور ذی علم اور شاعر تھا (نگارستان کشمیر قاضی ظہور الحسن سیوہاروی) ص ١٢٨ — ١٢٩)۔

(۶) سید محمد کاظم :

آپ حضرت سید علی ہمدانی کے حوالہ دار کتب خانہ تھے ، جب حضرت سید علی ہمدانی کے یمن و برکت سے بت خانہ" لتمنہ پور ویزان ہوا تو یہ حضرت علی ہمدانی کے حکم سے وہاں کے چھوٹے بڑوں کی دینی تعلیم کے لیے مقرر ہوئے ، سید محمد کاظم آخر عمر تک اسی میں مقیم رہے - اور یہیں مدفون ہوئے ، عوام میں یہ سید قاضی کے نام سے مشہور ہیں -

(۷) حضرت میر رکن الدین ہ - (۸) سید فخر الدین :

یہ دونوں بھائی صاحب تفرید و تجرید اور جامع علوم ظاہر و باطن تھے ، حضرت سید علی ہمدانی کے حکم سے ان دونوں بھائیوں نے ارن پورہ ، پرگنہ اولر میں سکونت اختیار کی - اور وہیں مدفون ہوئے -

(۹) سید محمد قریشی :

آپ صاحب حال بزرگ تھے ، کشمیر آنے کے بعد انھوں نے حضرت علی ہمدانی کے ارشاد پر اپنی تبلیغی جدوجہد سے بت خانہ بجبارہ کو جو ساز و سامان سے نہایت آراستہ تھا بے رونق کر دیا ، اور وہاں ایک بڑی جامع مسجد بنوائی ، اسی مسجد کے قریب حضرت سید محمد قریشی کا مقبرہ ہے -

(۱۰) مولانا پیر محمد قادری :

مولانا حافظ کلام اللہ تھے ، اور ساتوں قرأت کے ماہر اور جامع علوم ظاہر و باطن تھے ، حضرت سید علی ہمدانی کے ارشاد کی بنا پر اہل شہر اور سلطان قطب الدین کی تعلیم کے لیے انھوں نے شہر میں سکونت اختیار کی ، اور یہیں وفات پائی ، سلطان قطب الدین کے مقبرے میں محلہ" لنگرتہ میں مدفون ہیں ، آپ کا مزار زیارت گاہ خاص و عام ہے -

(۱۱) شیخ سلیمان :

شیخ سلیمان کشمیر کے کسی معزز ہندو خاندان کے فرد تھے ، ان کا نام شیر کنت تھا ، توفیق ایزدی کی بنا پر مشرف بہ اسلام ہوئے ، قرآن مجید حفظ کیا ، اور اس خوف سے کہ ان کے خاندان کو ان کے اسلام لانے کی اطلاع نہ ہو جائے ۔ کشمیر چھوڑ کر سمرقند چلے گئے ، ایک عرصے وہاں تعلیم حاصل کرتے رہے ، مختلف علوم میں کمال حاصل کرنے کے بعد کشمیر واپس آئے ، پھر اپنے چچا زاد بھائیوں کی عداوت کی وجہ سے وطن چھوڑ کر کولاب چلے گئے ، اور حضرت سید علی ہمدانی کی خدمت میں حاضر ہوئے ، آپ نے ان کا وطن پوچھا تو بجائے کشمیر کے باغ سلیمان بتایا ، حضرت سید علی ہمدانی نے ان کا نام سلیمان رکھا ، پھر ان کے صاحبزادے شیخ احمد کی جو ان کے ساتھ تھے تعلیم و تربیت فرمائی ، شیخ سلیمان وفات کے بعد مسجد جامع کے قرب و جوار میں سید محمد لورستانی کے مزار کے قریب مدفون ہوئے ۔

(۱۲) شیخ احمد خوش خواں :

شیخ سلیمان کے صاحبزادے تھے ، بچپن ہی سے حضرت سید علی ہمدانی کی خدمت میں رہے ، اور آپ کی ظاہری و باطنی تربیت سے مستفید ہوئے ، کشمیر کے قیام کے زمانے میں حضرت سید علی ہمدانی ان پر بے حد شفقت فرماتے تھے ، کشمیر سے لوٹتے وقت کولاب میں حضرت سید علی ہمدانی نے ان کو خلافت سے بھی سرفراز فرمایا ، اور ان کے والد شیخ سلیمان کی روحانی تربیت ان کے صاحبزادے شیخ احمد خوش خواں کے سپرد کی ، شیخ سلیمان نے عرض کیا کہ میری ڈاڑھی سفید ہو چکی ہے ، میری تربیت آپ نے میرے بیٹے کے سپرد فرمائی ہے ، آپ نے جواب میں فرمایا کہ خلافت کا انحصار سفید ڈاڑھی پر نہیں ، بلکہ خدا کے

فضل پر ہے ۔ حضرت علی ہمدانی کی وفات کے بعد شیخ احمد نے آپ کے سجّادہ ارشاد کو زینت بخشی ، چونکہ قران مجید نہایت خوش الحانی سے پڑھتے تھے ، اس لیے خوش خواں کے لقب سے مشہور ہوئے ، شیخ احمد کا مزار سید محمد لورستانی کے مزار کے متصل اپنے والد بزرگوار کے مزار کے پہلو میں ہے ۔[۱]

قیام :

تاریخ اعظمی میں ہے کہ حضرت سید علی ہمدانی نے کشمیر تشریف لانے کے بعد محلہ علاء الدین پورہ کی ایک سرائے میں قیام فرمایا ، اور پانچوں وقت کی نماز کے لیے دریائے جہلم کے کنارے ایک چوکور چبوترہ بنوایا ۔ جہاں اب آپ کی خانقاہ ہے ۔ اسی چبوترے پر آپ ہمیشہ نماز پڑھتے تھے ، بادشاہ وقت اسی چبوترے پر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا ، اور آداب ارادت و محبت بجا لا کر آپ کے پند و نصائح سنتا ۔

تاریخ اعظمی میں ہے کہ کشمیر میں تشریف آوری سے پہلے اس خطے پر جہالت کی تاریکیاں اس قدر چھائی ہوئی تھیں کہ یہاں کے لوگ علم شریعت سے بہت کم واقف تھے ، بلکہ مسلمان ہی بہت کم تھے ، احکام شریعت اور اسلام کی تعلیم تقریباً مفقود تھی ، کشمیر کے اس دور جاہلیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ احکام اسلامی سے عدم واقفیت کی بنا پر سلطان قطب الدین بیک وقت دو حقیقی بہنوں کو اپنے نکاح میں لائے ہوئے تھا ، اور کافروں کا لباس پہنتا تھا ۔ مختصر یہ کہ چودھویں صدی عیسوی کے اواخر میں کشمیر کے مسلمانوں کی مذہبی ، اخلاقی اور تعلیمی حالت نہایت گر چکی

---

(۱) حضرت سید علی ہمدانی کے ان رفقا کے حالات تذکرہ کشمیر ، بخش دوم مولفہ سید حسام الدین راشدی ، حواشی ص ۸۹۰ — ۸۹۳ سے ماخوذ ہیں ۔

تھی ، اخلاق و کردار، عادات و اطوار سب میں تنزل کے آثار نمایاں تھے کہ عین اسی زمانے میں حضرت سید علی ہمدانی کشمیر تشریف لائے ۔

رشد و ھدایت:

آپ نے کشمیر میں رشد و ہدایت کی شمع ایسے زمانے میں روشن کی جب کہ یہاں تنزل و انحطاط کا دور انتہا کو پہنچ چکا تھا ۔ مسلمان اسلام کی تعلیمات اور دین کے احکام سے بالکل ناواقف تھے ، تنزل اور ابتری کے اس دور میں آپ نے تبلیغ و اشاعت اسلام اور اصلاح و تربیت کا کام شروع کیا ۔ یہاں کے دور و دراز کے علاقوں میں اپنے رفقا کو جو آپ کے ساتھ آئے تھے ، پھیلا دیا ، تا کہ وہ دینی تعلیم اور اشاعت اسلام کی خدمت انجام دے کر اس خطے کو اسلام کے نور سے منور کریں ۔

خود آپ نے اس بنا پر کہ ''النّاس علیٰ دین ملوکھم'' (لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں) اگر ان کو درست کر دیا جائے تو عوام کی اصلاح بہت آسان ہوتی ہے ، آپ نے سلطان قطب الدین کی تعلیم و تربیت کی طرف خصوصی توجہ دی ۔ اسے پند و موعظت ، ارشاد و تلقین سے شریعت اسلامیہ کا پابند بنایا ۔ چنانچہ وہ عدم واقفیت کی بنا پر جن دو بہنوں کو بیک وقت اپنے نکاح میں لائے ہوئے تھا آپ کے ارشاد کی بنا پر اس نے اس نکاح کو فسخ کر دیا کافرانہ لباس ترک کر کے مسلمانوں کا لباس پہننے لگا ، آپ نے اپنے رفقا کو اس کی تعلیم و تربیت کے لیے مقرر فرمایا ، اس کے علاوہ آپ نے کشمیر کے عوام میں اسلام کی روح کو بیدار کیا ، اور اس علاقے میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں بڑا حصہ لیا ، آپ کی ذات علم و معرفت ، رموز و حکمت ، احسان و سلوک کا وہ سرچشمہ تھی جس سے ہزاروں تشنگان معرفت نے اپنی تشنگی دور کی ۔

صاحبِ بزرگان و سخن سرایان ہمدان نے کشمیر میں حضرت سید علی ہمدانی کی دینی اور تبلیغی، روحانی اور اصلاحی کوششوں کو سراہتے ہوئے لکھا کہ:

میر سید علی بسال ۷۸۱ھ با ہفت نفر از مریدان خود بکشمیر رفت، و در شاه و بزرگان و سائر مردم آن دیار نفوذ مذہبی بسیار کرده، و خلقی را مرید خود ساخت۔[1]

عرفانی:

جناب عرفانی نے حضرت سید علی ہمدانی اور آپ کے رفقا کی کشمیر میں تبلیغی جدوجہد کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا کہ:

اسمِ شاہِ ہمدان نسبت تمام مبلّغین دیگر اسلام در کشمیر معروف تر است ...... ہمکاران شاہِ ہمدان، در سر تا سر کشمیر (لنگر خانہ) یا خانقاہہای برای تبلیغ برقرار نمودند و تبلیغاتِ ایشان ـ کہ توام با اخلاق بسیار عالی بود ـ موثر واقع شده، و در مدت کوتاہی، مردمِ کشمیر مشرف بدینِ اسلام شده، و زبانِ اسلام مبلّغین را بادل و جان پذیرفتند۔[2]

تذکروں میں ہے کشمیر کی مشہور ترین عارفہ خاتون للّہ[3]

(۱) تذکرہ شعرائے کشمیر، بخش دوم، مرتبہ سید حسام الدین راشدی مطبوعہ اقبال اکادمی کراچی۔ ص ۹۰۰

(۲) تذکرہ شعرائے کشمیر، بخش دوم۔ تالیف سید حسام الدین راشدی، ص ۹۱۲ — ۹۱۳

(۳) للّہ: ۷۳۵ھ (۱۳۳۴-۳۵ء) میں پیدا ہوئیں، عبدالوہاب شائق نے اس شعر میں ان کی تاریخ ولادت کہی:

فزون بود بر ہفت صد، سی و پنج
ز ویرانہ شد پدیدار گنج

اور پمپری نگر سے ۲۸ میل دور موضع بیج بہارا میں انہوں نے وفات پائی، ان کا مزار جامع مسجد کے متصل ہے۔
(تذکرہ شعرائے کشمیر، بخش دوم بحوالہ صوفی، ص ۹۱۲-۹۱۳)

ناہی کہ جن کی زندگانی اور شعر عرفانی بابا طاہر سے ملتے جلتے تھے چالیس سال سے زائد عمر میں حضرت سید علی ہمدانی کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئیں، کہا جاتا ہے کہ للّٰہ دیوانوں کی طرح نیم لخت و عریاں آبادیوں اور ویرانوں میں اپنے شعر پڑھتے ہوئے گھومتی تھیں - لوگ جب ان سے کہتے کہ پردہ کرو تو وہ جواب دیتیں کس سے پردہ کروں ۔ تمہارے درمیان کوئی حقیقی مرد ایسا نہیں جس سے پردہ کیا جاسکے، اتفاقاً ایک روز انھوں نے دور سے حضرت سید علی ہمدانی کو دیکھا، دیکھتے ہی چلّائیں کہ وہ مرد آرہا ہے، وہ مرد آرہا ہے اور وہاں سے بھاگ کر لباس پہنا اور آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر مشرف بہ اسلام ہوئیں، ان ہی خاتون نے شیخ نور الدین رشی[1] کو جو (کہ سرچشمۂ الہام تھے بچپن ہی میں دودھ پلایا تھا -

علامہ اقبال علیہ الرحمہ نے جاوید نامہ کے ان اشعار میں حضرت علی ہمدانی کی ان ہی خدمات جلیلہ کی طرف اشارہ کیا ہے جو آپ نے دین، تعلیم، صنعت، تہذیب و تمدن کی انجام دیں - اور کشمیر کو ایران جیسے متمدن اور مہذب ملک کے ہمسر کر دیا تھا - (۲) فرماتے ہیں :

---

(۱) شیخ نور الدین رشی : شاہ ہمدان کے بعد کشمیر میں سب سے بڑی شخصیت شیخ نور الدین رشی کی تھی، انھوں نے بچپن میں سید تاج الدین سمنانی اور خود شاہ ہمدان سے فیض حاصل کیا تھا ۔ "شمش العارفین" سے ان کی تاریخ وفات ۸۴۲ھ (۱۴۳۸ — ۳۹ء) نکلتی ہے ۔ شیخ نور الدین نے کشمیر میں اشاعت دین اور تصوف اسلامی کی جو شاندار خدمات انجام دی ہیں تاریخ کشمیر میں وہ کبھی فراموش نہیں کی جاسکتیں - (تذکرۂ شعرائے کشمیر، بخش دوم حاشیہ نمبر ۱ ص ۹۱۴ -

مرشدِ آں کشورِ مینو نظیر
میر و درویش و سلاطیں را مشیر

خطہ را آں شاہِ دریا آستیں
داد علم و صنعت و تہذیب و دیں

آفرید آں مرد ایرانِ صغیر
با ہنر ہائے غریب و دلپذیر

سلطان قطب الدین پر لطف عنایت :

اس دور کے فرمانروا سلطان قطب الدین نے آپ کے زیر تربیت رہ کر اپنے آپ کو اسی رنگ میں رنگ لیا تھا ، حضرت سید علی ہمدانی بھی اس پر نہایت لطف و شفقت فرماتے تھے ، آپ نے اس کو اپنی کلاہ عنایت فرمائی تھی ، سلطان نے اس کو اپنے لیے باعثِ یمن و برکت سمجھ کر اس کلاہ کو اپنے تاج کی زینت بنایا تھا ، اس خاندان کے فرمانرواؤں میں یہ کلاہ نسلاً بعد نسلٍ فتح شاہ[1] کے زمانے تک تاج کی زینت رہی ، یہاں تک کہ فتح شاہ نے اپنی

---

(۱) فتح شاہ کا عہد حکومت ۱۴۸۶ء — ۱۵۱۸ء ہے ، اس نے ۱۵۱۸ء میں نوشہرے میں وفات پائی ۔ سلطان قطب الدین کی وفات کا سنہ ۱۳۹۴ء ہے گویا تقریباً ۱۲۴ تک یہ کلاہ اس خاندان میں محفوظ رہی ۔

مولانا آنی جو عہدِ فتح شاہ میں اپنے دور کے علامہ اور صاحب عرفان بزرگ تھے ، جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ فتح شاہ وہ ٹوپی بھی اپنے ساتھ قبر میں لے گیا تو آپ نے فرمایا کہ فتح شاہ اس کلاہ کو قبر میں نہیں لے گیا ، بلکہ وہ اس سلطنت اور برکت کو زیر زمین لے گیا ہے ، کہتے ہیں کہ اسی وقت سے اس خاندان کی حکومت کا زوال شروع ہوا ، اور رفتہ رفتہ یہاں تک پہنچا کہ یہ حکومت چک خاندان میں منتقل ہو گئی ۔

وفات کے وقت وصیت کی کہ یہ کلاہ اس کے کفن میں رکھ دی جائے ، چنانچہ یہ کلاہ اس کے کفن میں اس کے ساتھ مدفون ہوئی۔

کشمیر سے روانگی :

قدیم تاریخوں میں ہے کہ حضرت سید علی ہمدانی (۸۰-۱۳۷۹ء) میں کشمیر تشریف لائے ، اور ۷۸۶ھ (۸۲-۱۳۸۱) میں کشمیر سے تشریف لے گئے ، لیکن کوئی بھی اس کا قائل نہیں کہ آپ نے پانچ چھ سال کشمیر میں قیام کیا ، بلکہ عقلی طور پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ متعدد مرتبہ آپ کشمیر تشریف لائے ، اور آپ کا مجموعی قیام تین سال تک اس ملک میں رہا ، کیونکہ آپ نے تین مرتبہ ربع مسکون کی سیاحت کی تھی ، اس لیے قیاس کا اقتضا ہے کہ ہر مرتبہ جب آپ سیاحت کرتے ہوئے کشمیر پہنچے تو آپ نے ایک ایک سال یہاں قیام فرمایا۔

قاضی ابراہیم ولد حمید الدین نے جن کا عہد حضرت سید علی ہمدانی سے قریب تر ہے اپنی تاریخ میں لکھا کہ : حضرت سید علی ہمدانی اس چبوترے پر جہاں آج آپ کا حجرۂ خاص ہے ، اکثر اوقات سکونت فرماتے تھے ، جب آپ نے اس شہر سے روانگی کا قصد کیا تو سلطان قطب الدین کے التماس پر مولانا محمد قاری کو جو آپ کے ہمراہ تھے ، یہاں رہنے کا حکم دیا۔

وفات

جب حضرت سید علی ہمدانی کشمیر سے روانہ ہو کر سواد کبر پہنچے تو ۶ ذی الحجہ ۷۸۶ھ (۸۵-۱۳۸۴ء) کو آپ نے وفات پائی۔ عین وفات کے وقت آپ کی زبان مبارک پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم تھا ۔ یہی آپ کی تاریخ وفات ہے ۔

شیخ محمد بسر الشی نے جو اپنے وقت کے صالحین اور بلند پایہ شعرا میں تھے ، آپ کی تاریخ وفات یوں نکالی ہے ۔

عقل تاریخ سالِ رحلتِ او
سیدِ ما علیِ ثانی گفت

۷۸۶ھ

آپ کی وفات کے بعد کشمیر کے لوگوں اور سلطان محمد والیِ پھکلی کی جماعت کے لوگوں میں جھگڑا ہوا کہ آپ کے جسد مبارک کو کہاں دفن کیا جائے ، ہر جماعت کے لوگ حضرت سید علی ہمدانی کے جسد مبارک کو اپنے علاقے میں دفن کرنا چاہتے تھے ، آخر غسل اور جنازہ تیار ہونے کے بعد شیخ قوام الدین بدخشی نے جو آپ کے محرم خاص اور مقرب بارگاہ تھے فرمایا کہ تم میں سے جو شخص تنہا تابوت مبارک کو اٹھا سکے ، وہ لے جائے ، جب کوئی تابوت کو نہ اٹھا سکا تو خود شیخ قوام الدین نے تنہا آپ کے تابوت کو اٹھایا ، اور کبر اور کوہستان چرار کے راستے سے ختلان (جیکستان) لے گئے ، اور ۵ جمادی الاُخریٰ ۷۸۷ھ (۸۶-۱۳۸۵ء) کو آپ کے تابوت کو وہاں دفن کیا ۔

تعمیر خانقاہ سید علی ھمدانی :

صاحبِ تاریخ اعظمی نے حضرت سید علی ہمدانی کے بڑے صاحبزادے حضرت میر سید محمد ہمدانی کے حالات میں لکھا ہے کہ : آپ کے فرزند اکبر میر سید محمد ہمدانی سلطان سکندر بن سلطان قطب الدین (متوفی ۷۹۶ھ (۹۴-۱۳۹۳ء) کے عہد میں بارہ سال تک کشمیر میں رہ کر ترویجِ اسلام کرتے رہے ۔

جب ہندوستان کے بادشاہوں نے نئی نئی عمارتوں کی بنیاد رکھی ، تو اس چبوترے پر جو حضرت سید علی ہمدانی نے دریائے جہلم کے کنارے پانچ وقت کی نماز کے لئے بنوایا تھا ایک شاندار خانقاہ

کی تعمیر کی بنیاد رکھی اس عمارت کی تعمیر ۷۹۸ھ (۱۳۹۵-۹۶ء)
میں شروع ہوئی اور ۷۹۹ھ (۱۳۹۶-۹۷ء) میں تکمیل کو پہنچی -

حضرت میر سید محمد نے ایک بیش بہا لعل بدخشانی جو آن
کے پاس تھا تبرکاً سلطان سکندر کو دیا تھا، سلطان سکندر نے اس کے
عوض میں تین پرگنوں سے تین گاؤں مصارف خدام خانقاہ کے لیے
عطا کیے، آن میں سے ایک گاؤں ونی نامی تھا جو پرگنۂ شاورہ میں
تھا، دوسرا گاؤں نونہ ونی تھا، جو پرگنۂ بارنبد میں تھا، تیسرا گاؤں
نزال تھا جو پرگنۂ اولر میں تھا، اس خانقاہ کا متولی مولانا سعید کو
مقرر کیا گیا، اور مطبخ اور دوسرے مصارف کے لیے کچھ اور
گاؤں سلطان نے وقف کیے -

آقای علی اصغر حکمت نے لکھا کہ : حضرت سید علی ہمدانی
کی خانقاہ ، خانقاہ معلیٰ کے نام سے موسوم ہے ، اس کے ساتھ ایک
مسجد ہے، جو مسجد شاہ ہمدان کے نام سے موسوم ہے، یہ خانقاہ اور
مسجد شہر سری نگر میں محلۂ علاء الدین پور میں فتح کدل و
زینا کدل پلوں کے درمیان واقع ہے ، تمام عمارت میں ضخیم اور
مکعب لکڑی اینٹوں کی طرح سے استعمال کی گئی ہے ، اور اس جگہ
کو جہاں حضرت سید علی ہمدانی نماز پڑھا کرتے تھے مربع شکل
میں گھیر لیا گیا ہے ، اس خانقاہ کے باب الداخلہ پر یہ شعر
کندہ ہے :

ای دل ! اگرت مطلب فیض دو جہان ست
رو ، بر در شاہنشہ شاہ ہمدان ست

بائیں جانب یہ شعر مرقوم ہے :

مقرون اجابت ، ہر آنکہ در اوست دعا نہا
عرش ست درش ، بلکہ ازو عرش نشان ست

اسی طرح دائیں طرف یہ شعر درج ہے :

خانقاہ ست این مکان، یا مسجد اقصیٰ ستی
مسکن امن و امان، یا جنت الماویٰ ستی

اسی طرح بائیں ہاتھ کے دروازے پر یہ شعر کندہ ہے :

قبۂ نور است یا سر چشمۂ آب حیات
یا بگر، از رحمت حق، خیمۂ برپا ستی

دروازے کے بالائی حصے پر یہ رباعی منقوش ہے

چو شد از گاہ احمد خاتم دین
ز ہجرت ہفصد و ست و ثمانین
برفت از عالم فانی بباقی
امیر ہر دو عالم آل یاسین

یہ رباعی اس عمارت کی پیشانی پر کندہ ہے :

ہر فیض کہ در سابقۂ ہر دو جہان ست
در پیروی حضرت شاہ ہمدان ست
شاہ ہمدان آنکہ شہنشاہ جہان ست
ای خاک بر آن دیدہ کہ در ریب و گمان ست

خانقاہ کے داخلی حصے میں بالائے محراب یہ رباعی جس میں آپ کی تاریخ وفات بھی شامل ہے، کندہ ہے :

حضرت شاہ ہمدان کریم
آیۂ رحمت ز کلام قدیم
گفت دم آخر و تاریخ شد
بسم اللہ الرحمن الرحیم

۷۸۶ھ

اس کے علاوہ یہ رباعی بھی بالائے محراب پر منقوش ہے ، جو خود حضرت سید علی ہمدانی کی ہے :

شاہا ز کرم بر منِ درویش نگر
بر حالِ منِ خستہٴ دل‌ریش نگر

ہر چند نیَم لائقِ بخشائشِ تو
بر من منگر ، بر کرمِ خویش نگر[1]

تذکرہ ریاض الشعرا ، مجمع النفائس ، ریاض العارفین ، مجمع الفصحا ، روز روشن وغیرہ میں تقریباً وہی حالات ہیں جو صاحب تاریخ اعظمی نے لکھے ہیں ۔ لہٰذا ہم ان کے اعادے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے البتہ صوفی نے آپ کے متعلق کچھ مزید نئی باتیں لکھی ہیں ، اس کا اقتباس ہم ذیل میں درج کرتے ہیں :

حضرت سید علی ہمدانیؒ ۱۲ رجب روز دو شنبہ ۷۱۴ھ (۱۳۱۴) کو بی بی فاطمہ کے بطن سے ہمدان میں پیدا ہوئے ، ''رحمۃ اللہ'' سے آپ کی تاریخ ولادت نکلتی ہے ، خلاصۃ المناقب میں ہے کہ آپ کا سلسلہٴ نسب ۱۶ واسطوں سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جا ملتا ہے ، حضرت علاء الدین سمنانی آپ کے چچا تھے ، حضرت سید علی ہمدانی شاگرد اور مرید شیخ ابوالبرکات تقی الدین علی دوستی کے تھے ، ان کی وفات کے بعد آپ نے شیخ شرف الدین محمود مزدقانی سے بیعت کی تھی ۔

۲۱ سال کی عمر میں آپ نے دنیا کے سفر کا آغاز کیا ، تیمور کی ہنگامہ خیزیوں کی وجہ سے آپ اپنے وطن ہمدان کو ترک کر کے

---

(۱) تذکرہ شعرائے کشمیر ، بخش دوم ، سید حسام الدین راشدی ، حاشیہ نمبر۱ ص ۱۰۹۰ - ۱۱ بحوالہٴ نقش پارسی بر احجار ہند ، آقای علی اصغر حکمت ص ۶۷-۶۹ -

سلطان شہاب الدین کے عہد حکومت میں ۷۷۴ھ (۷۳-۱۳۷۲ء) میں سات سو سادات کے ساتھ کشمیر میں تشریف لائے ۔ اور وہاں سے حج کے لیے تشریف لے گئے، دوسری مرتبہ آپ ۷۸۱ھ (۸۰-۱۳۷۹ء) میں سلطان قطب الدین کے عہد میں کشمیر تشریف لائے ۔ اور اس مرتبہ دو سال چھ ماہ کشمیر میں رہے ، اور ۷۸۳ھ (۸۲-۱۳۸۲ء) میں براہ لداخ و ترکستان عازم وطن ہوئے - تیسری مرتبہ آپ ۷۸۵ھ (۸۴-۱۳۸۳ء) کشمیر تشریف لائے ، اور کچھ دن یہاں توقف فرمانے کے بعد اپنے وطن لوٹے ، راستے میں پاخلی میں جو اب مغربی پنجاب میں ہے دس روز تک سلطان محمد کے یہاں جو وہاں کا حاکم تھا مہمان رہے، پاخلی (پاکھلی) سے روانہ ہو کر بمقام کونر (کافرستان) پہنچے یکم ذی الحجہ ۷۸۶ھ (۱۳۸۵ء) کو بیمار ہوئے، پانچ روز تک غذا کی طرف بالکل مائل نہ تھے ، منگل کے روز ۵ ذی الحجہ کو آپ نے چند مرتبہ پانی پیا ، اور اسی رات ۷۲ سال کی عمر میں آپ نے وفات پائی ، وہاں سے آپ کی نعش کو ختلان (کولاب) لے جایا گیا ، اور ختلان میں آپ مدفون ہوئے ، پاخلی (پاکھلی) میں جہاں آپ نے وفات پائی تھی ایک خوبصورت اور شاندار خانقاہ تعمیر کی گئی جو اب تک موجود ہے -

آئین اکبری میں علامی ابوالفضل نے لکھا کہ: حضرت سید علی ہمدانی نے باجور میں جو سوات کے نزدیک ہے وفات پائی ۔ اور آپ کے جسد مبارک کو آپ کی وصیت کے مطابق ختلان لے جایا گیا -

بابر نامہ میں بابر نے لکھا کہ: جب حضرت سید علی ہمدانی کافرستان میں کونار نور گل کے مقام پر پہنچے تو کونار سے دو میل اس طرف آپ نے شارع عام پر وفات پائی ، آپ کی نعش کو ختلان لے جا کر دفن کیا گیا ، اور کونار میں جہاں آپ نے وفات پائی تھی آپ کی یادگار کے طور پر ایک عمارت تعمیر کی گئی ، بابر نے

۹۲۰ھ (۱۵-۱۵۱۴ء) میں جب چاغان سرائے کو فتح کیا تو جہاں آپ نے وفات پائی تھی وہاں پہنچ کر طواف کیا۔

سلسلۂ طریقت :

جہاں تک تذکروں سے پتا چلتا ہے وہ یہ کہ آپ کا سلسلۂ طریقت کبرویہ تھا، جس کے بانی شیخ نجم الدین کبریٰ خوارزمی (متوفی ۶۱۸ھ (۱۲۲۱-۱۲۲۲ء) ہیں، سلسلۂ کبرویہ سلسلۂ سہروردیہ سے تعلق رکھتا ہے۔

تصانیف :

حضرت سید علی ہمدانی نہ صرف عالم اور صاحب عرفان و سلوک بزرگ تھے بلکہ آپ بہت سی کتابوں کے مصنف و مؤلف بھی تھے، اب تک آپ کی جن تصانیف و تالیفات کا پتا چل سکا ہے حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ذخیرۃ الملوک : یہ کتاب جو فارسی میں دس ابواب پر مشتمل ہے ۱۳۲۱ھ میں امرتسر سے چھپی، ۱۸۲۵ء میں اس کتاب کا ترجمہ لیٹن (Latin) میں E.F. C. Rosenmucner نے کیا نیز فرانسیسی (French) میں اس کا ترجمہ C. Salnent نے کیا، جو ۱۸۲۹ء میں چھپا۔

(۲) رسالہ نوریہ (۳) رسالہ مکتوبات (۴) رسالہ در معرفت صورت و سیرت انسان (۵) رسالہ در حقائق توبہ (۶) حل النصوص علی الفصوص : شرح فصوص الحکم (۷) شرح قصیدہ خمریہ فارضیہ (۸) رسالۃ الاصطلاحات : در اصطلاحات تصوف (۹) علم القیافہ (۱۰) دہ قاعدہ (۱۱) کتاب المودۃ فی القربیٰ (۱۲) کتاب السبعین فی فضائل الاربعین (اس میں حضرت علیؓ کے ستر فضائل تحریر کیے گئے ہیں) (۱۳) اربعین امیریہ (۱۴) روضۃ الفردوس (۱۵) منازل السالکین (۱۶) اوراد الفتحیہ (۱۷) خلاصۃ المناقب۔

مقالات دانش آموزان میں مندرجہ بالا کتب کے علاوہ حضرت سید علی ہمدانی کی مزید بعض اور تصانیف کے نام ملتے ہیں ، جو یہ ہیں -

(۱۸) کتاب اسرار النقطہ (۱۹) شرح اسماء الحسنیٰ (۲۰) اختیارات المنطق در تصوف (اس کتاب کا ذکر معجم المولفین میں ملتا ہے) (۲۱) الذاتیہ (۲۲) فوائد العرفانیہ (یہ ایک مختصر رسالہ ہے) (۲۳) رسالہ سبع المثانی (۲۴) رسالہ چہل مقام و عقبات [1] (۲۵) اسرار القلبیہ (۲۶) المقلہ فی بیان النقطہ (۲۷) اخلاق محترم یا بحرم (۲۸) سر النقطہ [2] (۲۹) رسالہ منہاج العارفین

اقوال حکیمانہ :

رسالہ منہاج العارفین حضرت سید علی ہمدانی کے ارشادات عالیہ اور اقوال حکیمانہ کا گنجینۂ گراں مایہ ہے ؛ آپ نے چھوٹے چھوٹے اقوال میں اخلاق و موعظت کو نہایت دلکش اور سہل انداز میں بیان کیا ہے ، آپ کے ان اقوال میں ایک قاری "از دل خیزد بر دل ریزد" کی کیفیت محسوس کرتا ہے -

شاعری :

حضرت سید علی ہمدانی بلند پایہ شاعر بھی تھے ، آپ کے فکر رسا نے تصوف کے رموز و نکات کو نہایت حسن اور دلکشی کے ساتھ پیش کیا ہے ، عرفان و تصوف ، سوز و گداز سلاست و روانی آپ کے کلام کی خصوصیات ہیں - ہم چہل اسرار سے آپ کے چند اشعار بطور نمونۂ کلام تبرکاً ذیل میں درج کرتے ہیں :

---

(۱) یہ رسالہ چہل اسرار کے نام سے جو آپ کی ۴۱ غزلوں پر مشتمل ہے ، اس تبہر سے ۱۳۰۳ھ و ۱۳۲۳ھ میں چھپا ہے -

(۲) تذکرہ شعرائے کشمیر ، بخش دوم ، ص ۹۰۶-۹۰۷ بحوالہ مقالات دانش آموزان ، ص ۸۲-۹۰

اربابِ ذوق ، در غمِ تو آرمیده اند
از شادی و نعیمِ دو عالم رمیده اند
مرغانِ عشق را ، بدو کون التفات نیست
تا در فضای شوق تو ، روزی پریده اند
رندانِ جانفشاں ، کہ قدم بر فنا زنند
بر خوانِ دردِ ہجر ، صلای غنا زنند

کسی کز غمزہ چشمش ، چو زلفِ او پریشاں شد
ز نام و ننگ و کفر و دیں ، بکلّی بی خبر باشد
ہر سری کز سرّ عشقش ، و الہ و شیدا شود
از بد و نیک وجودِ خویش بی پروا شود

تا پریشاں گشت زلفش، بر رخِ چوں آفتاب
بادِ شوقش ابرِ جانم را ، پریشاں میکند
نالہ را ہمدم گزیں و گریہ را ہمسایہ گیر
جامِ غم بر روی ایشاں نوش کن درہر زماں
از صفای غمِ تو ، بی بصراں را چہ خبر
قدرِ ایں تحفہ، کسی یافت کہ،از اہلِ صفاست

بیا در عشق محرم باش ، زیرا
رہِ نا محرماں اندر حرم نیست
سخن دوست دریں کوی کسی را زیبد
کہ بغیر از غم یادش ، نبود پروای[1]

---

(۱) تذکرہ شعرائے کشمیر ، بخش دوم ، ص ۹۰۹ بحوالہ چہل اسرار

حضرت سید علی ہمدانی کی عالمگیر عظمت :

حضرت سید علی ہمدانی کو ان کی حیات ہی میں آن کے روحانی تبلیغی کارناموں کی وجہ سے اسلامی دنیا میں غیر معمولی شہرت و عظمت حاصل ہوئی، ایران، ترکستان، ہندوستان اور پاکستان کا چپّہ چپّہ آن کی شہرت و عظمت سے گونج اٹھا، ہمدان کے اس جلیل القدر فرزند نے کشمیر میں ایک زبردست دینی اور سماجی انقلاب لا کر اہل کشمیر کو زندگی کا ایک نیا کیف عطا کیا ۔ آوازۂ حق کی سر بلندی نے ان کو وہ عظمت اور سر بلندی عطا کی کہ دنیا ان کے نام سے گونج اٹھی ، صاحبِ مقالات دانش آموزان نے ان کی عظمت و مقبولیت کو بیان کرتے ہوئے لکھا کہ :

> سید علی را در زمانِ حیات عزت و احترامی بسزا بود ۔ و در غالب بلادِ ایران و ترکستان و ہندوستان و نزد آمراء و پادشاہان و عموم طبقات مردم مقام منزلتی خاص داشت ۔ مردمِ ہمدان نیز ویرا حرمتی عظیم مینہادند و برایؐ او حتیٰ پس از وفاتش کرامات و مقامی عالی قائل بودند ، و بقدس و جلالش اعتقادی عجیب داشتند
>
> وی از عارفانِ نیک اعتقاد و از صوفیانِ صافی ضمیر پاک نہاد بشمار است ، و علاوہ بر زہد و تقویٰ در علم و دانش نیز مقامی رفیع داشتہ و میانِ علومِ ظاہر و باطن جمع کردہ . . . میر سید علی ، نوزد ہمین قطب و شیخ سلسلۂ ذہبیہ است ، کہ بعد از پیرومرشد خود شیخ شرف الدین محمود ۔ بمقام شیخوخت و قطبی رسید ۔[1]

---

(۱) تذکرہ شعرائے کشمیر ، بخش دوم ، ص ۲۰۹ بحوالۂ مقالات دانش آموزان ۔

اولاد :

۱) نگارستان کشمیر میں قاضی ظہور الحسن سہواروی مرحوم نے حضرت سید میر محمد ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات تفصیل سے دیتے ہوئے لکھا کہ :

یہ حضرت امیر کبیر کے صاحبزادے تھے ، محدث و فقیہہ و صاحب عرفان تھے ، سلطان سکندر کے عہد میں بعمر بائیس سال مع تین سو مریدین کے ۸۰۶ھ (۴-۱۴۰۳ء) میں تشریف لائے ، بارہ سال کشمیر میں مقیم رہے ، ۸۱۸ھ (۱۶-۱۴۱۵ء) میں کشمیر میں ہی وفات پائی ، آپ کے دست حق پرست پر اس کثرت سے لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے کہ مورخ لکھتے ہیں (مشہور است کہ سہ خروار رشتہائے زنار مردمے کہ مسلمان شدند سوختہ ، ہرجا بت خانہ بود ، آن را برہم زدہ) بادشاہ کا وزیر سیہ بٹ برہمن بھی مع اعیان و اطفال مسلمان ہو گیا ۔ ۔ لڑکی کا نام جیسا کہ ہم نے باب پنجم میں لکھا ہے لچھمہ دیوی تھا ۔ مسلمان ہونے کے بعد غالباً بارعہ نام رکھا گیا ۔ ۔ سیہ بٹ کا نام سیف الدین رکھا گیا ۔ حضرت نے علاوہ اشاعت اسلام ، قدیم مسلمانوں کی بھی اصلاح فرمائی کشمیر میں جس قدر بدعات رائج ہو گئیں تھیں ، سب کو موقوف کردیا ۔ (بیمن قدوم حضرت سید سلطان نوع در رفع ظلمات بدعت و منع مزامیر و سائر مناہی و ترویج سنن نبوی علیہ الصلواۃ السلام کوشید ، کہ گویا بالحال اسلام در ولایت کشمیر آمد) سلطان سکندر و حضرت میر محمد ہمدانی و سادات دیگر رفع اکثر بدعات خصوص مزمار و سرنا و نکرنا از شہر نمودہ در آن عہد بغیر از خانہ سلطان دہل جائے نمی نواختند ، چہ جائیکہ آلات دیگر بالکل ممنوع بود ۔[۱]

---

(۱) نگارستان کشمیر : قاضی ظہور الحسن سہواروی ، ص ۲۲۸-۲۲۹

۴۴

مولانا جامی

تصوف اور شاعری میں جنھوں نے غیر معمولی شہرت و عظمت حاصل کی ، اُن میں حضرت مولانا جامی ہیں ، وہ تصوف کے آفتاب اور عرفانی شاعری کے مہتاب ہیں ان کی صوفیانہ عظمت ، اور شاعرانہ جلالت ہر دور کے اہل دل اور اہل نظر میں مسلّم رہی ہے۔ خانقاہیں آج بھی اُن کی نعتوں اور غزلوں سے گونجتی ہیں ، اور تمام صوفیہ اُن کو اپنا پیشوا اور رہبر تسلیم کرتے ہیں۔ سلاست ، روانی ، اور تصوف کی چاشنی اُن کے کلام کے خاص جوہر ہیں۔

شاعر مشرق کا تاثر :

شاعر مشرق علامہ اقبال کو مولانا جامی کے تصوف اور شاعری دونوں نے متاثر کیا ہے ، وہ جامی اور عراقی کے بے حد مدّاح و معترف ہیں۔ عراقی کے اشعار اُن کے لیے سرمایۂ تسکین ، اور جامی کے کلام کی آتش نوائیاں ، اُن کے جان و دل کو ایک نیا سوز عطا کرتی ہیں ، وہ اِن دونوں کے کلام کے تاثر کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

گہے شعر عراقی را بخوانم
گہے جامی زند آتش بجانم
ندانم گرچہ آہنگ عرب را
شریکِ نغمہ ہائے ساربانم![1]

---

(۱) ارمغان حجاز ، ص ۳۵

اسی ارمغان حجاز میں وہ منطق کے دلائل کو خام بتاتے ہیں اور مولانا جامی کے اشعار کو "درِ رازہائے معرفت کی کلید قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں :

مرا از منطق آید بوئے خامی
دلیلِ او دلیلِ نا تمامی
برویم بستہ درہا را کشاید
دو بیت از پیر رومی یا ز جامی[1]

اسرار و رموز میں اپنے آپ کو "کشتۂ انداز مولانا جامی قرار دیتے ہوئے ان کی نظم و نثر کو اپنی خامی کا علاج بتاتے ہوئے کہتے ہیں :

کشتۂ انداز ملا جامی ام
نظم و نثرِ او علاج خامیم[2]

حالات :

نویں صدی ہجری کے اس عظیم روحانی رہنما اور جلیل القدر شاعر کا نام عبدالرحمٰن ، تخلص جامی اصل لقب عماد الدین اور مشہور لقب نور الدین تھا ، ان کے والد کا نام احمد دشتی اور دادا کا نام محمد دشتی تھا ، دشت ، اصفہان کے ایک محلے کا نام ہے ، اور دشتی کی نسبت اسی محلے کی طرف ہے ۔ خوارزم شاہیہ کے زمانے میں یہ خاندان ہجرت کر کے خراسان آیا ، اور قصبہ خرجرد میں سکونت پذیر ہوا ، ان کے دادا مولانا شمس الدین دشتی نے جام میں سکونت اختیار کی ۔ حضرت عبدالرحمٰن کا تخلص اسی جام کی نسبت جامی ہے ، اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ

---

(۱) ارمغان حجاز ، ص ۱۸۹ -

(۲) کلیات اقبال فارسی (اسرار و رموز) ، ص ۲۱ -

شیخ الاسلام احمد جام[1] سے عقیدت رکھتے تھے ۔ اس لیے انھوں نے جامی تخلص اختیار فرمایا ، جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں :

مولدم جام و رشحۂ قلمم
جرعۂ جام شیخ اسلامی است

لا جرم در جریدۂ اشعار
بدو معنی تخلصم جامی است[2]

ولادت :

مولانا جامی محلہ خرجرد جام خراسان میں ۲۳ شعبان ۸۱۷ھ (۱۴۱۴-۱۵ء) کو عشاء کے وقت پیدا ہوئے ۔

تعلیم :

مولانا جامی نے ابتداءً تحصیلِ علم اپنے والد سے کی ، خود فرمایا کرتے تھے کہ میں نے زبان اپنے والد سے سیکھی ، اور صرف و نحو کی تعلیم اُن سے حاصل کی ، بچپن میں اپنے والد کے ساتھ ہرات آئے ، اور مدرسۂ نظامیہ میں داخل ہو کر مولانا جنید اصولی کے درس میں شریک ہوگئے ، پھر مولانا خواجہ علی سمرقندی سے جو اپنے زمانے کے یگانۂ روزگار علماء میں تھے ، اُن سے تعلیم حاصل کی ۔ تقریباً چالیس دن اُن کے درس میں شریک رہے ، پھر وہ مولانا شہاب الدین محمد جاجری کی خدمت میں حاضر ہوئے ، اور

---

(۱) احمد جام : ولادت : ۴۴۱ھ (۱۰۴۹-۵۰ء) وفات : ۵۳۶ھ (۱۱۴۱-۴۲ء) تصنیف : سراج السائرین (نفحات الانس ، اردو ترجمہ ، ص ۳۵۷ تا ۳۹۵) ۔

(۲) یہ تمام تفصیل جامی مؤلفہ علی اصغر حکمت ، مطبوعہ تہران ، ص ۵۹ اور میخانہ عبدالنبی ، ص ۱۰۰-۱۰۱ سے ماخوذ ہے ۔

چند روز ان کے درس میں شریک رہے - ہرات میں تحصیل علم کرنے کے بعد مولانا سمرقند تشریف لائے ، اور قاضی زادہ روم کے درس میں شریک ہوئے ، یہیں سے وہ مولانا فتح اللہ تبریزی استاد میرزا الغ بیگ[1] کی خدمت میں پہنچے ، مولانا فتح اللہ کی ملاقات کا حال میرزا الغ بیگ کو معلوم ہوا تو وہ بھی آپ کا بے حد احترام کرنے لگا ، تمام سمرقند میں یہ شہرت عام ہو گئی کہ سمرقند میں ایک ایسا نوجوان آیا ہوا ہے ، جس کی طبّاعی ، جودت اور غیر معمولی صلاحیتوں کی مثال پورے خراسان میں نہیں ملتی ، اس خبر کے پھیلنے کے بعد سمرقند کے اکثر علماء میں آپ سے ملاقات کا شوق پیدا ہوا مولانا - صلاح الدین موسیٰ قاضی ، زادہ رومی جیسے یگانۂ روزگار عالم آپ کو دیکھنے کے لیے آئے ، اور بعض اہم علمی سوالات آپ سے کیے ، مولانا جامی نے ان کے سوالات کے شافی جوابات دیے ، چنانچہ تمام علماء سمرقند مولانا جامی کے معتقد ہو گئے ، یہ خبر میرزا الغ بیگ کو پہنچی ، میرزا نے مولانا کو طلب کیا ، اور وہ بھی آپ کی ملاقاتوں سے اکتساب فیض کرنے لگا ، مولانا جامی تقریباً نو سال سمرقند میں رہے ، نو سال کے بعد آپ سلطان حسین میرزا بایقرا[2] کے عہد حکومت میں دوبارہ ہرات

---

(۱) میرزا الغ بیگ : بن میرزا شاہرخ فاضل و عالم بادشاہ تھا ، ریاضی میں بڑی مہارت رکھتا تھا ، وہ روز یک شنبہ ۱۹ جمادی الاول ۷۹۶ھ میں قلعۂ سلطانیہ میں پیدا ہوا ، اس نے ۴۱ سال سمرقند میں حکومت کی ، ۸۵۳ھ میں اپنے بیٹے میرزا عبداللطیف کی تحریک پر عباس نامی ایک شخص کے ہاتھ سے قتل ہوا "عباس کشت" سے سن کے قتل کی تاریخ نکلتی ہے ، (میخانۂ عبدالنبی ، ص ۱۰۱ تا ۱۰۲ ، حاشیہ نمبر ۲ -

(۲) سلطان حسین میرزا بایقرا : بن امیر منصور بن بایقرا بن عمر شیخ بن امیر تیمور ملقب بہ کمال الدین ، متخلص بہ

(باقی حاشیہ بر صفحہ ۳۳۵)

تشریف لائے ، شہر کے علماء و فضلا آپ کی تشریف آوری سے بہت خوش ہوئے ۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان ہی دو شہروں میں مولانا نے علوم متداولہ کی تعلیم حاصل کی ، اور علوم ظاہری میں وہ کمال حاصل کیا کہ وہ آسمان علم و فضل پر آفتاب درخشاں بن کر طلوع ہوئے ۔

روحانی تعلیم و تربیت :

علوم متداولہ کی تحصیل کے بعد آپ تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن کی طرف متوجہ ہوئے ، اور اسی شوق و جستجو نے آپ کو حضرت سعد الدین محمد کاشغری[1] کے آستانے تک پہنچایا ۔ حضرت سعد الدین کاشغری جامع مسجد ہرات کے قریب ایک مکان میں رہتے تھے ، اور جامع مسجد ہرات میں اُن کا حلقۂ ذکر و شغل رہتا تھا ، مولانا جامی اکثر اُدھر سے گزرتے تھے ، حضرت سعد الدین کاشغری اُن کو دیکھ کر فرمایا کرتے تھے کہ اس نوجوان میں غیر معمولی صلاحیتیں ہیں ، جنھوں نے مجھے اس کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲۴)

حسینی ، صاحب دولت و اقبال بادشاہ تھا ، اس نے طویل عرصے تک حکومت کی اور لمبی عمر پائی ، علماء ، فضلاء اور شعراء کا بے حد قدردان تھا ، وہ ۸۴۲ھ میں پیدا ہوا ، ۸۷۸ھ میں تخت سلطنت پر متمکن ہوا ، اور ۹۱۱ھ میں وفات پائی (میخانۂ عبدالنبی ، ص ۱۰۲ حاشیہ نمبر ۱) ۔

(۱) **حضرت سعد الدین محمد کاشغری :** نے مولانا نظام الدین اور مولانا زین الدین سے روحانی فیض حاصل کیا تھا ، آپ نے ۷ جمادی الاخریٰ بروز چہارشنبہ ۸۶۰ھ میں وفات پائی (نفحات الانس اردو ترجمہ ، ص ۴۳۳) ۔

فریفتہ بنادیا ہے ، میں سوچتا رہتا ہوں کہ کس تدبیر سے اسے قبضے میں لایا جائے ، آخر خود مولانا جامی آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کے دستِ حق پر بیعت ہوئے ، جب وہ بیعت ہونے کے لیے حاضر ہوئے تو فرمایا کہ : شاہبازے بچنگِ ما افتادہ است (ایک شہباز ہمارے قبضے میں آیا ہے) - اور آن کی خدمت میں ریاضتیں اور مجاہدے کرتے رہے ، حضرت سعدالدین کاشغری کا شجرۂ طریقت تین واسطوں سے خواجۂ بزرگ خواجہ بہاء الحق والدین معروف بہ خواجہ نقشبند[1] پر منتھی ہوتا ہے - جس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت سعد الدین ،

---

(۱) **خواجہ بہاء الحق والدین خواجہ نقشبند :** کا نام محمد بن محمد بخاری نقشبند ہے ، وہ محرم ۷۱۸ھ میں قصبۂ ''قصر عارفاں'' میں پیدا ہوئے ، جو بخارا سے ایک فرسنگ کے فاصلے پر ہے ، خواجہ بہاء الدین نقشبند کو خواجہ محمد بابا ساسی کی نظر میں قبولیت حاصل تھی ، جب وہ ''قصر عارفان'' سے گزرتے جو اس وقت ''قصر ہندوان'' کہلاتا تھا ، تو فرماتے مجھے اس خاک سے ایک ایسے مرد کی بو آتی ہے کہ جس کی بدولت یہ قصر ہندوان قصر عارفان بنے گا ، یہاں تک کہ ایک روز اس طرف سے حضرت امیر کلال گزرے جو خواجہ نقشبند کے مرید و خلیفہ تھے ، آنھوں نے فرمایا کہ مجھے اس قسم کی بو آتی ہے کہ ، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرد پیدا ہو چکا ہے جس کی خبر میرے مرشد نے دی تھی ۔

خواجہ نقشبند نے تصوف و طریقت کی تعلیم سید امیر کلال سے حاصل کی تھی یہاں تک کہ وہ سلسلۂ نقشبندیہ کے مؤسس و بانی قرار پائے ، وہ بارہ سال تک خلیل اتا کے ساتھ رہتے ، دو مرتبہ سفر حجاز کیا ، آن کے مریدوں میں خواجہ محمد پارسا مشہور

(باقی حاشیہ بر صفحہ ۳۳۷)

مولانا نظام الدین خاموش کے مرید و خلیفہ تھے ، مولانا نظام الدین خاموش نے روحانی استفاضہ خواجہ علاء الحق والدین مشہور بہ عطار سے کیا تھا ، اور خواجہ علاء الدین [1] ، خواجہ بہاء الحق معروف بہ نقشبند کے مرید و خلیفہ تھے ۔

ان کے علاوہ مولانا جامی نے جن بزرگوں سے ملاقاتیں کیں اور اُن سے اکتساب فیض کیا اُن میں اول حضرت خواجہ محمد پارسا ہیں ، نفحات الانس میں مولانا جامی نے اُن سے اپنی ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ :

> جب حضرت خواجہ محمد پارسا جمادی الاولیٰ یا جمادی الاخریٰ ۸۲۲ھ (۲۹-۱۳۲۸ء) میں سفر حجاز کے ارادے سے جام سے گزرے تو میرے والد اپنے مخلصوں اور نیاز مندوں کے ساتھ ان کی زیارت اور استقبال کے لیے شہر سے باہر نکلے ، اس وقت میری عمر کے پانچ سال بھی پورے نہ ہوئے تھے ، میرے والد نے اپنے ساتھیوں میں سے ایک سے کہا کہ مجھے کاندھے پر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۳۶)

ہیں ۔ خواجہ نقشبند نے ۳ ربیع الاول ۷۹۱ھ کو "قصر عارفاں" میں وفات پائی ، دو کتابیں دلیل العاشقین اور تصوف میں حیات نامہ اُن کی طرف منسوب ہیں (کارنامۂ بزرگانِ ایران ص ۲۷۳-۲۷۴) ۔

(۱) خواجہ علاء الدین عطارؒ کا نام محمد بن محمد بخاری ہے ، جو حضرت نقشبند کے مرید و خلیفہ ہیں خواجہ علاء الدین عطار نے بروز چہار شنبہ بعد نماز عشاء ۲۰ رجب ۸۰۲ھ میں وفات پائی (نفحات الانس ۔ اردو ترجمہ ، ص ۴۲۱) ۔

پر بٹھا کر حضرت خواجہ محمد پارسا کے محافے کے قریب کرے ، چنانچہ اس نے مجھے محافے کے قریب کیا ۔ آپ میری طرف متوجہ ہوئے ، اور مجھے ایک سیر کرمانی مصری عنایت فرمائی ، میری عمر کے ساٹھ سال گزر چکے ہیں ، لیکن اب تک ان کی نورانی صورت میری آنکھوں میں ہے اور آپ کے دیدار مبارک کی لذّت میرے دل میں ہے ، اور اس فقیر کو جو ارادت مندی و عقیدت اور محبت خاندان خواجگان قدس اللہ تعالیٰ ارواحھم سے ہے ، شاید اُن ہی کی نگاہ فیض اثر کا نتیجہ ہے ، مجھے امید ہے کہ اسی تعلق اور محبت کی وجہ سے اُن کے محبّوں اور مخلصوں کے زمرے میں میرا حشر ہوگا۔[۱]

رشحات عین الحیٰوۃ کے حوالے سے علی اصغر صاحب حکمت نے اپنی تالیف "جامی" میں مولانا جامی کی ملاقات کا تذکرہ ایک اور بزرگ مولانا لورستانی سے بھی کیا ہے ، مولانا جامی نے اس ملاقات کا حال نفحات الانس میں قلم بند کرتے ہوئے لکھا کہ :

ایک مرتبہ میرے دل میں آیا کہ میں مولانا فخر الدین لورستانی کی خدمت میں حاضر ہوں ، جو خرجرد جام میں ایک سرائے میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ جس کا تعلق میرے والد سے تھا ، جس زمانے میں میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا ، میں اس قدر کم عمر تھا کہ مولانا نے مجھے اپنے زانو کے سامنے بٹھا لیا ، آپ اُنگلی سے ہوا میں حضرات علیؓ اور حضرت عمرؓ کے نام لکھتے جاتے تھے ، اور میں اُن کو پڑھتا جاتا تھا ،

---

(۱) نفحات الانس (اردو ترجمہ) ، ص ۴۲۲-۴۲۳ -

آپ متبسم ہوتے تھے اور میری کم عمری اور پڑھنے پر تعجب فرماتے تھے ، اُن کی محبت و شفقت نے میرے دل میں ان کی محبت اور عقیدت کا بیج بویا ، اور اسی وقت سے یہ عقیدت برابر بڑھتی جاتی ہے ، میری تمنا ہے کہ اُن ہی کی محبت میں جیوں اور اُن ہی کی محبت میں مروں ، اور اُن کے دوستوں کے زمرے میں اٹھایا جاؤں ۔[1]

صاحب رشحات عین الحلیوات نے خواجہ برہان الدین ابو نصر پارسا قدس سرہ سے مولانا جامی کی ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے بحوالہ نفحات الانس لکھا ہے کہ مولانا جامی کو ان سے بہت زیادہ ملاقات کا اتفاق ہوا ، مولانا جامی کا بیان ہے کہ :

میں ایک دن اُن کی مجلس میں حاضر تھا کہ شیخ محی الدین ابن عربی اور اُن کی تصانیف کا ذکر چلا ، حضرت ابو نصر پارسا نے اپنے والد کے حوالے سے بیان فرمایا کہ فصوص جان ہے ، اور فتوحات دل ؛ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ جو فصوص کو اچھی طرح جانتا ہے ، اس کا متابعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا داعیہ قوی ہو جا تا ہے ۔[2]

ان کے علاوہ مولانا نے نفحات الانس میں جن بزرگوں سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے ان میں حضرت شیخ بہاء الدین عمر ، خواجہ شمس الدین محمد کوسوئی ، مولانا جلال الدین پورانی ، اور مولانا شمس الدین محمد اسد رحمتہ اللہ علیہم اجمعین ہیں ۔[3]

---

(۱) نفحات الانس (اردو ترجمہ) ، ص ۴۸۲-۴۸۳ ۔

(۲) نفحات الانس (اردو ترجمہ) ، ص ۴۲۶-۴۲۷ ۔

(۳) جامی (علی اصغر حکمت) ، ص ۷۰-۷۱ ۔

حضرت خواجہ ناصر الدین عبید اللہ
معروف بہ خواجہ احرار مرشد مولانا جامی

حضرت شیخ سعد الدین کاشغری کی وفات کے بعد، مولانا جامی کی روحانی صلاحیتوں کو بحیثیت مرشد ہونے کے جس نے سنوارا اور نکھارا، اور سلوک و معرفت کی منزلوں کو طے کرایا، وہ خواجہ ناصر الدین عبید اللہ احرار علیہ الرحمہ ہیں۔

خزینتہ الاصفیاء میں ہے کہ مولانا جامی پہلے حضرت سعد الدین کاشغری کے مرید ہوئے اور آن کی خدمت میں رہ کر نہایت سخت ریاضتیں اور مجاہدے کیے، پھر آخر میں حضرت خواجہ ناصر الدین عبید اللہ احرار سے بیعت ہو کر سلوک اور تزکیۂ نفس کی منزلیں طے کیں، یہاں تک کہ ارشاد و ہدایت کے مرتبے پر فائز ہوئے، وہ نقشبندیہ سلسلے کے اکابر شیوخ میں شمار کیے جاتے ہیں۔[1]

تاریخ ادبیات ایران میں ہے کہ مولانا جامی حضرت خواجہ سعد الدین نقشبندی کی وفات کے بعد سلسلہ نقشبندیہ کی خلافت سے سرفراز ہوئے، اور ان کی بزرگی کی شہرت عالم میں پھیل گئی، چھوٹے بڑے، امیر و غریب سب ان کا احترام کرتے تھے۔[2]

حضرت خواجہ عبید اللہ احرار کی عظمت و جلالت شان کا اندازہ اس سے کیجیے کہ وہ نقشبندیہ سلسلے کے سرخیل صوفیہ میں شمار ہوتے ہیں، داراشکوہ نے سفینتہ الاولیاء میں حضرت خواجہ عبید اللہ احرار کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا کہ:

(۱) خزینتہ الاصفیا، جلد ۱: ص ۵۸۶ و تاریخ ادبیات ایران (شفق)، ص ۳۵۰۔

(۲) تاریخ ادبیات ایران (شفق)، ص ۳۵۱۔

آپ کا لقب ناصر الدین احرار ہے ، آپ کے والد ماجد کا نام خواجہ محمود بن شہاب الدین ہے ... آپ سلسلہ خواجہ احراری کے سرتاج ہیں ، اور طریقت کے مقتدا اور راہ حقیقت کے راہ نما ہیں ، ماوراء النہر اور خراسان کے لوگ آپ کو بہت بڑا مانتے تھے ، ... آپ کی ولادت ماہ رمضان ۸۰۶ ھ میں تاشقند کے ایک قریے باغستان میں ہوئی اور آپ کی وفات ۲۹ ربیع الاول ۸۹۵ ھ (۱۴۹۰ء) کو ہوئی ، آپ کی عمر چند مہینے کم نوے سال کی ہوئی ؛ مزار مبارک سمر قند میں ہے۔[1]

علی اصغر صاحب حکمت نے اپنی تالیف ''جامی'' میں بحوالۂ رشحات عین الحیات لکھا ہے کہ مولانا جامی اور خواجہ عبید اللہ احرار کی چار ملاقاتیں ہوئیں ، دو مرتبہ سمر قند میں اور تیسری مرتبہ یہ ملاقات ہرات میں ہوئی ، جب کہ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار میرزا سلطان ابو سعید کی ملاقات کے لیے ماوراء النہر سے خراسان تشریف لائے تھے اور مولانا جامی بھی ان کی ملاقات کے لیے ہرات سے مرو گئے تھے ، اس ملاقات کا حال مولانا جامی نے بیان کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ :

نواح مرو میں خواجہ عبید اللہ مد ظلالہ نے اس کمینے سے پوچھا کہ تمھاری عمر کیا ہوگی ؟ میں نے جواب میں عرض کیا کہ اس وقت میری عمر تخمیناً پچپن سال ہے ، فرمایا کہ ہم تم سے بارہ سال عمر میں بڑے ہیں ۔[2]

---

(۱) سفینتہ الاولیاء (اردو ترجمہ) ، ص ۱۱۴-۱۱۵ -

(۲) یہ تمام تفصیل ''جامی'' (تالیف علی اصغر حکمت) ، ص ۷۱-۷۲ سے ماخوذ ہے -

اس ملاقات سے قبل اور اس ملاقات کے بعد بھی پیر و مرید میں خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہتا تھا ، جو عقیدت و اخلاص مولانا جامی کو حضرت خواجہ عبید اللہ احرار سے تھا ، اس کا اندازہ ان مکاتیب اور مولانا کی منظوم و نثری تصانیف سے ہوتا ہے ۔ مولانا جامی نے اپنی تصانیف میں جا بجا خواجہ عبید اللہ احرار کی بے پایاں محبت و عقیدت کے جو رنگ برنگ کے پھول بکھیرے ہیں ، وہ آج بھی اہل سلوک و معرفت کے مشام جان کو معطر کیے ہوئے ہیں ، یہ گلہائے عقیدت ہمیں مولانا جامی کی مختلف تصانیف میں ملتے ہیں ، مثنوی تحفتہ الاحرار میں اپنی نسبت کو سلسلۂ نقشبندیہ سے وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے ، خواجۂ نقشبند علیہ الرحمہ کی مدح و منقبت کرتے ہوئے ، اپنے مرشد خواجہ عبید اللہ احرار کی مدح و توصیف میں یوں رطب اللسان ہیں :

زد بجہاں نوبت شاہنشہی
کوکبۂ فقر عبید اللہی

آنکہ ز حریت فقر آگہ ست
خواجۂ احرار عبید اللہ ست[1]

اسی مثنوی کے شروع میں مولانا جامی نے سلوک کی ان تین منازل یعنی علم الیقین ، عین الیقین اور حق الیقین کو بیان کیا ہے ، جو انہوں نے اپنے پیر و مرشد حضرت خواجہ عبید اللہ احرار کی خدمت میں رہ کر طے کیں ، مولانا کے دلکش انداز بیان اور شیرینی گفتار اور اپنے شیخ کی والہانہ عقیدت و محبت نے ان کے ان اشعار میں ایک عجیب تاثراتی کیفیت پیدا کردی ہے ۔[2]

---

(۱) جامی (تالیف علی اصغر حکمت) ، ص ۱۵۷
(۲) جامی (تالیف علی اصغر حکمت) ، ص ۵۷

ہمیں مولانا جامی کی اپنے شیخ سے عقیدت و محبت کا نقش ان کے دیوان سوم خاتمۃ الحیٰوۃ کے اس ترکیب بند میں نہایت گہرا نظر آتا ہے ، جو انھوں نے سات بند حضرت خواجہ عبید اللہ احرار کی وفات پر کہے ہیں ، پہلے بند کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے :

موج زن می بینم از ہر دیدہ طوفان غمی
می رسد در گوشم از ہر لب صدای ماتمی

آخری بند میں اس سانحۂ عظیم کے تاثر کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں :

خواجہ رفت و ما بہ داغ فرقتش ماندیم اسیر
کم مبادا ہرگز از فرق مریدان ظل پیر

دوسرے بند میں ایک شعر میں فرماتے ہیں :

خواجۂ کش معنی فقر از ازل ہمراہ بود
ناصر الدین ، نصرت الدنیا عبید اللہ بود

پانچویں بند میں وہ خواجہ احرار کی وفات کو نہ صرف ماوراء النہر کے لیے مصیبت بتاتے ہیں ، بلکہ ان کی وفات کو عالم کا نقصان قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں :

این مصیبت نیست خاص ماوراء النہریان
تیرہ شد ہر شہر از این ناخوش خبر بر شہریان

اسی دیوان میں انھوں نے خواجۂ احرار کی وفات پر دو قطعۂ تاریخ کہے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے :

بہ ہشت صد و نود و پنج در شب شنبہ
کہ بود سلخ سہہ قوت احمد مرسل

کشید خواجہ دنیا و دیں عبید اللہ
شرابِ صافیِ عیشِ ابد ز جامِ اجل[1]

مولانا جامی کا تصوف میں مسلک :

مولانا جامی تصوف میں شیخ محی الدین ابن عربی کے اصولوں کے پیرو تھے ، اسی لیے انھوں نے اپنی تصانیف میں ابن عربی اور ان کے شاگردوں کے آثار و اقوال کی توضیح و تشریح کی ہے ۔ انھوں نے ''نقد النصوص'' کے نام سے ''فصوص'' کی شرح لکھی اور لمعات کی شرح اشعۃ لکھ کر اس مسلک پر جادہ پیما نظر آتے ہیں جو شیخ ابن عربی کا تھا شرح لمعات میں انھوں نے جا بجا استناد فصوص یا فتوحات سے کیا ہے ۔

وہ شیخ ابن عربی کے فلسفہ وحدت الوجود کے شدت سے قائل ہیں ، ان کا تصوف میں نقطہ نظر یہ ہے کہ عشق حقیقی انسان کو سعادتِ سرمدی تک پہنچاتا ہے ، ان کا خیال ہے کہ عاشق و معشوق اور عشق یہ تمام مظاہر ایک وجود مطلق کے ہیں ۔ اور معشوق و محبوب بلکہ عاشق و محب تمام مراتب میں حضرت حق ہیں ... اشکال مختلفہ کی کثرت ، واحد حقیقی کی وحدت پر اثر انداز نہیں ہوتی ، عین کثرت میں بھی کثرات اشکال مختلفہ واحد حقیقی کی وحدت پر اثر انداز نہیں ۔

جامی صفات کی بھی دو قسمیں بتاتے ہیں ایک وجودی اور دوسری عدمی ، جو صفات وجودی ہیں وہ معشوق سے نسبت رکھتی ہیں ، اور جو عدمی ہیں وہ صفات عاشق سے نسبت رکھتی ہیں ۔ پس غنا صفت معشوق کی ہے ، اور فقر عاشق کی صفت ہے ، فقر کے لیے فضائل و منازل ہیں ، عاشق کو چاہیے کہ وہ غرض سے پاک

---

(۱) یہ تمام تفصیل ''جامی'' (تالیف علی اصغر حکمت) ، ص ۷۶ سے ماخوذ ہے ۔

ہو ۔ اور اپنی طلب و خواہش کو درمیان سے نکال لے ، اُس کے پیش نظر صرف معشوق کی رضا ہونی چاہیے ، اُسے معشوق کی مرضی اور نا مرضی کا امتیاز ہونا چاہیے ، اسی وجہ سے عاشق سالک، مکلّف ہوتا ہے صوری اور معنوی مجاہدات میں سے اشتغالِ افعال اور اعمال کا۔ صفات وجودی جو عاشق میں بظاہر نظر آتی ہیں ۔ درحقیقت وہ معشوق کی صفات ہیں ، جو عاشق کے پاس امانت ہیں -

عاشق کے معشوق تک واصل ہونے کی تین منزلیں ہیں ، وہ علم الیقین ، عین الیقین ، اور حق الیقین ہیں ، اس کی مثال یہ ہے کہ جب کوئی آنکھیں بند رکھتا ہے ، اور حرارت سے آگ کے وجود کا علم حاصل کرتا ہے ، اس کا علم علم الیقین ہے ، جب وہ آنکھیں کھولتا ہے اور آگ کو دیکھتا ہے تو اُس کا یہ علم عین الیقین ہے ، اور جب وہ آگ میں پڑ کر آگ بن جاتا ہے ، اور فنا ہو کر آگ کی صفات اس سے ظاہر ہونے لگتی ہیں تو اس کا یہ علم حق الیقین ہے ۔[1]

لوائح کی ابتدا میں ہمیں مولانا جامی کی ایک مناجات ملتی ہے ۔ جو اُن کے مسلک تصوف کی آئینہ دار ہے ، اور اُن کی تعلیمات تصوف کا عطر و خلاصہ ہے ، یہی اصول تصوف اُن کی تمام کتابوں میں پھیلے ہوئے ہیں ، اس مناجات کا ترجمہ یہ ہے :

> الٰہی ! ہم سے وہ تمام برائیاں چھڑادے ، جن سے تونے ہمیں منع کیا ہے ، اور حقائق اشیا کو ہمیں ان کی اصلی صورت میں دکھا ، اور غفلت کا پردہ ہماری چشم بصیرت سے اٹھادے ، اور ہر چیز جیسی وہ ہے ہمیں دکھا ، نیستی کو ہستی کی صورت میں جلوہ مت دے

(۱) یہ تمام تفصیل جامی (تالیف علی اصغر حکمت) ص ۱۴۴ تا ۱۴۷ سے ماخوذ ہے

اور نیستی سے جمال ہستی پر پردہ مت ڈال، ان صور خیالی کو اپنے تجلیات کے جمال کا آئینہ بنا، نہ حجاب اور دوری کا سبب بنا، ان وہمی نقوش کو ہماری دانائی و بینائی کا سرمایہ بنا، اور جہالت و کوری محرومی اور مہجوری کا ذریعہ نہ بنا... ہم کو "انا" سے رہائی دے اور اپنی ذات سے آشنائی عطا فرما:

یا رب دل پاک و جان آگاہم دہ
آہ شب و گریۂ سحر گاہم دہ
در راہ خود اول ز خودم بے خود کن
آنکہ بے خود را بسوی خود راہم دہ[1]

شاعری:

مولانا جامی کو قدرت نے سوز و گداز سے مملو قلب عطا فرمایا تھا، انھوں نے تصوف کے حقائق و رموز کو شعر کے پردے میں ڈھال کر فارسی شاعری کو ایک نیا حسن و دل کشی بخشی ہے۔ وہ نویں صدی ہجری کے ان بلند پایہ صوفی شعرا میں ہیں کہ ان کے نام کو انوری، سعدی، مولانا جلال الدین رومی، حافظ و خیام اور فردوسی کے ساتھ لیا جاسکتا ہے۔ وہ صوفیانہ شاعری کی آبرو ہیں، اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے فارسی شاعری کو ایک نیا رنگ و آہنگ بخشا ہے، ان کے کلام میں صاف و شفاف بہتے ہوئے چشموں کی سی روانی ہے، اثر و تاثیر، سوز و گداز، علوئے تخیل، سلاست و روانی اور تصوف کی چاشنی ان کے کلام کے خاص جوہر ہیں۔

جامی جن شعرائے کرام سے متاثر نظر آتے ہیں، اور اپنے کمال شاعری کو جن کے دواوین کے مطالعے کا رہین منت بتاتے ہیں، ان کا

(۱) جامی (علی اصغر حکمت) ص ۱۴۷ -

تذکرہ انھوں نے نہایت ادب و احترام کے ساتھ اپنی تصنیف نفحات الانس میں صوفیہ کی فہرست میں کیا ہے ، اور ساتھ ہی اپنے اشعار میں یہ بھی واضح کیا ہے کہ ان بزرگوں کے اشعار کس فن میں مولانا جامی کے رہنما ثابت ہوئے ، مثلاً وہ ایک جگہ اپنے طرز غزل سرائی کو کمال خجندی سے منسوب کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

جامی از آں لب سخن آغاز کرد
شد لقبش طوطی شیریں مقال
یافت کمالش سخنش تا گرفت
چاشنی از سخنانِ کمال

خاقانی[1] کے ایک قصیدے کا اپنے قصیدے میں تتبع کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ۔

سخن آں بود کز اول نہاد استاد خاقانی
بہ مہمان خانۂ گیتی پئی دانشوران خوانش

وہ اپنی مثنوی سرائی کو حکیم نظامی[2] اور امیر خسرو کا فیض بتاتے ہیں ، کئی مثنویوں میں مولانا جامی نے ان دونوں شعرائے کرام کا نام نہایت عزت و احترام سے لیا ہے اسی طرح انھوں نے قدیم

---

(۱) خاقانی : افضل الدین بدیل بن علی بخاری متخلص بہ خاقانی شروانی ۔ ولادت : ۵۲۰ھ وفات : ۵۹۵ ، مقام وفات : تبریز ، تصانیف : تحفۃ العراقین و دیوان (بزرگانِ ایران ، ص ۶ ، ۲۰۲ ـ ۲۰۷)

(۲) نظامی : حکیم الیاس بن یوسف بن زکی بن موید نظامی ولادت : ۵۳۵ھ بمقام گنجہ ۔ وفات : ۵۹۹ھ ۔ تصانیف : مخزن الاسرار ، خسرو شیرین ، لیلیٰ مجنوں ، ہفت پیکر ، بہرام نامہ ، اسکندر نامہ ۔ (بزرگانِ ایران ، ص ۲۲۸ ـ ۲۲۹)

سخنوروں یعنی رودکی ، عنصری[1] ، معزی[2] ، انوری[3] ، سنائی ، کمال ، سلمان وغیرہ کا تذکرہ بھی نہایت عزت و احترام سے کیا ہے ، یہ اشعار علی اصغر حکمت کی کتاب جامی صفحہ ۱۲۱ و ۱۲۲ پر منقول ہیں ۔

اسی طرح مثنوی ''سلامان و ابسال'' میں جو انھوں نے عارف رومی کی مثنوی کے وزن میں کہی ہے مولانا جلال الدین رومی کو سراہا ہے ، مثنوی سبحۃ الابرار میں ، شیخ سعدی کی توصیف عقد سوم میں فرماتے ہیں :

سعدی آں بلبل شیراز چمن
درگلستان سخن دستان زن

اصناف سخن میں کوئی صنف ایسی نہیں ، جس میں مولانا نے طبع آزمائی نہ کی ہو، اور اپنی رفعت تخیل سے اس زمین کو آسمان پر نہ پہنچا دیا ہو ۔ شاعری میں جو بلند مقام مولانا جامی کو حاصل ہے ، اور جو مقبولیت ان کو مختلف ممالک میں حاصل ہوئی ، اور کس طرح ان کی شاعری عالمگیر بنی ، وہ ایک قصیدے میں جو انھوں نے اپنی وفات سے چھ سال پہلے لکھا تھا اپنی مقبولیت و شہرت کی وجوہ کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

---

(۱) عنصری : ابو القاسم حسن بن احمد متخلص بہ عنصری ۔ وفات : ۴۳۱ھ (بزرگان ایران ، ص ۷۶)

(۲) معزی : ابو عبد اللہ محمد بن عبد الملک نیشاپوری متخلص بہ معزی ۔ وفات : ۵۲۸ھ (بزرگان ایران)

(۳) شیخ سعدی : شیخ مشرف الدین مصلح بن عبد اللہ سعدی شیرازی ۔ ولادت : ۶۰۴ھ مقام پیدائش : شیراز ۔ وفات : ۶۹۴ھ ۔ مدفن : سعدیہ شیراز (بزرگان ایران ، ص ۸۵۲ تا ۲۶۲)

ز طورِ طور گزشتم ولی نشد ہرگز
ز فکرِ شعر نه شد حاصلم فراغتِ بال

ہزار بار ازیں شغل توبه کردم لیک
از آں نبود گریزم چوں سایر اشغال

چناں به شعر شدم شہره در بسیطِ جہاں
که شد محیطِ فلک زیں ترانه مالا مال

عروسِ دہر پئی زیب گوش و گردن خویش
ز سلک گوہر نظمم گرفت عقد لآل

سرودِ عیش ز گفتارِ من کند مطرب
رہِ سماع ز اشعارِ من زند قوّال

اگر بفارس رود کاروانِ اشعارم
رواں "سعدی" و "حافظ" کنندش استقبال

وگر به ہند رسد خسرو[1] و حسن[2] گویند
که ای غریبِ جہاں مرحبا تعال تعال

ز بس که سوی ہر اقلیم گفتگویم رفت
شدند سخرهٔ اقوالِ من همه اقبال

گہی ز روم نویسد سلامِ من قیصر
گہی ز ہند فرستد پیام من جیپال

رسد ز والیِ ملکِ عراق و تبریزم
عواطفِ متواتر منائحِ متوال

چه دم زنم ز خراسان و اہل احسانش
که ہستم از کفشاں غرقِ بحر و برِّ نوال[3]

---

(۱) امیر خسرو (۲) حسن سجزی۔

(۳) جامی (تالیف علی اصغر حکمت)۔

مولانا جامی کا مرتبہ نعت گوئی میں بہت بلند ہے ۔ سماع کی محفلیں آج بھی ان کی نعتوں سے زینت پاتی ہیں ، اور اہل دل کے لیے آج بھی ان کی نعتیں سرمایہ تسکین دل و جاں ہیں ، مولانا کا ایک بڑا شاعرانہ کمال یہ ہے کہ وہ نہ صرف عربی زبان و ادب سے واقف تھے بلکہ اس میں تبحر اور گہری بصیرت رکھتے تھے ۔ یہ امر ان کے عربی اشعار سے واضح ہوتا ہے ، انھوں نے عربی زبان میں جو تالیفات کی ہیں ، وہ بھی اس کی شاہد ہیں ۔ عربی ادب ان کے لیے ایک ایسا گراں بہا گنجینہ تھا کہ وہ اس کے آبدار موتیوں اور اس کے جواہر رنگا رنگ سے اپنی بساط دانشوری کو سجاتے تھے ، اگر یہ کہا جائے کہ یہ خراسانی زادہ عراق ، سوریہ اور مصر کے اساتذہ کی ہمسری کرتا تھا تو یہ کہنا بیجا نہ ہو گا ۔

مولانا جامی کی بعض غزلوں میں فارسی اور عربی کے دلکش امتزاج نے غزل کی ایک خوبصورت صنف کو جنم دیا ہے ، ان کا کمال یہ بھی ہے کہ انھوں نے بہت سے عربی خیالات و افکار کو فارسی شعر کا جامہ پہنا کر فارسی شاعری کو ایک نیا حسن عطا کیا ہے ، کہا جا سکتا ہے کہ شیخ سعدی کے بعد فارسی اشعراء میں جامی پہلے شخص ہیں کہ جنھوں نے عربی ادب کو فارسی زبان میں منتقل کیا ہے ۔

اس کے علاوہ مولانا جامی نے اپنی مثنویوں سلسلتہ الذہب ، تحفتہ الاحرار اور سبحتہ الابرار وغیرہ میں بہت سے مطالب عالیہ اور آیات قرآنی ، احادیث نبوی اور صوفیہ کی حکایات ، امثال اور اشعار عرب کو شیریں فارسی میں منتقل کر کے عربی اور فارسی ادب کی عظیم خدمت انجام دی ہے ۔

اس نوعیت کے مولانا جامی کے یہ چند شعر فارسی اور عربی کے حسین امتزاج کا ایک دلکش مرقع ہیں :

أحِنُّ شوقاً الیٰ دیارٍ لقیتُ فیھا جمالَ سلمیٰ
کہ میرساند از آن نواحی نویدِ لطفی بجانبِ ما
بناز گفتی فلاں کجائی، چہ بود حالت دراین جدائی
مرضتُ شوقاً و متُّ ھجراً فکیف اشکو الیک شکویٰ[۱]

دولت شاہ جو مولانا جامی کا معاصر ہے ، اس نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ مولانا جامی نے آخری عمر میں شاعری ترک کر دی تھی ، اور ہمہ تن دینی مسائل کی تحقیق میں مصروف ہو گئے تھے ۔[۲]

سیاحت :

مولانا جامی نے اپنی زندگی میں جو سفر اختیار کیے ، ان کی تفصیل دیتے ہوئے جناب علی اصغر حکمت نے لکھا کہ ان کا پہلا سفر وہ تھا ، جو انھوں نے بچپن میں اپنے والد کے ہمراہ جام سے ہرات کا کیا تھا ، آپ کا دوسرا سفر وہ ہے جو جوانی میں شاہ رخ کے عہدِ حکومت میں ہرات سے سمر قند کا کیا تھا ۔ تیسرا سفر وہ تھا جب آپ سمر قند سے ہرات آئے ، اور مولانا سعد الدین کاشغری کے دستِ حق پرست پر بیعت ہوئے ، آپ کا چوتھا سفر ہرات سے مرو کا تھا ، جب آپ خواجہ عبید اللہ احرار کی زیارت کے لیے مرو گئے ۔ پانچواں سفر پھر سمر قند کا تھا ، جو ۸۷۰ھ (۱۴۶۵ء) میں آپ نے خواجہ احرار کی ملاقات کے لیے کیا تھا ۔ چھٹا سفر پھر سمر قند کا تھا ، جو آپ نے ۸۸۴ھ میں تاشقند کے لیے خواجہ احرار کی ملاقات کے لیے کیا تھا ۔

ان ممالک کی سیاحت کے بعد مولانا جامی حرمین شریفین حاضر ہو کر حج و زیارت سے مشرف ہوئے ، اور ۸۸۸ھ ۱۴۸۳ء میں

---

(۱) جامی (تالیف علی اصغر حکمت) ۔
(۲) تاریخ ادبیات ایران (شفق) ص ، ۳۵۱ ۔

مختلف ممالک سے ہوتے ہوئے خراسان تشریف لائے ، اسی سفر میں اہل بغداد سے آپ کو کچھ آزردگی ہوئی ۔ جس کی وجہ سے آپ وہاں سے دل شکستہ ہوئے ، ایک غزل میں اہل بغداد کی شکایت کرتے ہوئے کہتے ہیں :

بکشای ساقیا بلب شط سر سبوی
وز خاطر کدورت بغدادیاں بشوی[1]

اخلاق

مولانا جامی صفات حسنہ اور حسن اخلاق کا پیکر تھے ۔ آن کے صحیفہ اخلاق میں ذوق علم ، تقدس ، عزت نفس ، استغنا ، سادگی ، تواضع ، انکسار ، خدمت خلق ، تہذیب نفس اور تزکیہ باطن کا عکس نمایاں نظر آتا ہے ۔

ذوق علم :

وہ صفت جو مولانا جامی کو دوسروں سے ممتاز بناتی ہے ، وہ آن کا غیر معمولی ذوق علم ہے ، اکتساب علم آپ کی فطرت بن چکا تھا ، یہی وجہ تھی کہ مولانا جامی آغاز شباب سے لے کر عہد پیری تک مسلسل ایک طالب علم نظر آتے ہیں ، اکتساب علم کے سلسلے میں وہ ایک لمحے کے لیے غافل نہیں ہوئے ۔ آن کی ذات ہر طالب علم کے لیے ایک بہترین نمونہ و مثال ہے ۔

آن کے وقت کا بڑا حصہ مطالعے میں گزرتا تھا ، علوم حقیقی اور رسمی میں آن کا تبحر اور کمال عالم میں مشہور تھا ، وہ علمی مسائل میں فرمایا کرتے تھے کہ جب تک میں بات کی حقیقت اور

---

(۱) اسنادکی یہ تفصیل جامی (تالیف علی اصغر حکمت) ص ۸۱ تا ۸۳ سے ماخوذ ہے ۔

کشندہ کو نہیں پہنچ جاتا ، اس بات کو زبان سے نہیں نکالتا ۔ مولانا جامی کے اشعار میں ان کا ذوق اور شوق کتاب کا عکس نمایاں نظر آتا ہے ایک رباعی میں فرماتے ہیں :

خوش تر ز کتاب در جہان یاری نیست
در غمکدۂ زمانہ غم خواری نیست
ہر لحظہ از او بگوشۂ تنہائی[1]
صد راحتی است و ہر گز آزاری نیست

وہ کتاب کو سب سے بہتر رفیق و انیس قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں :

بکن زین کارخانہ در کتب روی
خیال خویش را دہ با کتب خوی
انیس کنج تنہائی کتاب است
فروغ صبح دانائی کتاب است
بود بی مزد و منت اوستادی
ز دانش بخشدت ہر دم کشادی
درونش ہمچو غنچہ از ورق پر
بہ قیمت ہر ورق زان یک طبق در[2]

فقر و درویشی :

مولانا جامی باوجود اس کے کہ فقر و درویشی کے اعلیٰ منازل پر فائز تھے لیکن تواضع و فروتنی کا یہ عالم تھا کہ آپ کی کسی ادا سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ آپ فقر و درویشی کے مدعی ہیں ۔ ہمیشہ اذکار و اشغال اور ریاضتوں اور مجاہدوں میں مصروف رہتے اور تمام آن درویشانہ اور صوفیانہ صفات سے آراستہ تھے ، جن کی مشائخ و صوفیائے کرام تعلیم دیتے ہیں ۔

---

(۱) جامی (علی اصغر حکمت) ص ۸۹

(۲) ایضاً ، ص ۸۹ بحوالۂ مثنوی یوسف زلیخا ۔

بے حد متبع شریعت تھے ، کھانے پینے میں مشتبہات سے پرہیز فرماتے ، بادشاہوں اور حکام کی مجالس میں اگر کوئی چیز مشتبہ ہوتی ۔ تو آپ کے کھانے کے لیے کوئی دوسری چیز لائی جاتی ۔ اس طور پر کہ اہل مجلس اس سے واقف نہ ہوتے تھے -

رات دن کا نظام العمل یہ تھا کہ عشا کی نماز کے بعد ایک گھنٹے لوگوں کے ساتھ بیٹھتے ، جب مجلس برخاست ہوتی تو معمول کے مطابق اہل مجلس کے ساتھ کچھ ذکر و شغل فرمایا کرتے تھے کہ سونے سے پہلے یہ شغل ضروری ہے کہ اس کی برکت تمام رات رہتی ہے ابتدائی زمانے میں بہت کم استراحت کرتے تھے ۔ جب جاگتے تھے تو نماز اور مراقبے میں مشغول ہو جاتے تھے ، فرمایا کرتے تھے کہ مناجات سحر گاہی کی برکت تمام دن رہتی ہے فجر کی نماز کے لیے تجدید وضو کرتے ، فجر کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد مراقبہ کرتے ، یہاں تک کہ سورج ایک نیزہ بلند ہو جاتا ، دوسرے اوقات میں مراقبہ ، تصنیف اور مطالعے میں مشغول رہتے-[1]

نشست و برخاست اور لباس میں بھی انکسار اور فروتنی نمایاں تھی ، ہمیشہ تشہد کے طریقے پر بیٹھتے ، کوشش کرتے کہ ہمیشہ قبلہ رو بیٹھیں ۔ اکثر زمین پر بیٹھتے ، ہر ایک سے خندہ روئی سے پیش آتے ، مجلس میں کم تر جگہ پر بیٹھتے ، اکثر دہلیز کے قریب بیٹھتے ، غریبوں کے ساتھ کھانا کھاتے ، سادہ کھانے رغبت سے کھاتے ، جو کچھ آپ کے پاس ہوتا اسے کار خیر میں خرچ کرتے ، شہر ہرات میں آپ نے ایک مدرسہ قائم کیا تھا ، مدرسے کے متصل آپ کی خانقاہ تھی ، اور جام میں ایک جامع مسجد تعمیر کی تھی -

---

(۱) یہ تمام تفصیل جامی (تالیف علی اصغر حکمت) ص ۹۰ تا ۹۳ بحوالہ مولانا عبد الغفور لاری منقول ہے -

عزت نفس اور استغنا :

عزت نفس و استغنا مولانا جامی کی سیرت و کردار کا خاص عنوان ہے ، فرمایا کرتے تھے کہ میں نے ایام شباب میں بھی کبھی اپنی ضروریات کے لیے ذلت و خواری اختیار نہیں کی چنانچہ سمرقند اور ہرات کے اکثر عالم و فاضل قاضی روم اور مولانا خواجہ علی سمرقندی کی سواری کے ساتھ پیدل جاتے تھے ، لیکن میں نے کبھی یہ طریقہ اختیار نہیں کیا ۔ خرد نامۂ اسکندری میں وہ عزت نفس اور استغنا کے راز کو منکشف کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

طلب را نمی گویم انکار کن
طلب کن و لیکن بھنجار کن

بہ مردار جوئی چو کرگس مباش
گرفتار ہر ناکس و کس مباش

پئی لقمہ چون سگ تملّق مکن
بفتراک دونان تعلق مکن

رہا گردن از بار غل طمع
فشان دامن از خار ذل طمع

مولانا جامی کے ناقدین کا ایک اعتراض :

مولانا جامی کے بعض ناقدین مولانا کی سیرت پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ مولانا نے ان صوری و معنوی فضائل کے باوجود اور اس عزت نفس اور استغنا کے باوصف اپنے عہد کے فرمانرواؤں کی مدح میں قصیدے کیوں لکھے ۔

یہی اعتراض حضرت امیر خسرو پر بھی کیا جاتا ہے ، جس کا جواب ہم امیر خسرو کے حالات کے ضمن میں دے چکے ہیں کہ ولایت

کو پیمبرانہ معیار سے نہیں جانچنا چاہیے بلکہ ہمیں ان بزرگوں کی اُن کثیر خوبیوں کو دیکھنا چاہیے جو ان کی ذات میں جمع تھیں ، اور جنھوں نے ان کو مرجع خلائق بنادیا تھا ۔

جناب علی اصغر حکمت نے اپنی کتاب جامی میں مشہور مستشرق پروفیسر اگوست بریکتو (August Bricteux) نے اس اعتراض کا جو جواب مقدمہ ترجمہ نفیسی (ص ۴۲) میں درج کیا ہے ہم اس کا ترجمہ یہاں نقل کرتے ہیں ، پروفیسر اگوست کہتے ہیں کہ جو لوگ مولانا جامی پر یہ اعتراض کرتے کہ انھوں نے اپنے عہد کے فرمانرواؤں کے لیے نہایت ہی آب و تاب کے قصیدے لکھے ، اُن کا یہ اعتراض نہایت غلط فہمی پر مبنی ہے کیوں کہ وہ خود جانتے ہیں کہ قصیدہ شاعری کی ایک مشکل صنف ہے ، اگر وہ قصیدہ نہ کہے تو اس کی شاعری میں ایک بڑا نقص رہتا ہے ، مولانا جامیؒ نے جو قصائد کہے ہیں ، ان کا مقصد سوائے عرض ہنر اور فنی کمال کے کچھ نہیں ، مشرق کے شعرا نے بھی یورپ کے ادیبوں کی طرح اپنی قلمی تخلیقات کو معیشت کا ذریعہ نہیں بنایا ۔[1]

ہمارے خیال میں اس سے پروفیسر موصوف کا مقصد یہ ہے کہ یورپ کے مصنفین ہمیشہ کسی مقصد کے تحت لکھتے ہیں ۔ یہ اور بات ہے کہ بعد میں ان کی تخلیقات اُن کے لیے ذریعہ معیشت بھی بن جاتی ہیں ۔

پھر آگے چل کر پروفیسر موصوف نے لکھا کہ مولانا جامی کے عہد کے شعرا اور مصنفین کے لیے ناگزیر تھا کہ وہ اپنی تصانیف میں اُس عہد کے اُمرا و سلاطین کا تذکرہ عزت و احترام سے نہ کریں ، تا کہ وہ اُن کی سخاوت و کرم سے فائدہ حاصل کریں ،

---

(۱) جامی (تالیف علی اصغر حکمت) ص ۹۵ تا ۹۶ ۔

وہ ان بادشاہوں کی مدح پر اس لیے بھی مجبور تھے کہ ظالم بادشاہوں کے استبداد سے محفوظ رہ کر اپنے قلم سے ان کے لطف و کرم کو حاصل کریں، تاکہ ان کے استبداد سے بچے رہیں۔ قدیم شعرا اور اہلِ قلم کا یہ بھی خیال تھا کہ ایک بار ان بادشاہوں اور حاکموں کی مدح لکھ کر ان کی جان چھوٹ جائے گی، اور وہ بعد میں آزادی اور اطمینانِ قلب سے اپنے افکار و خیالات کو قلم بند کر سکیں گے۔[1]

مولانا جامی کا اپنی شاعری پر تبصرہ:

مولانا جامی خود اپنی شاعری کا تجزیہ کرتے ہیں اور خود اپنے ناقدین کے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

ہست دیوانِ شعرِ من اکثر
غزلِ عاشقانِ شیدائی

یا فنونِ نصائح است و حِکَم
منبعث از شعورِ دانائی

ذکر دونان نیابی اندر وی
کان بود نقد عمر فرسائی

مدح شاہان در او باستدعاست
نہ ز خوش خاطری و خود رائی

زآن مدایح بخاطر نرسد
معنیِ حرص و آز پیمائی

ہیچ جا نبود آن مدائح را
در عقب قطعۂ تقاضائی[1]

---

(۱) جامی (علی اصغر حکمت) ص ۹۶ بحوالۂ دیوان سوم

شاہانِ وقت کی عقیدت :

مولانا جامی نویں صدی ہجری کے اواخر میں ہرات میں مقیم تھے اس وقت ہرات کا فرمانروا ابوالغازی سلطان حسین بایقرا تھا، اس علم پرور اور معارف نواز فرمانروا نے مشرقی ایران میں ۳۵ سال حکومت کی، اس کے عہد حکومت میں خراسان نے آبادی اور رونق کے اعتبار سے بڑی ترقی کی یہ فرمانروا غیر معمولی ادبی و علمی ذوق رکھتا تھا ، اور علماء اور ادیبوں کی بڑی قدر افزائی کرتا تھا ۔ اس کا دربار سلطان محمود غزنوی کی طرح شعرا اور علماء سے بھرا رہتا تھا ، خود بھی شاعر تھا فارسی اور ترکی میں شعر کہتا تھا وہ فارسی میں ” حسینی “ تخلص کرتا تھا ، صاحب تصنیف تھا ، اس کا تذکرہ مجالس العشاق مشہور ہے۔ سلطان بایقرا کا وزیر میر علی شیر نوائی[1] تھا ، جس کا شمار اس دور کے فاضل ترین لوگوں میں ہوتا تھا ، یہ امیر ادیب ، علماء و فضلا اور شعرا سے اس قدر محبت رکھتا تھا کہ براؤن نے لکھا ہے کہ وہ اپنے عہد کا ماسیناس سلینوس[2] تھا ، اس کے گرد علماء و فضلا و شعرا پروانہ وار جمع رہتے تھے ، وہ بھی مولانا جامی سے بے حد عقیدت رکھتا تھا ، جامی نے اپنی بہت سی تالیفات نظم و نثر اس کی خواہش یا شوق دلانے پر لکھیں ان تمام کتابوں میں مولانا جامی نے اس کا نام بڑی عزت و احترام سے لیا ہے اس کے علاوہ مولانا جامی نے اپنے بہت سے خطوط ، قصائد و قطعات اور غزلیات میں میر علی شیر نوائی کا نام

---

(۱) میر علی شیر نوائی : ۸۴۴ھ (۱۴۴۰ـ۴۱ء) میں ہرات میں پیدا ہوا ، بچپن ہی سے سلطان حسین بایقرا سے اس کی دوستی تھی ، جب بایقرا ہرات کے تخت سلطنت پر متمکن ہوا تو یہ شاہی لطف و عنایات سے سرفراز کیا گیا ، اور فرامین پر مہر

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۳۵۹)

بہت احترام و تکریم سے لیا ہے ، میر علی شیر نوائی نے بھی مولانا کی وفات پر ایک مرثیہ کہا ہے ، جو سات بند اور ستر اشعار پر مشتمل ہے ۔

جس زمانے میں کہ مشرقی ایران میں سلطان ابو سعید اور سلطان بایقرا کی حکومت تھی مغربی ایران میں ترکمان فرمانرواؤں کی حکومت تھی ، اگرچہ مولانا جامی کی تصانیف میں قراقو نیلو فرمانرواؤں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵۸)

لگانے کا کام اس کے سپرد ہوا ، اس کی کریم النفسی اور استغنا اور غیر معمولی صلاحیتوں نے آسے اور بھی بادشاہ کا مقرّب بنادیا اور رکن السلطنت ، اعتماد الملک و الدولہ و مقرب الحضرت السلطانی کے لقب سے سرفراز کیا گیا ، یہاں تک کہ استر آباد کی ولایت اس کے سپرد کی گئی ، لیکن آس نے کچھ عرصے کے بعد آس سے استعفا دے دیا ، اور مولانا جامی کی ہدایت پر سلسلۂ نقشبندیہ میں مرید ہوگیا ، کارہائے خیر میں آس کی توجہ بے انتہا تھی ، بڑے بڑے مصوّر ، بہزاد ، شاہ مظفر اور موسیقی داں و نوازندے جو اپنا جواب نہیں رکھتے تھے ، آس کے رہین منت تھے ، وہ خود بھی بڑا موسیقی داں ، نوازندہ اور نقاش تھا ، میر علی شیر ترکی زبان کا شاعر تھا ، ترکی میں نوائی تخلص کرتا تھا ، فارسی میں اس کا تخلص "فانی" تھا ، اسی وجہ سے اس کو " ذو اللسانین کا خطاب دیا گیا تھا ، میر علی شیر نوائی صاحب تصانیف کثیرہ تھا ، اس کی بہت سی کتابیں فارسی اور ترکی میں ہیں ۔

میر علی شیر نوائی نے ۱۲ جمادی الاخریٰ ۹۰۶ھ (۱۵۰۰ء) کو وفات پائی ، (جامی ۔ تالیف ۔ علی اصغر حکمت) ص ۲۱ تا ۳۳)

(۲) اروم کے ایک شخص کا نام ہے ، جو نہایت ادب دوست اور شاعر نواز تھا (جامی ، ص ۳۰ ح)

کا تذکرہ کم ملتا ہے ، لیکن یہ فرمانروا بھی مولانا کی بے حد عزت کرتے تھے ، جہان شاہ قراقونیلو (۸۴۱-۸۷۲ھ) نے اپنا دیوان مولانا جامی کے پاس بھجوایا تھا ، مولانا نے اس کے جواب میں ایک قطعہ لکھا تھا ، جس کا ایک شعر یہ ہے -

ہمایوں کتابے چوں دُر جے ز دُر

رسید از گہر ہای تحقیق پُر

سلطان یعقوب بیگ (۸۸۳-۸۹۶ھ) کو ایک قصیدے میں مولانا جامی نے مختلف نصیحتیں فرمائی ہیں ، جو اس فرمانروا کی مولانا سے عقیدت و ارادت کو ظاہر کرتی ہیں ، یہ قصیدہ دیوان جامی میں موجود ہے -

اسی زمانے میں نویں صدی ہجری کے نصف آخر میں ، مولانا جامی کی حیات میں ، عثمانی فرمانرواؤں میں ایک سلطان محمد خاں ملقب بہ فاتح (۸۵۵-۸۸۶ھ) آپ کا معتقد تھا ، دوسرا عثمانی فرمانروا سلطان بایزید خاں دوم (۸۸۶-۹۱۸ھ) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا جامی کی شہرت ان کی زندگی ہی میں مشرقی ایران سے استنبول تک پھیل گئی تھی ، منشآت فریدون بیگ جلد اول ، ص ۳۶۱ میں وہ دو خطوط ملتے ہیں جو سلطان بایزید نے مولانا جامی کو اور مولانا جامی نے سلطان بایزید کو لکھے تھے ، سلطان بایزید کے یہ مکاتیب اس کی دلی عقیدت و ارادت کے آئینہ دار ہیں ، سلطان بایزید کی اس عزت و احترام کا اندازہ اس سے بھی کیجئے کہ اس نے اپنے ہر مکتوب کے ساتھ مبلغ ایک ہزار فلوری طلا مولانا جامی کی خدمت میں بھجوائے تھے ، مولانا نے بھی اپنی کتاب سلسلۃ الذھب کے دفتر سوم کو اس بادشاہ کے نام معنون کیا تھا اور دیوان سوم خاتمۃ الحیات کے کئی قصیدے اس بادشاہ کے لیے ملتے ہیں -

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا جامی کی شہرت ان کی حیات ہی میں ہندوستان تک پہنچ چکی تھی - چنانچہ ''مراسلات جامی'' میں ایک مکتوب میں چند فقرے ایسے ملتے ہیں کہ جس کا مخاطب کوئی ملک التجار ہندوستانی ہے ، یہ خط مولانا جامی نے اس مکتوب کے جواب میں لکھا ہے کہ جو اس نے یا اس کے بیٹے خواجہ علی نے آپ کو لکھا تھا ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص محترم و معزز تھا ، اور عرفان و تصوف کا ذوق رکھتا تھا ، اس نے تفصیل سے اپنے حالات و کیفیات کے متعلق مولانا جامی کو خطوط لکھے تھے ، اور مولانا جامی نے اس کو جوابات دیے تھے -[1]

وفات :

مولانا جامی نے ۱۸ محرم بروز جمعہ ۸۹۸ھ (۱۴۰۲ء) کو سلطان بایقرا کی وفات سے دس سال قبل وفات پائی ، میر علی شیر نوائی نے ''خمستہ المتحیرین'' میں اور صاحب ''روضتہ الجنات فی اوصاف مدینتہ الھرات'' میں وفات کے تفصیلی حالات دیتے ہوئے لکھا کہ : جب وفات کی خبر شہر میں پھیلی تو اکابر و اشراف لباس ماتمی پہنے ہوئے اپنے گھروں سے نکل آئے ، سلطان حسین بایقرا جنازے پر حاضر ہو کر بے اختیار زار زار رو رہا تھا ، اس نے مولانا کے صاحبزادے ضیاء الدین یوسف کو شفقت سے اپنے سینے سے لگا رکھا تھا ، اور ان کو تسلی و تشفی دے رہا تھا ، تعزیت کے بعد وہ اپنی ضعیفی کی وجہ سے لوٹ گیا ، اور تمام شاہزادوں اور امرا کو حکم دیا کہ وہ جنازے میں شریک ہوں ، شاہزادے سلطان احمد میرزا اور دوسرے ارکان دولت جنازے کو کندھا دینے میں مسابقت کر رہے تھے ، مولانا جامی کو حضرت سعد الدین کاشغری کے مقبرے میں دفن کیا گیا ، جو ''تخت مزار'' کے نام سے مشہور ہے -[2]

---

(۱) یہ تمام تفصیل جامی (تالیف علی اصغر حکمت) ص ۴۵ تا ۵۳ سے ماخوذ ہے -

(۲) جامی (علی اصغر حکمت) ص ۲۱۸ -

تصانیف :

مولانا جامی کی تصانیف کثیر ہیں ، تحفہ سامی میں مولانا جامی کی تصانیف ۴۵ بتائی گئی ہیں۔ لیکن صاحب مراۃ الخیال نے ان تصانیف کی تعداد ۹۹ لکھی ہے نثر کی بعض مشہور کتابیں یہ ہیں ، نفحات الانس ، شرح ملا جامی ، اشعۃ اللمعات ، شرح فصوص الحکم ، لوائح ، لوامع ، بہارستان ، شرح مفتاح الغیب ، شواہد النبوۃ ، نقد النصوص وغیرہ ۔

نظم کی کتابوں میں آپ کا دیوان ، مثنوی ہفت اورنگ ، مثنوی سلسلۃ الذھب، سلامان ابسال، تحفۃ الاحرار، سبحۃ الابرار ، یوسف زلیخا ، خرد نامہ اسکندری ، لیلیٰ مجنوں وغیرہ مشہور ہیں ۔[1]

بعضوں نے کہا کہ لفظ "جامی" کے ۵۴ عدد ہیں ، اتنی ہی مولانا کی تصانیف ہیں ۔[2]

اولاد :

مولانا جامی کی شادی حضرت سعد الدین کاشغری کی صاحبزادی سے ہوئی تھی ، مولانا جامی کے ان صاحبزادی کے بطن سے چار صاحبزادے پیدا ہوئے ؛ پہلے صاحبزادے ایک روز سے زیادہ زندہ نہیں رہے ، اس لیے ان کا نام نہیں رکھا گیا ، البتہ دوسرے صاحبزادے کا نام خواجہ صفی الدین محمد رکھا گیا لیکن وہ ایک سال سے زیادہ زندہ نہیں رہے ، مولانا جامی کو ان سے بہت محبت تھی ، چنانچہ آپ نے اس صاحبزادے کی وفات کے بعد

---

(۱) تاریخ ادبیات ایران (شفق) ص ۳۵۱ ، مقدمہ نفحات الانس اردو ترجمہ ، ص ۱۲ ، جامی (علی اصغر حکمت) ص ۱۶۱ تا ۱۶۲ ۔

(۲) ایضاً ، ص ۱۶۲ ۔

مصنف رشحات عین الحیٰوۃ کا تخلص صفی رکھا ، آپ کے فرزند سوم ضیاء الدین یوسف تھے ۔ ان کی ولادت ۹ شوال ۸۸۲ھ (۱۴۷۷ء) کو ہوئی ۔ ابھی ان کی عمر پانچ سال ہی کی تھی کہ ایک خادم خواجہ ضیاء الدین کو کندھے پر بٹھا کر مولانا جامی کے پاس لایا ، آنھوں نے نہایت معصومانہ انداز میں کہا کہ بابا ! میں نے خواجہ عبید اللہ احرار کو نہیں دیکھا ، مولانا جامی نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ تم نے حضرت خواجہ صاحب کو دیکھا تھا ، لیکن تمھیں یاد نہیں آپ کے چوتھے فرزند خواجہ ظہیرالدین عیسیٰ تھے ، جو خواجہ ضیاء الدین کے ۹ سال بعد پیدا ہوئے ، ان کی تاریخ ولادت بروز جمعرات ۵ محرم ۸۹۱ھ (۱۴۸٦ء) ہے ، انھوں نے اپنی پیدائش کے چالیس روز کے بعد وفات پائی ۔[1]

---

(۱) جامی (علی اصغر حکمت) ص ٦۷ تا ٦۹

۲۵

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی

حضرت شیخ کی عظمت علامہ اقبال کی نظر میں

حکیم الامت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے اپنے خطبات کے پانچویں خطبے میں اسلامی ثقافت کی روح کے عنوان سے حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی علیہ الرحمۃ کی روحانی اور علمی جلالت شان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے، آپ کے اس قول پر کہ

محمد مصطفیٰ درقاب قوسین او ادنیٰ رفت و باز گردید و اللہ ما باز نگردیم[1] پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ :

---

(۱) لطائف قدوسی، لطیفہ ۷۹، ص ۶۵ - خطبات اقبال کے اردو ترجمے میں حضرت شیخ کا یہ قول اس طرح درج ہے - محمد عربی بر فلک الافلاک رفت و باز آمد - و اللہ اگر من رفتے ہرگز باز نیامد مے -

خطبات کے مترجم سید نذیر نیازی صاحب نے اس قول پر حاشیہ دیتے ہوئے لکھا کہ : حضرت شیخ کی اصل عبارت دستیاب نہیں ہوسکی، لہذا انگریزی اقتباس کا یہ فارسی ترجمہ قیاسی ہے، حالاں کہ آپ کے قول کی اصل عبارت لطائف قدوسی میں آپ کے صاحبزادے حضرت شیخ رکن الدین نے نقل کی ہے - چنانچہ ہم نے بجنسہ آپ کے اصل قول کو لطائف قدوسی کے حوالے سے یہاں نقل کیا ہے (مؤلف)

یہ مشہور صوفی بزرگ حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی کے الفاظ ہیں ، جن کی نظیر تصوف کے سارے ذخیرہ ادب میں مشکل ہی سے ملے گی ، شیخ موصوف کے اس ایک جملے سے ہم اس فرق کا ادراک نہایت خوبی سے کرلیتے ہیں ، جو شعور ولایت اور شعور نبوت میں پایا جاتا ہے ، صوفی نہیں چاہتا واردات اتحاد میں آسے جو لذت و سکون حاصل ہوتا ہے ، آسے چھوڑ کر واپس آئے ، اگر آئے بھی ، جیسا کہ اس کا آنا ضروری ہے تو اس سے نوع انسانی کے لیے کوئی خاص نتیجہ مرتب نہیں ہوتا ۔ برعکس اس کے نبی کی باز آمد تخلیقی ہوتی ہے ، وہ ان واردات سے واپس آتا ہے کہ زمانے کی رو میں داخل ہو جائے ، اور پھر ان قوتوں کے غلبہ و تصرف سے جو عالم تاریخ کی صورت گر ہیں ، مقاصد کی ایک نئی دنیا پیدا کرے ۔

صوفی کے لیے تو لذت اتحاد ہی آخری چیز ہے ، لیکن انبیاء کے لیے اس کا مطلب ہے کہ ان کی اپنی ذات کے اندر کچھ اس قسم کی نفسیاتی قوتوں کی بیداری جو دنیا کو زیر و زبر کر سکتی ہیں ، اور جن سے کام لیا جائے تو جہان انسانی دگرگوں ہو جاتا ہے ، لہذا انبیاء کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ ان کی واردات کو ایک زندہ اور عالم گیر قوت میں بدل دیں ، گویا ان کی باز آمد ایک طرح کا عملی امتحان ہے خود ان کے مشاہدات و واردات کی قدر و قیمت کا ۔ اسے ایک تخلیقی عمل کہیے [۱] ۔

---

(۱) تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ۔ (علامہ اقبال کے انگریزی خطبات کا اردو ترجمہ) از سید نذیر نیازی پانچواں خطبہ ، ص ۱۸۸-۱۸۹ ۔

حضرت شیخ کی خود اپنے اس قول کے متعلق تشریح :

قبل اس کے کہ ہم حضرت شیخ کے اس قول کی تشریح خود آپ کی بیان کردہ لکھیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ہم اس واقعہ کی تفصیل دیں کہ جس موقع پر آپ نے یہ قول ارشاد فرمایا تھا۔

لطائف قدوسی میں ہے کہ ایک دفعہ میر یونس علی بیگ حضرت شیخ کی ملاقات کے لیے گنگوہ آئے ، دیکھا کہ آپ پر جذب و سرمستی کی کیفیت طاری ہے ، اس کیفیت کو دیکھ کر انھوں نے حضرت شیخ سے ساز بجانے کی اجازت طلب کی ، ساز کا بجنا تھا کہ حضرت شیخ پر بیخودی اور محویت کا ایسا عالم طاری ہوا کہ یہاں تک کسی چیز کا شعور نہ رہا ، اس وقت شیخ فرید طلبی تھانیسری بھی حاضر تھے ، اسی عالم سرمستی میں کچھ دیر کے بعد حضرت شیخ کی زبان سے کچھ کلمات شطحیات[1] نکلے آپ نے فرمایا کہ :

---

(۱) کلمات شطحیات : وہ الفاظ جو صوفیاء کرام کی زبان سے عالم سکر و مستی میں نکلتے ہیں ، ان کو اصطلاح تصوف میں شطحیات کہتے ہیں ۔ اکابر صوفیہ کی شطحیات مشہور ہیں ، یہ شطحیات عوام اور اہل ظاہر کے لیے ناقابل فہم اور ان کے ظاہری معنی پر بعض اوقات عمل کرنا موجب گمراہی ہوتا ہے ، شطحیات اصل میں صوفیہ کے رموز و کنائے ہیں ، جن سے ان کے صحیح مفہوم کو متعین کرنا صرف اہل بصیرت کا کام ہے ، لیکن ان شطحیات کی بنا پر کسی بزرگ اور اہل نظر سے سوء ظن اختیار کرنا صحیح نہیں - شطحیات دراصل ان بزرگوں کی وجدانی کیفیتیں ہیں ، جو الفاظ کے سانچے میں ڈھل جاتی ہیں ، انھیں شریعت و احکام کا درجہ دینا یا ان سے عقائد و اعمال کا استنباط کرنا کسی طرح صحیح نہیں ۔ خود حضرت شیخ نے

(باقی حاشیہ بر صفحہ ۳٦٧)

محمد مصطفیٰ در قاب قوسین او ادنیٰ رفت و باز گردید ،
و اللہ ما باز نگردیم۔

پھر تھوڑے سے وقفے کے بعد آپ نے اسی حالت میں اپنے اس قول کی توجیہ و توضیح کرتے ہوئے فرمایا کہ :

محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم عہدہ دار و لنگر دار بود ، باز گردید، ما جان باختہ و جہان تاختہ باز نگردم۔ مراد لنگرداری و عہدہ داری ظاہر است کہ عہدۂ نبوت و تبلیغ رسالت ، و لنگر ، دعوت تمام عالم حوالۂ حضرت مصطفیٰ بود صلی اللہ علیہ وسلم ۔

(ترجمہ)

حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم عہدہ دار و لنگر دار

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۶۶)

اپنے ایک مکتوب میں جو آپ کے صاحبزادے شیخ حمید کے نام ہے شطحیات پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا کہ :

و آنچہ از مشائخ اقوال و اشارات ظہور یافتہ است ، آں تعلق بمرتبۂ ایشاں دارد ، و بعضے از اہل ظاہر شطحیات گویند بد آنمعنیٰ کہ خلاف ظاہر است ، چنانچہ فی الدارین غیر اللہ ، و انا الحق و سبحانی رد آں جائز نیست کہ اقوال اہل حق و اہل سنت و جماعت اند ، و قبول آں لازم نیست کہ معصوم نیند ، روا باشد کہ نغزیدہ باشند ، انبیاء معصوم اند ، اقوال ایشاں را شطحیات نگویند ، مجمل و متشابہ خوانند ۔

(منتخب مکتوبات قدوسیہ ۔ مکتوب ۴۵ ، ص ۱۳۲)

(۱) لطائف قدوسی ، ص ۶۵ ۔ لطیفہ ۷۹ ۔

تھے ، اس لیے آپ واپس تشریف لے آئے اور ہم جان باختہ اور جہان تاختہ کیسے لوٹ سکتے تھے ؟ مراد لنگر داری و عہدہ داری سے ظاہر ہے کہ عہدۂ نبوت اور تبلیغ رسالت ہے ، اور لنگر سے مراد آپ کی وہ دعوت عامہ تمام عالم کی ہے جو حضرت مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے تھی۔

حالات :

آپ کا اسم گرامی عبدالقدوس ، آپ کے والد محترم کا نام نامی شیخ اسماعیل ، اور آپ کے دادا کا نام شیخ صفی الدین تھا ، آپ کا سلسلۂ نسب آخر میں حضرت امام ابو حنیفہ سے جا ملتا ہے -

آپ کے خاندان کے سب سے پہلے بزرگ جو غزنی سے ہندوستان تشریف لائے وہ شیخ نظام الدین تھے ، جو ہلاکو خان کے فتنے کے بعد ساتویں صدی ہجری میں اپنے صاحبزادے شیخ نصیرالدین کے ساتھ علاءالدین خلجی[1] کے عہد حکومت میں دہلی پہنچے -

جس زمانے میں کہ شیخ نظام الدین دہلی پہنچے ، عین اسی

---

(۱) علاءالدین خلجی ، سلطان جلال الدین خلجی کے بعد ٦۹۵ھ (۹۵-۱۲۹۴) میں دہلی میں تخت نشین ہوا۔ سلطان علاءالدین خلجی کا دور حکومت ایک نہایت کامیاب دور تھا ، وہ علماء کا بہت قدردان تھا ، اس کے زمانے میں پایۂ تخت دہلی میں ایسے اکابر علماء جمع ہو گئے تھے کہ ضیاءالدین برنی تاریخ فیروز شاہی میں لکھتا ہے کہ : اگر ہر یکے را مجلدے بنویسم مقصر باشیم - سلطان علاءالدین نے ٦ شوال ۷۰۷ھ (۸-۱۳۰۷ء) کو وفات پائی (تاریخ معصومی ص ۳۳ تا ۳۴ - تاریخ فیروز شاہی (برنی) طبع کلکتہ ، ص ۳۵۴-۳۵۵)

زمانے میں ایک اور بزرگ قاضی شہاب الدین[1] جو حضرت شیخ نظام الدین کے قریبی عزیز تھے غزنی سے دولت آباد ہوتے ہوئے دہلی تشریف لائے ، قاضی شہاب الدین نے دہلی پہنچ کر مولانا

---

(۱) قاضی شہاب الدین : قاضی شہاب الدین کے متعلق تاریخ فرشتہ میں ہے :

و از جملہ فضلائے عصر قاضی شہاب الدین جون پوری است اصل او از غزنین است ، در دولت آباد دکن نشو و نما یافت ۔ سلطان ابراہیم در تعظیم و توقیر او بسیار می کوشید ، و در روزہائے دو مجلس او بر کرسی نقرہ می نشست ۔

اخبار الاخیار میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے قاضی شہاب الدین کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا کہ : قاضی شہاب الدین کے اوصاف شرح و بیان سے مستغنی ہیں ، اگرچہ آن کے زمانے میں بڑے بڑے استاد اور ہمعصر تھے ، لیکن جو شہرت و مقبولیت حق تعالیٰ نے ان کو عطا کی تھی وہ دوسروں کا حصہ نہ بن سکی ، صاحب تصانیف تھے ، ان کی تصانیف میں حواشی کافیہ ہیں ، جو لطافت اور متانت میں بے نظیر ہیں ۔ یہ حواشی ان کی زندگی ہی میں مشہور عالم ہو گئے تھے ۔ ان کی ایک اور کتاب " ارشاد " نحو میں ہے ، جس کو انہوں نے جدید اسلوب اور ترتیب کے ساتھ لکھا ہے ، یہ کتاب ایک متن کی صورت میں ہے ، جو نہایت ہی لطیف ، متین اور بے نظیر ہے ، اس کے علاوہ ان کی دو تصانیف قرین اور بدیع البیان علم بلاغت میں ہیں ، جس کی عبارت مسجع ہے ۔ ان کی قرآن مجید کی ایک تفسیر بحر مواج بھی ہے ، اس کے سوا

(باقی حاشیہ بر صفحہ ۳۷۰)

خواجگی دہلوی[1] سے علوم ظاہری اور فیوض باطنی حاصل کیے، ان کے علاوہ قاضی عبد المقتدر[2] سے بھی تعلیم حاصل کی۔ وہ دہلی میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد دہلی کے حادثات کی وجہ سے جون پور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۶۹)

دوسرے بعض رسائل اور کتابیں بھی ہیں ، انھوں نے ایک رسالہ مناقب سادات کے نام سے اہل بیت اطہار کی فضیلت پر بھی لکھا تھا ، شعر بھی کہتے تھے۔ ان کا ایک قطعہ نمونتاً صاحب اخبار الاخیار نے اپنی کتاب میں دیا ہے ۔ قاضی شہاب الدین نے ۸۴۸ھ (۱۴۴۴-۴۵ء) میں وفات پائی ۔ ان کا مزار جون پور میں ہے ۔ (اخبار الاخیار مطبوعہ مطبع مجتبائی ، ص ۱۸۰)

(۱) مولانا خواجگی دہلوی: شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی کے مرید و خلیفہ اور مولانا معین الدین عمرانی کے شاگرد اور قاضی شہاب الدین کے استاد تھے ، وہ تیمور کے حملے سے قبل دہلی سے نکل کر کالپی میں مقیم ہو گئے تھے ، اور انھوں نے کالپی ہی میں وفات پائی ، وہیں ان کا مزار پُر انوار زیارت گاہ خاص و عام ہے ۔ (اخبار الاخیار ، ص ۱۴۳ تا ۱۴۴)

(۲) قاضی عبد المقتدر بن قاضی رکن الدین شریحی کندی ، شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی کے مرید و خلیفہ تھے ، کامل درویش اور دانشمند فیاض تھے ، اور قاضی شہاب الدین کے استاد تھے ، نہایت فصیح و بلیغ تھے ، فارسی اور عربی کے بلند پایہ شاعر تھے ، ان کے قصائد اور غزلیں ان کی شاعرانہ بلندی پر شاہد ہیں ، تعلیم و تعلم سے غیر معمولی شغف تھا ، ہمیشہ افادۂ علم میں مشغول رہتے ۔ کیونکہ آپ کے مرشد اور ان کے خلفاء کا طریقہ یہی تھا ، حضرت شیخ نصیر الدین محمود

(باقی حاشیہ بر صفحہ ۳۷۱)

تشریف لے گئے ، اُس وقت جون پور میں سلطان ابراہیم شرقی(۱) کی حکومت کا زمانہ تھا ، وہ قاضی شہاب الدین کے ساتھ نہایت عزت و احترام سے پیش آیا ، اور اُن کو صدر العلماء کا خطاب دیا ۔

شیخ نظام الدین چونکہ قاضی شہاب الدین کے قریبی عزیز تھے ، اس لیے وہ بھی دہلی چھوڑ کر جون پور چلے آئے ۔ اور یہیں قاضی شہاب الدین نے اپنی صاحبزادی کی شادی ، شیخ نصیرالدین کے صاحبزادے سے کردی ۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷۰)

فرمایا کرتے تھے کہ ایک مسئلہ شرعی میں فکر کرنا ہزار رکعتوں پر افضل ہے ، کہا جاتا ہے کہ زمانہٗ طالب علمی میں قاضی عبد المقتدر ، شیخ نصیر الدین محمود کی خدمت میں حاضر ہوتے اور مختلف علمی مباحث پر بحث کرتے ، خواجہ نصیر الدین اُن کی علمی صلاحیتوں کی بنا پر اُن کو بہت عزیز رکھتے تھے ۔ اور ہمیشہ ان کو حصولِ علم کی ترغیب دیتے رہتے تھے ۔ یہاں تک کہ وہ شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی کے مرید ہوئے ، اور ظاہری علم و فضل کے ساتھ انہوں نے باطنی نعمت کو بھی ملا لیا ۔ قاضی عبد المقتدر نے ۲۰ محرم ۷۹۱ھ (۱۳۸۸-۹ء) کو اٹھاسی سال کی عمر میں وفات پائی ، اُن کا مزار اور اُن کے والد کا مزار دہلی میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے روضہٗ مبارک کے قریب خانقاہ شیخ عبد الصمد میں حوض شمسی کے جانب جنوب واقع ہے (اخبار الاخیار ، ص ۱۵۰ تا ۱۵۱)

(۱) سلطان ابراہیم شرقی : بن مبارک شاہ : مدت حکومت : چالیس سال کچھ ماہ (سیر المتاخرین مطبوعہ مطبع نولکشور ، ص ۱۳۹ تا ۱۴۰)

خاندانِ حضرت شیخ عبدالقدوس کی ردولی میں سکونت:

افسوس ہے کہ شیخ نصیر الدین کے تفصیلی حالات ہمیں تذکروں میں نہیں ملتے، انوار الصفی میں صرف اس قدر ہے کہ اُن کا کوئی خاص ذریعۂ معاش نہیں تھا، سلطان ابراہیم شرقی نے ان کی معاشی پریشانیوں کے مدنظر ردولی کے حاکم کو لکھا کہ وہ اپنے علاقے میں اُن کی معیشت کے لیے کوئی انتظام کرے، اس نے سلطان کے اس حکم کی بنا پر شیخ نصیر الدین کو ردولی کے قریب ایک موضع پھگولی بطور مدد معاش دے دیا۔

اس موضع کے ملنے کے بعد شیخ نصیر الدین اپنے اہل و عیال سمیت جون پور سے ردولی میں منتقل ہو گئے۔

شیخ نصیرالدین کے تین صاحبزادے تھے، سب سے بڑے صاحبزادے شیخ صفی الدین تھے، منجھلے صاحبزادے شیخ فخرالدین اور چھوٹے صاحبزادے شیخ رضی الدین تھے[1]

حضرت شیخ کے جدامجد:

شیخ نصیرالدین کے بڑے صاحبزادے حضرت شیخ صفی الدین حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے جدامجد تھے:

حضرت شیخ صفی الدین کے تمام تذکرہ نگار اس پر متفق ہیں کہ وہ نہایت عابد و زاہد اور خدا رسیدہ بزرگ تھے، اور اپنے علم و فضل، زہد و تقویٰ اور کمالِ معنویت میں امام ابو حنیفہ ثانی تھے۔

صاحبِ لطائف اشرفی کا بیان ہے کہ حضرت اشرف جہانگیر سمنانی فرمایا کرتے تھے کہ میں نے ہندوستان کے شہروں میں

---

(۱) یہ تمام حالات اور تفصیلات انوار الصفی قلمی، باب پنجم: در ذکر قیام ردولی شریف بعد سیاحت، ص ۳۶ سے ماخوذ ہیں۔

شیخ صفی الدین سے زیادہ علوم و فنون سے آراستہ کسی کو نہیں پایا -

مراۃ الاسرار میں ہے کہ :

حضرت مخدوم شیخ صفی الدین قدس سرہ العزیز اگرچہ از فرزندان امام ہمام حضرت امام اعظم رضی اللہ عنہ است ، اما باعتبار علم و فضل و زہد و تقویٰ کمالات معنوی ، ثانی ابو حنیفہ است -[1]

صاحب لطائف اشرفی نے حضرت شیخ صفی الدین کے اوصاف و محامد کو ایک اور جگہ بیان کرتے ہوئے لکھا کہ :

حضرت شیخ صفی الدین حنفی ردولوی کہ بصفات علوم ظاہری اصطفائے معانی و باہری آراستہ در علوم ادبیہ و اصول فقہ دستے تمام داشتہ ، چنانچہ ایں معنیٰ از تصانیف ایشاں رابعہ و توالیف لائقہ ایشان روشن است۔ احتیاج ایراد نیست -[2]

حضرت شیخ صفی الدین نے تکمیل علوم ظاہر یہ کے بعد حضرت شیخ اشرف جہانگیر سمنانی[3] کے دست حق پر بیعت کی ، حضرت اشرف جہانگیر سمنانی نے مرید کرنے کے بعد آپ کو خرقہ خلافت

---

(۱) انوار الصفی قلمی بحوالہ مراۃ الاسرار ، باب دوم در ذکر درس و تدریس و تصانیف شیخ صفی الدین ، ص ۹۸)

(۲) نسب نامہ قلمی مرتبہ قاضی مظہر الحق صاحب ردولوی بحوالہ لطائف اشرفی -

(۳) حضرت شیخ اشرف جہانگیر سمنانی : محمد اشرف نام ، جہانگیر لقب تھا ، آپ کی ولادت سمنان میں ہوئی ، آپ کے والد محمد ابراہیم سمنان کے بادشاہ تھے ، آپ زہد و تقویٰ اور نیکی کی (باقی حاشیہ بر صفحہ ۳۷۴)

عطا کیا ، اور مبارکباد دی اور چشتیہ نظامیہ سلسلے کا شجرہ عنایت فرمایا، مختلف ریاضتوں اور مجاہدوں کے بعد حضرت شیخ صفی الدین ایک عرصے تک سیر و سیاحت فرماتے رہے ، پہلے آپ شہر پنڈوہ (بنگال) میں حضرت شیخ علاء الحق بنگالی[1] کے مزار پر حاضر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷۳)

وجہ سے سمنان کی حکومت اپنے بھائی کے سپرد کر کے ہندوستان تشریف لائے ، اور اُچ میں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی خدمت میں حاضر ہوئے ، حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت سے روحانی استفادہ کر کے بہار ہوتے ہوئے بنگال پہنچے اور سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے مشہور بزرگ شیخ علاء الحق بنگالی کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی بیعت سے مشرف ہوئے ، اپنے شیخ کی خدمت میں دس بارہ سال رہ کر ریاضتیں اور مجاہدے کرتے رہے ، حضرت شیخ علاء الحقؒ نے آپ کو خرقۂ خلافت اور جہانگیر کے لقب سے سر بلند کیا ، اور آپ کو نواح جون پور جانے کا حکم دیا، آپ جون پور تشریف لا کر رشد و ہدایت میں مصروف ہو گئے ، پھر آپ وہاں سے کچھوچھہ تشریف لائے ، یہاں بھی آپ کی خانقاہ رشد و ہدایت کا گہوارہ بنی - ۲ - محرم - ۸۰۸ھ (۱۴۰۵ء) کو آپ نے کچھوچھے میں وفات پائی- ”اشرف المؤمنین“ سے آپ کی تاریخ وفات نکلتی ہے ”(اخبار الاخیار، ص ۱۶۶)۔ لطائف اشرفی جلد ۱-۲)

(۱) شیخ علاء الحق بنگالی بن شیخ اسعد لاہوری ، حضرت شیخ سراج الدین عثمان کے مرید و خلیفہ تھے ، اپنے مرشد سے خلافت حاصل کرنے کے بعد یہ ان کے جانشین ہوئے ، حضرت شیخ علاء الحق نے ۸۰۰ھ (۱۳۹۸ء) کو وفات پائی ، ان کے خلفاء میں میر سید اشرف جہانگیر سمنانی اور ان کے صاحبزادے

(باقی حاشیہ پر صفحہ ۳۷۵)

ہوئے، جو آپ کے مرشد کے پیر تھے، اور ان کے صاحبزادے حضرت نورالحق[1] سے ملاقات کی ، پنڈوہ میں ایک طویل عرصے تک قیام

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷۴)

شیخ نورالحق مشہور ہیں - (اخبارالاخیار ، ص ۱۴۳-رود کوثر شیخ محمد اکرام مرحوم ، ص ۱۵۳ تا ۱۵۴)

(۱) شیخ نورالحق : حضرت شیخ علاءالحق کے صاحبزادے اور ان کے خلیفہ تھے ، اور برصغیر پاک و ہند کے مشہور اولیائے کرام میں تھے ، صاحب عشق و محبت و تصوف و کرامات تھے۔ ملفوظات شیخ حسام الدین مانک پوری میں ہے کہ وہ اپنے والد کی خانقاہ کے فقرا کی تمام خدمتیں بجا لاتے ، آٹھ سال تک انہوں نے اہل خانقاہ کے مطبخ کے لئے لکڑیاں کاٹیں ، ان کے بھائی اعظم خاں جو وزیر سلطنت تھے ، ان کو اس حالت میں دیکھتے تو کہتے نور! تمھارے لیے ساری نعمتیں موجود ہیں ، تم میرے پاس کیوں نہیں آتے ، وہ ہمیشہ ٹال دیتے ، اور ہنس کر کہتے کہ خانقاہ کی لکڑیاں مجھے وزارت عظمیٰ سے زیادہ پسند ہیں - شیخ حسام الدین کا بیان ہے کہ میرے شیخ سوائے سردی کے گدڑی کے سوا کچھ نہ پہنتے تھے اور سجادے پر نہ بیٹھتے تھے ، اور فرمایا کرتے تھے کہ سجادے پر بیٹھنے کا حق اس کو ہے ، جو اس پر بیٹھ کر دائیں بائیں نہ دیکھے۔ شیخ نورالحق کی تصانیف میں انیس الغربا ساٹھ صفحے کا ایک رسالہ ہے ، جو طبع ہو چکا ہے -

شیخ نورالحق نے ۸۱۳ھ (۱۱-۱۴۱۰) میں وفات پائی، آپ کا روضہ مبارک شہر پنڈوہ (بنگال) میں ہے ، آپ کے خلفاء میں شیخ حسام الدین مانک پوری اور شیخ شمس الدین طاہر خاص طور پر قابل ذکر ہیں (اخبارالاخیار، ص ۱۵۴ تا ۱۵۴- آب کوثر (تالیف شیخ محمد اکرام مرحوم) ص ۲۵۴) -

فرمانے کے بعد آپ جون پور تشریف لائے ، وہاں سے اودھ تشریف لائے ، کچھ عرصے اودھ میں رہے ، آخر میں مستقل طور پر ردولی میں مکونت پذیر ہوگئے ، اور قصبہ کوٹلاور جو ردولی سے چار فرسنگ کے فاصلے پر واقع ہے - وہاں کے قاضی سید درویش کی صاحبزادی سے عقد کیا -[۱]

شیخ محمد اسماعیل :

۱۲ ربیع الثانی ۷۷۹ھ (۱۳۷۷ء) کو حضرت شیخ صفی الدین کے ایک صاحبزادے پیدا ہوئے، جن کا نام آپ نے شیخ محمد اسماعیل رکھا ، یہی صاحبزادے حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی کے والد ماجد ہیں - شیخ محمد اسماعیل نے اپنے والد ماجد سے تعلیم و تربیت حاصل کی ، اور سولہ سال کی عمر میں علوم متداولہ کی تکمیل کرلی-

شیخ محمد اسماعیل جب علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل کرچکے تو آپ کے والد حضرت شیخ صفی الدین نے آپ کی شادی قاضی خاں کی صاحبزادی اور قاضی دانیال کی ہمشیرہ سے کردی - قاضی دانیال کا خاندان اپنی شرافت و نجابت ، زہد و تقویٰ ، علم و عرفان میں ردولی میں ممتاز سمجھا جاتا تھا -

قاضی خاں کی صاحبزادی کے بطن سے حضرت شیخ محمد اسماعیل کے چار صاحبزادے ہوئے (۱) شیخ عبد الصمد[۲]

---

(۱) انوارالصفی قلمی ، ششم در تاہل نمودن شیخ صفی الدین و تولد فرزند -

(۲) شیخ عبد الصمد : صاحب دل بزرگ تھے ، آن پر سرمستی اور بے خودی کی کیفیت طاری رہتی تھی ، وہ بعد میں موضع عصامؤ میں رہنے لگے تھے ، جو ردولی سے دو میل کے فاصلے پر واقع ہے ، ان کے اسلاف کچھ موضع عصامؤ ، کچھ ردولی اور کچھ موضع شجنی میں متوطن ہوئے - (انوار الصفی قلمی ، ص ۵۱ ، ذکر اولاد شیخ محمد اسماعیل)

(۲) شیخ عزیزاللہ[۱] (۳) حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی
(۴) شیخ حبیب اللہ عرف مخدوم مٹھن ؒ[۲]

حضرت شیخ صفی الدین کی وفات ۱۳ ذیقعدہ ۸۱۹ھ (۱۴۱۶ء) کو ہوئی آپ کی وفات کے بعد آپ کی مسند ارشاد کو آپ کے صاحبزادے شیخ محمد اسماعیل نے زینت بخشی ۔

شیخ محمد اسماعیل اپنے وقت کا بڑا حصہ درس و تدریس ، رشد وہدایت میں گزارتے تھے ، آپ کی زندگی فقیرانہ تھی ، ہر جمعہ کو مسجد میں وعظ فرماتے تھے ۔

شیخ محمد اسماعیل نے ۱۲ ربیع الاول بروز چہار شنبہ ۸۶۰ھ (۱۴۵۶ء) کو وفات پائی ۔ وفات سے کچھ پہلے اپنے چاروں صاحبزادوں کو طلب کیا ، اور انھیں نصیحتیں فرمائیں ، پھر اپنے بڑے صاحبزادے شیخ عبدالصمد کو ان کے تینوں بھائیوں کے سامنے خلافت و سجادگی عنایت کی ، اور تمام سلسلوں میں خصوصاً سلسلہ چشتیہ نظامیہ میں ان کو بیعت لینے کی اجازت دی ، اور حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی سے فرمایا کہ تمھیں سلسلۂ چشتیۂ صابریہ سے فیض پہنچے گا ۔

---

(۱) شیخ عزیزاللہ : شیخ محمد اسماعیل کے یہ صاحبزادے ردولی ہی میں رہے ، اور ان کی اولاد آج بھی ردولی ہی میں متوطن ہے - (انوارالصفی ، قلمی ، ص ۵۱)

(۲) شیخ حبیب اللہ عرف مخدوم مٹھن : یہ بعد میں ردولی سے تین کوس کے فاصلے پر جانب مغرب موضع بھٹورہ میں آباد ہوئے ، اس موضع کی کچھ اراضی سلاطین دہلی نے ان کو دے دی تھی ۱۲۹۳ھ (۷۷-۱۸۷۶ء) تک یہ اراضی ان کی اولاد کے قبضے میں تھی ، ان کی اولاد کچھ موضع بھٹورہ میں اور کچھ ردولی میں توطن پذیر ہے (انوارالصفی قلمی)

شیخ محمد اسماعیل کا مزار آن کے والد حضرت شیخ صفی الدین کے مزار کے قریب مغربی جانب ردولی میں زیارت گاہ خاص وعام ہے[1]۔

حضرت شیخ کی ولادت :

حضرت شیخ عبد القدوس کا صحیح سنہ ولادت ہمیں کسی تذکرے میں نہیں ملا ۔ البتہ آپ نے اپنے بعض مکتوبات میں اپنی عمر اسّی کے لگ بھگ بتائی ہے ، اگر ہم آپ کی عمر وفات کے وقت چوراسی سال کی فرض کرلیں تو آپ کا سنہ وفات ۹۴۴ھ متعین ہونے کی وجہ سے آپ کا سنہ ولادت ۸۶۰ھ (۱۴۵۹-۶۰ء) قرار پاتا ہے ، یہ بہلول لودہی کی حکومت کا زمانہ تھا ۔[2]

قیاساً سمجھ لینا چاہیے کہ حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی کی ولادت باسعادت ۸۶۰ھ میں (۱۴۵۵-۵۶ء) کے لگ بھگ ہوئی ۔

آپ کے والد محترم حضرت شیخ اسماعیل نے آپ کی تعلیم و تربیت کی طرف خاص توجہ کی زمانۂ طالب علمی میں آپ کے ذوق و شوق کا یہ عالم تھا کہ رات دن تحصیل علم میں مصروف رہتے ، ابتدا ہی سے آپ نے حصول علم اور عبادت کو اپنی زندگی کا مقصد اعلیٰ بنایا تھا ۔

آپ کے صاحبزادے شیخ رکن الدین نے آپ کے ذوق علم اور شوق عبادت پر روشنی ڈالتے ہوئے لطائف قدوسی میں لکھا کہ :

> چوں حضرت قطبی بہ تعلیم کتابہا مشغول شدند، در تمام روز می خواندند، و تمام شب بشغل ذکر و عبادت حق مشغول می بودند ۔

---

(۱) نسب نامہ قلمی ، مرتبہ قاضی شیخ مظہر الحق ردولوی ۔

(۲) بہلول لودہی : تخت نشینی ۸۵۵ھ : وفات : ۸۹۴ھ مدت حکومت ۳۸ سال (خلاصۃ التواریخ ، ص ۳۲۹) ۔

شروع ہی سے آپ ذہین و طباع تھے آپ کی ذہانت و طبّاعی کو دیکھ کر آپ کے اساتذہ آپ پر بےحد توجہ اور شفقت فرماتے تھے-

آپ کے والد محترم نے آپ کو خطوط نویسی اور خوش نویسی کی طرف بھی خصوصیت سے توجہ دلائی تھی ، یہی وجہ ہے کہ آپ کے مکاتیب میں جو دل آویزی پائی جاتی ہے وہ دوسروں کا حصہ نہ بن سکی ، خوش خطی میں بھی آپ اپنا جواب نہ رکھتے تھے - قرآن مجید اور کافیہ آپ نے اپنے قلم سے لکھا تھا ، یہ دونوں اتنے خوشخط لکھے تھے کہ لوگ ان کے دیکھنے کے لیے آتے تھے -

دور طالب علمی کی تصانیف :

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو زمانہٗ طالب علمی ہی سے تالیف و تصنیف کا ذوق تھا ، کیونکہ جب آپ صرف کی کتابیں پڑھ رہے تھے ، آپ نے صرف میں بحرالانشعاب کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی ، یہ اس فن میں اس قدر معتبر اور اہم کتاب سمجھی گئی کہ اس فن کے اساتذہ کہتے تھے کہ اگر اس فن میں صرف یہی ایک کتاب پڑھ لی جائے تو کافی ہے -

جب آپ نے مصباح کی تعلیم قاضی شہاب الدین کے ساتھ شروع کی تو اپنے اساتذہ کی تقریروں کو قلم بند کر کے انھیں ایک کتاب کی صورت دی -

جذبہٗ عشق ربّانی :

حضرت شیخ ابھی ''کافیہ'' ہی کی تعلیم پا رہے تھے ، اور بحث مبنیات ہی ختم کی تھی کہ جذبہٗ عشق الٰہی سے سرشار ہو کر تعلیم ترک کر دی ، یہاں تک کہ کافیہ کو پھاڑ دیا ، تعلیم ظاہری کو ترک کر کے ، اور عشق الٰہی سے سر شار ہو کر خرقہ پوشی اختیار کی ، جب آپ نے تعلیم چھوڑ دی تو آپ کی والدہ

کو بے حد صدمہ ہوا ، اور وہ بے حد روئیں ، اور روتی ہوئی اپنے بھائی قاضی دانیال کے پاس آئیں ، جو ردولی کے حاکم تھے ، اور اُن سے کہا عبد القدوس لکھنا پڑھنا چھوڑ کر فقیروں میں داخل ہو گیا ، خدارا اُسے سختی سے سمجھایے ۔ قاضی دانیال نے آپ کو بلا کر سختی سے کہا کہ اگر پڑھو گے نہیں تو میں تمھیں سزا دوں گا ، آپ نے فرمایا ماموں جان! اگر سزا بہتر ہے تو دیر نہ کیجیے ۔ عین اسی وقت جب یہ باتیں ہو رہی تھیں کچھ گانے کی آواز آئی ، گانے کی آواز سن کر حضرت شیخ پر عجیب وجد کی کیفیت طاری ہو گئی قاضی دانیال نے آپ کی یہ کیفیت دیکھی تو اپنی بہن سے آ کر کہا کہ یہ لڑکا کچھ عجیب و غریب منزلوں سے گزر رہا ہے ، آپ بالکل فکر نہ کریں ، انشا اللہ بہتر ہی ہو گا ۔[1]

حضرت شیخ نے اگرچہ ابتدائی کتابوں کے سوا تعلیم حاصل نہیں کی تھی ، لیکن علومِ متداولہ میں بھی آپ کی یہ کیفیت تھی کہ اس دور کے اکابرِ علماء کو بھی علمی مسائل میں آپ کے سامنے مجالِ دم زدن نہ تھی ، علمی مسائل میں آپ کی رائے اِس قدر صحیح اور متوازن ہوتی تھی کہ ہر صاحبِ فکر اور صاحبِ علم کو اُسے قبول کرنا پڑتا تھا ۔

علومِ ظاہری میں آپ کا یہ کمال منجانب اللہ تھا ، اور اِس میں آپ کی سعی و کوشش کو مطلقاً دخل نہ تھا ۔

آپ کے صاحبزادے شیخ رکن الدین کا بیان ہے کہ میرے والد حضرت شیخ عبد القدوس قصبہ سدہور کے ایک بزرگ اور عالم حضرت شیخ خواجگی[2] کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے ،

---

(۱) لطائف قدوسی ، ص ۵-۶

(۲) حضرت شیخ خواجگی : بن علی بن خیرالدین بن نظام الدین

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۳۸۱)

ایک دفعہ آپ نے حضرت شیخ خواجگی سے عرض کیا کہ میں نے علم حاصل نہیں کیا ، خصوصاً علم فقہہ میں مجھے بالکل درک نہیں اس کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے؟ حضرت شیخ خواجگی نے فرمایا کہ تم علم باطن کے حاصل کرنے میں مشغول رہو کہ اس راہ میں تمام اصول فروع ہیں اور فروع اصول ہیں ، تمھارے لیے آیندہ کوئی مشکل باقی نہ رہے گی۔[1]

واقعات نے آیندہ چل کر بتایا کہ حضرت شیخ خواجگی کی یہ پیشگوئی آپ کی زندگی میں کس طرح پوری ہوئی -

حضرت شیخ رکن الدین نے اپنے زمانہ طالب علمی کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا کہ اگرچہ میرے والد حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی نے اصول فقہہ کی تعلیم بالکل حاصل نہیں کی تھی ، لیکن آپ مجھے اصول فقہہ میں اصول شاسی ، حسامی اور اصول فقہہ کی دوسری کتابوں کا درس دیتے تھے ، جب میں نے

(باقی حاشیہ صفحہ ۳۸۰)

اودھ کے ایک قصبے مدہور کے رہنے والے تھے ، علوم رسمیہ کی تکمیل جون پور میں کی ، پھر سلسلہ چشتیہ میں شیخ تاج الحق کے مرید ہوئے اور ریاضتوں اور مجاہدوں کے بعد خلافت سے سرفراز ہوئے ، حضرت شیخ خواجگی کی عظمت و جلالت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی آن کو اپنے مکاتیب میں شیخ الاسلام کے لقب سے یاد کرتے تھے - حضرت شیخ خواجگی کا سلسلہ نسب آخر میں حضرت اسماعیل عبداللہ انصاری ہروی سے جا ملتا ہے (نزھتہ الخواطر ، ج ۴ ، ص ۱۰۳ - مطبوعہ مجلس دائرۃ المعارف ، حیدر آباد دکن) -

(۱) لطائف قدوسی ۔

دہلی میں دوسرے اساتذہ سے کشف منار پڑھنا شروع کی تو آپ مجھے اس کا درس بھی دیتے تھے، اور درس دیتے ہوئے اصول فقہ کے ایسے عجیب و غریب نکات بیان فرماتے تھے کہ اس دور کے علماء ان کو سن کر متحیر ہو جاتے تھے۔[1]

شیخ رکن الدین حضرت شیخ کی علمی سر بلندیوں کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: میرے بڑے بھائی شیخ حمید الدین سرہند میں مولانا قطب الدین سرہندی[2] سے شرح منار پڑھتے تھے، اس کتاب میں ایک ایسا مشکل مقام آیا جسے ان کے استاد حل نہ کر سکے، وہ حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس مشکل مقام کو آپ کے سامنے پیش کیا، آپ نے اسے فوراً حل کر دیا۔[3]

شرحِ عوارف:

شیخ رکن الدین کا بیان ہے کہ جب میں نے علم کلام میں شرح صحائف پڑھنا شروع کی تو میرے والد محترم حضرت شیخ عبد القدوس نے اس کو پڑھ کر اس پر حواشی لکھے۔

خود حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی کا ارشاد ہے کہ ابتداءً عوارف کا نسخہ میرے حجرے میں برکت کے لیے رکھا رہتا تھا، اور مجھے اس موضوع سے کوئی ذوق نہ تھا، لیکن

---

(۱) لطائف قدوسی، ص ۸۔

(۲) مولانا قطب الدین سرہندی: سرہند کے رہنے والے تھے، برصغیر پاک و ہند کے مشہور علماء میں تھے، مولانا قطب الدین نے سرہند ہی میں وفات پائی، اور وہیں مدفون ہوئے (نزہتہ الخواطر، ج ۴، ص ۲۷۲)۔

(۳) لطائف قدوسی۔

بعد میں میرے ذوق کی یہ کیفیت تھی کہ میں نے عوارف کی شرح عربی میں لکھی ،[1] آپ کی یہ تصنیف نہایت اہم خصوصیات کی حامل ہے ، اور علمی دنیا میں اس شرح کو ایک خاص مقام حاصل ہے -

بیعت :

حضرت شیخ عبد القدوس نے اگرچہ پہلا واسطہ فیض روحانی حضرت شیخ احمد عبد الحق ردولوی[2] سے حاصل کیا تھا ، لیکن

---

(۱) لطائف قدوسی ، ص ۸ -

(۲) شیخ احمد عبدالحق ردولوی : اخبار الاخیار میں ہے کہ : شیخ احمد عبد الحق ، شیخ جلال پانی پتی کے مرید تھے ، صاحب تصوف درویش تھے ، صاحب خوارق و کرامات تھے ، صاحب ذوق و شوق تھے ، جذبہ قوی اور نظر موثر رکھتے تھے ، ردولی کے رہنے والے تھے (اخبار الاخیار ، ص ۱۷۷) -

"درّ مکنون میں ہے کہ : حضرت شیخ احمد عبدالحق ردولوی صاحب توشہ ردولی ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے ، آپ کے والد کا اسم گرامی عمر تھا ، آپ کے دادا کا نام داؤد تھا ، آپ کا سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروق رضؓ سے جا ملتا ہے - شیخ عمر کے دو صاحبزادے تھے بڑے صاحبزادے کا نام شیخ تقی الدین اور چھوٹے صاحبزادے شیخ احمد عبدالحق تھے ، شیخ احمد عبدالحق ردولی ہی میں مقیم رہے ، انوار العیون میں حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی نے آپ کے لقب "صاحب توشہ" پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا کہ : آپ کے مرید خاص شیخ بختیار تجارت کی غرض سے اکثر ردولی کے باہر جاتے رہتے تھے ، جب بہت دن گزر جاتے اور ان کی

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۳۸۴)

بیعت حضرت شیخ احمد عبد الحق ردولوی کے پوتے اور حضرت شیخ

(باقی حاشیہ صفحہ ۳۸۳)

خیریت نہ معلوم ہوتی تو ان کی بیوی حضرت شیخ احمد عبد الحق ردولوی کی خدمت میں ایک سیر آٹے کی روٹی ، اور ایک سیر دودھ اور گھی ملا کر لایا کرتی تھیں ، آپ اسے لوگوں میں تقسیم کرتے تھے ، پھر یہ معمول ہوگیا تھا کہ جو شخص کسی حاجت کے لیے آپ سے دعا کا طالب ہوتا ، وہ بھی یہی عمل کرتا تھا ، اور اسی کا نام توشہ تھا ، اسی توشے کی بنا پر آپ ''صاحب توشہ'' کے لقب سے مشہور ہوئے ۔

اس توشے کا اہتمام حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی کے یہاں بھی بہت تھا ، حضرت شیخ اپنے ایک مرید و خلیفہ شیخ عبد الرحمٰن شاہ آبادی کو ایک خط میں اس توشے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

> ''این فقیر را ہمیشہ با خویش دانند ، و توشہ حضرت قطب عالم قدس سرہ ہزیدہ فقرا را قسمت کردہ دہند مزید حیات و ترقی درجات باد ۔
> (مکتوبات قدوسیہ ، مکتوب ۶۰ ، بنام شیخ عبد الرحمٰن شاہ آبادی ، ص ۲۸۳)

حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی کا بیان ہے کہ حضرت شیخ احمد عبد الحق ردولوی پیر طریقت کی تلاش میں مختلف مقامات پر ہوتے ہوئے پانی پت تشریف لائے ، اور حضرت شیخ المشائخ حضرت جلال الدین کبیر الاولیا کے دست حق پرست پر بیعت ہو کر اجازت و خلافت سے سر فراز ہوئے ۔ اور طویل ریاضتوں اور مجاہدوں کے بعد مختلف مقامات کی

(باقی حاشیہ پر صفحہ ۳۸۵)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۸۴)

سیاحت کرتے ہوئے اپنے وطن ردولی تشریف لائے ، اور وہاں ایک خانقاہ قائم کر کے رشد و ہدایت میں مصروف ہو گئے ۔ حضرت شیخ احمد عبد الحق کی مجلسیں ذکر الٰہی اور تعلیم شریعت سے معمور ہوتی تھیں ، مریدوں کی اصلاح و تربیت کی طرف خاص توجہ فرماتے تھے ، آپ کی خانقاہ کے تمام رہنے والے پاس انفاس کرتے تھے ، اور کسی ساعت بھی ذکر الٰہی سے غافل نہ رہتے تھے ، نماز کے اول و آخر تین دفعہ بلند آواز سے حق حق کہتے تھے ، یہاں تک کہ خرید و فروخت میں جمال حق میں غرق رہتے آپ کے مریدوں اور طالبوں کی زبان پر ہر دم ، ہر سانس اور ہر ہر قدم پر حق حق جاری رہتا ، خط کے شروع میں تین مرتبہ حق حق حق لکھتے ۔

حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی کا بیان ہے کہ شیخ المشائخ شیخ احمد عارف اور حضرت شیخ احمد عبد الحق کے اکثر مرید اس جہان فانی سے حق حق کہتے ہوئے تشریف لے گئے ، اور سب کا خاتمہ بالخیر ہوا ۔

عالم جذب و شوق میں اکثر یہ شعر پڑھتے تھے ۔

سختے شکستہ از ہمہ عالم برائے یار
آرے برائے یار دو عالم تو ان شکست

کبھی کبھی یہ مصرعہ بھی دہراتے :

چترِ شاہی بر سرِ طفلانِ ما ست

حضرت شیخ احمد عبد الحق نے ۱۵ جمادی الثانی ۸۳۷ ھ (۱۴۳۴ ء) کو سلطان ابراہیم شرقی کے عہد حکومت میں

(باقی حاشیہ بر صفحہ ۳۸۶)

میں حضرت شیخ عبد القدوس نے اپنی بیعت اور اکتساب فیض روحانی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا کہ :

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۸۵)

وفات پائی ، آپ کا مزار پر انوار ردولی میں مرجع خاص و عام ہے آپ کے خلفا اور مریدوں میں ، آپ کے صاحبزادے شیخ احمد عارف ، آپ کے خادم خاص شیخ بختیار ، شیخ بہرام شیخ برہان اور میاں فرید وغیرہ مشہور ہیں ۔

حضرت شیخ احمد عبدالحق کے حالات و ملفوظات پر حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی نے ایک کتاب انوار العیون کے نام سے فارسی میں لکھی تھی ، (حضرت شیخ احمد عبد الحق کے یہ تمام حالات انوار العیون ، تالیف حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی ، اور اخبار الاخیار ، ص ۱۸۷ - ۱۹۰ سے ماخوذ ہیں)

(۳) شیخ احمد عارف : شیخ احمد عارف کے احالات تذکروں میں بہت کم ملتے ہیں ، حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی نے انوار العیون میں اور شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں آن کے کچھ حالات لکھے ہیں انوار العیون میں حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی نے آن کے حالات قلم بند کرتے ہوئے لکھا کہ : حضرت شیخ احمد عبد الحق کے یہاں جو لڑکا پیدا ہوتا وہ مر جاتا تھا جس کی وجہ سے آپ کی بیوی ہمیشہ افسردہ رہتی تھیں - ایک دن انھوں نے حضرت شیخ احمد عبد الحق سے کہا کہ افسوس ہے کہ کوئی لڑکا میرے مقدر میں نہیں ، جو لڑکا پیدا ہوتا ہے حق حق کہتا ہوا آتا ہے ، اور بہت جلد رحمت الٰہی سے جا ملتا ہے ، آپ نے فرمایا ملول نہ ہو ، ایک لڑکا تمہارا مقدر ہے ، چند

(باقی حاشیہ پر صفحہ ۳۸۷)

اجازت این فقیر (شیخ عبد القدوس) با حضرت شیخ العالم (شیخ احمد عبد الحق) در عالم معاملہ اول درست گشت۔ بعدہ با نبیرہ حضرت شیخ العالم ، شیخ الوقت حضرت شیخ محمد مدظلہ و اعلیٰ قدرہ بیعت کردیم ، و از شرف اجازت مشرف گشتیم ، و حضرت شیخ العالم (شیخ احمد عبد الحق) این فقیر را در عالم معاملہ چند

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۸۶)

دن کے بعد آپ کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا ، اور آن کا نام آپ نے شیخ احمد عارف رکھا ، جب وہ بڑے ہوئے تو آن میں مروت اور محبت اس درجہ غالب تھی کہ جو شخص آن سے ملتا وہ اپنی جگہ یہ سمجھتا کہ جو محبت آن کو مجھ سے ہے ، وہ کسی دوسرے سے نہیں ، یہ تمام باتیں ان کے کمال ولایت کی دلیل تھیں ۔ شیخ احمد عبد الحق کی وفات کے بعد شیخ احمد عارف نے آن کی مسند رشد و ہدایت کو زینت بخشی

شیخ احمد عارف نے چالیس سال کی عمر میں ۸۵۶ھ (۵۳-۱۴۵۲ء) میں وفات پائی ۔ (دُرِ مکنون ۔ ترجمہ اردو انوار العیون ۔ تالیف شیخ عبد القدوس گنگوہی ، ص ۲۸—۲۹)

اخبار الاخیار میں شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے آن کے متعلق لکھا کہ :

> شیخ احمد عارف پسر شیخ احمد عبد الحق است و صاحب سجادہ ، سجادہ او موازنہ چہل سال عمر یافت ۔ با ہر طائفہ سرے داشت و ہمہ کس از او راضی بودند (اخبار الاخیار ۔ ص ۱۹۱—۱۹۲)

بار لطف کردند ، و دست گرفته ، بزبان کرم فرمودند کہ ترا بہ خدا رسانیدم - الحمد للہ علیٰ ذالک ، چندان معاملہ با حضرت شیخ العالم کہ در حد و عد نیاید .... ایں معاملہ مارا در ظہور ولایت حضرت شیخ العالم (شیخ احمد عبد الحق) بعد چہل سال از رحلت شیخ العالم (شیخ احمد عبدالحق) بودہ است (مقدمہ منتخب مکتوبات قدوسیہ ، ص ۳ بحوالہ انوار العیون)

بیعت ہونے کے بعد خانقاہ شیخ احمد عبد الحق ردولوی میں جو مجاہدے اور ریاضتیں آپ نے کیں ، لطائف قدوسی میں آن کی تفصیلات دیتے ہوئے ، آپ کے صاحبزادے شیخ رکن الدین نے لکھا کہ میرے والد نے ابتدائی زمانے میں سخت ریاضتیں اور مجاہدے کیے ، حضرت شیخ احمد عبد الحق کے روضہ مبارک میں خود جھاڑو دیتے ، خانقاہ کے درویشوں کے لیے جنگل سے لکڑیاں لاتے یہاں تک کہ آپ کے مزار مبارک پر چلّہ کھینچا ، اس چلّے میں آپ نے کھانا پینا بالکل بند کر دیا ، ترک غذا کی وجہ سے مزاج میں حدّت پیدا ہوئی ، یہاں تک کہ خون کے پاخانے آنے لگے ، سانس سے بھنے ہوئے گوشت کی بو آنے لگی ، اور کبھی سانس سے عطر و عود کی بھی بو آتی تھی ، اس زمانے کی کیفیت بیان کرتے ہوئے ، خود فرمایا کہ میں نے اس زمانے میں خود اس شعر کا عملی مشاہدہ کیا ہے :

تا نسوزی بر نیاید بوئے عود

پختہ داند کیں سخن بر خام نیست

شیخ رکن الدین نے آپ کے ان شدید ریاضتوں اور مجاہدوں کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھا کہ اندرونی سوزش کی وجہ سے جو بھاپ نکلتی تھی آسے محسوس کیا جا سکتا تھا ، شدید سرما کے

موسم میں جب کہ برف جمتی ہے ، عشق الٰہی کی حرارت کی وجہ سے صبح کے وقت آپ کے سر پر ٹھنڈے پانی کی کئی ٹھلیاں ڈالی جاتیں ، لیکن یہ ٹھنڈا پانی جب سر پر ڈالا جاتا تو گرم ہو جاتا تھا ۔

ان ریاضتوں اور مجاہدوں کے زمانے میں ایک گدڑی جس میں بہت سے پیوند لگے ہوئے تھے ، پہنتے تھے ، شیخ رکن الدین کا بیان ہے کہ شروع میں میری پیدائش تک میرے والد حضرت شیخ عبد القدوس لباس نہیں پہنتے تھے ، بلکہ ایک گدڑی[1] باندھتے تھے جس میں بیسیوں پیوند لگے ہوئے تھے ، اسی طرح جو ٹوپی پہنتے تھے ، وہ بھی کئی پیوندوں کی تھی ، معمول تھا کہ جس طرح آپ نماز ، روزہ ، اوراد و وظائف کو پابندی سے روزانہ ادا کرتے تھے اسی طرح روزانہ ایک پیوند اپنی گدڑی میں پابندی کے ساتھ لگاتے ، اس پیوند کو دو تین بڑے ٹانکے لگا کر ٹانک لیتے ، پیوند کے لیے کپڑے گلی کوچوں سے اٹھاتے ، انہیں دھوتے ، پاک کرتے اور گدڑی میں سی لیتے ۔ ایک دفعہ شیخ خواجگی نے آپ کو یہ گدڑی پہنے دیکھا تو فرمایا میاں! بعض مرتبہ یہ گدڑی بھی سالکین کے لیے ریا کاری اور نفسانیت کا ذریعہ بنتی ہے ، شیخ خواجگی کے اس ارشاد پر آپ کو لباس پہننے کا خیال ہوا ، بعض مریدوں اور دوستوں نے آپ کے لیے دس گز کپڑا خریدا ، اور لباس تیار کر کے آپ کی خدمت میں پیش کیا ، آپ وہ لباس پہننے لگے ، لیکن جب وہ لباس پھٹ گیا تو آپ نے پھر وہی گدڑی پہن لی ۔

---

(۱) میرے جد امجد حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی کی یہ گدڑی آپ کے دوسرے آثار کے ساتھ ہمارے خاندان میں اب تک محفوظ ہے ، حضرت شیخ کے سجادہ نشین نسلاً بعد نسلٍ ان آثار کے محافظ و امین ہوتے ہیں ۔ (مؤلف)

آپ کو یہ امر بھی پسند نہ تھا کہ متاع دنیوی میں سے کوئی چیز یا سامان آپ کے گھر میں رہے ، آپ کی بیوی کے پاس متاع دنیوی میں سے ایک ہار تھا ، جو اُن کے والدین نے شادی کے وقت اُن کو جہیز میں دیا تھا ، اُنھوں نے اس ہار کو حضرت شیخ سے چھپا کر اس لیے رکھا تھا کہ جب اُن کے بڑے صاحبزادے شیخ حمید الدین[1] کی شادی ہوگی ، تو اُس وقت وہ کام آئے گا ، لیکن جب حضرت شیخ کو معلوم ہوا کہ بیوی کے پاس ایک ہار موجود ہے ، تو آپ نے اپنی بیوی سے فرمایا کہ تمھیں

---

(۱) شیخ حمید الدین : بن حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی یہ ۸۸۶ ھ (۸۲-۱۴۸۱ ء) میں ردولی میں پیدا ہوئے ، ان کی عمر چودہ یا پندرہ سال کی تھی کہ حضرت شیخ پر یہ کیفیت طاری ہوئی کہ گھر بار چھوڑ کر کسی جنگل یا ویرانے میں چلے جائیں ، آپ نے گدڑی پہن کر مشائخ چشت کے وہ تبرکات جو آپ کے پاس تھے ، اپنے صاحبزادے شیخ احمد کے حوالے کیے ، اور خود بستی سے باہر نکل گئے ، عمر خان شروانی کے لڑکوں کو جو آپ کے مرید تھے ، جب معلوم ہوا تو وہ موضع توزہ سے کہہ سن کر گھر واپس لائے ۔

شیخ حمید الدین تصوف و عرفان کے اعلیٰ منازل پر فائز ہونے کے ساتھ علوم ظاہری میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے ، صاحب نزھتہ الخواطر نے اُن کے اساتذہ میں مولانا قطب الدین سرہندی اور شیخ احمد حسینی ملتانی کا ذکر کیا ہے ، شیخ حمید صاحب، تصنیف بزرگ تھے ، وحدت الوجود پر انھوں نے ایک رسالہ بھی تصنیف کیا تھا

(۱)
راقم الحروف کا سلسلۂ نسب بھی حضرت شیخ حمید الدین کے توسط سے بارہ واسطوں سے حضرت قطب عالم شیخ عبد القدوس

(باقی حاشیہ بر صفحہ ۳۹۱)

معلوم ہونا چاہیے کہ کمال فقر کا مدار کمال تفرید و تجرید پر ہے ، اس لیے یہ ہار بھی گھر میں نہ رہنا چاہیے ۔ لیکن آپ کی بیوی اس پر راضی نہ ہوتی تھیں ، حضرت شیخ کی یہ بات حضرت شیخ خواجگی کو معلوم ہوئی ، آپ نے حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی کو بلا کر فرمایا ، کہ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ تفرید و تجرید کا تعلق تمھارے مال سے ہے ، نہ کہ دوسروں کے مال سے ، وہ ہار تمھاری بیوی کا ہے ، اس لیے تم ہار کے نکالنے پر اُسے مجبور نہ کرو ، اور اُس ضعیفہ کو غمگین نہ کرو ۔[1]

عبادات :

حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی کا زیادہ وقت عبادت و ریاضت میں گزرتا تھا ، آپ ذکر الٰہی ، اور تلاوت قرآن مجید کا بڑا ذوق

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۹۰)

گنگوہی علیہ الرحمہ سے جا ملتا ہے میرے خاندانی شجرے میں اس کی تفصیل اس طرح ہے :

اعجاز الحق قدوسی بن شاہ ظہور الحق بن شاہ عنایت احمد بن شاہ مشتاق احمد بن شیخ العالم عرف اللہ دیا بن شیخ الاسلام بن مولانا شاہ فخر الاسلام بن شاہ محمد حیات بن شاہ محمد جی بن شاہ محمد صادق بن شاہ فتح اللہ بن شاہ عبد الصمد بن شیخ حمید الدین بن قطب عالم حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی ؒ

(شیخ عبد القدوس گنگوہی - اور اُن کی تعلیمات تالیف اعجاز الحق قدوسی ، نزھتہ الخواطر ، جلد ۴ : ص ۲۷۱-۲۷۲ ، شجرۂ خاندان قدوسیہ مرتبہ شاہ منظور احمد قدوسی) ۔

(۱) لطائف قدوسی ، لطیفہ ۲۱ ، ص ۱۰ ۔

رکھتے تھے ، علاوہ فرض ، سنتوں اور مقررہ نوافل کے روز مرہ کے اوراد و وظائف پابندی سے پڑھتے تھے۔

لطائف قدوسی میں ہے کہ نماز سے آپ کو اس قدر والہانہ عشق تھا کہ شدید سردی کے زمانے میں آپ کھڑے ہو کر نماز پڑھتے تھے ، جب نفس میں گرمی کی خواہش پیدا ہوتی تو اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دیتے کہ ان دو نفلوں کے بعد جسم کو گرمی پہنچاؤں گا ، لیکن اسی طرح عبادت میں تمام رات گزر جاتی ، لیکن آگ تاپنے کی نوبت نہ آتی۔[1]

شب برات میں معمول تھا کہ ایک قرآن مجید سو رکعتوں میں باجماعت ختم فرماتے ، اس رات میں آپ کے صاحبزادے شیخ احمد[3] جو حافظ قرآن مجید بھی تھے امامت کے فرائض انجام

---

(۱) لطائف قدوسی ، لطیفہ ۱۹-۲۰ -

(۲) لطائف قدوسی ، لطیفہ ۲۱ ، ص ۱۵ -

(۳) شیخ احمد : حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے تیسرے صاحبزادے تھے ، جو علم و فضل ، سلوک و معرفت کے بلند مرتبے پر فائز تھے ، اور مشہور شیوخ میں تھے ، حافظ کلام اللہ تھے ، اور نماز میں حضرت شیخ کی امامت کے فرائض انجام دیتے تھے ، صاحب تصانیف تھے ، آن کی تصانیف رسالہ ''حلّت غنا'' اور رسالہ ''فی اثبات وحدت الوجود'' ان کی یادگار ہیں ۔ شیخ احمد کے صاحبزادے شیخ عبدالنبی تھے ، جو اکبر کے عہد میں صدر الصدور تھے ، چونکہ شیخ عبد النبی پر عالمانہ رنگ غالب تھا تو انہوں نے اپنے والد کے رسالے کے جواب میں حرمت سماع کے نام سے ایک رسالہ لکھا ، شیخ احمد نے آنھیں ڈانٹا ، وہ آزردہ ہو کر دہلی چلے گئے ،

(باقی حاشیہ بر صفحہ ۳۹۳)

دیتے تھے ، رمضان میں بھی آپ کے صاحبزادے شیخ احمد تراویح میں امامت فرماتے ، اور پورے رمضان میں تین قرآن مجید سنتے تھے ، آپ تمام عمر اس عمل کے پابند رہے ۔[1]

حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی کو یہ دعا بہت محبوب تھی ، رمضان المبارک میں تراویح کے بعد یہ دعا مانگتے تھے ، اور اپنے مریدوں اور معتقدوں سے بھی فرماتے کہ اس دعا کو مانگیں :

اللّٰھمّ مدّلی عمری فی طاعتک و محبتک و شوق لقائک ، و وسع علیّ رزقی من خزائن برکتک وسعۃ رحمتک رزق المحبوبین المرادین المقربین الواصلین الیک ، و صحّح لی جسمی فی طلبک ، یا سیدی و مولائی ، و بلّغنی املی فی مشاھدتک و کمال معرفتک و انوار قدسک و اسرار غیبک ، فانّک تمحو ما تشاء و تثبت و عندک اُمّ الکتاب ۔[2]

نوافل کثرت سے پڑھتے تھے ، نوافل میں عادت مبارک یہ تھی کہ قراۃ فاتحہ اور ضم سورۃ کے بعد شغل باطن میں مصروف ہو جاتے ، اور بارہ سانس کے مقدار ذکر خفی کرتے ، اس کے بعد رکوع میں جاتے ، اور رکوع کے بعد چند دم ذکر خفی کرتے ،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۹۲)

شیخ احمد نے ۹۷۲ ھ (۶۵-۱۵۶۴ ء) میں شاہ آباد میں وفات پائی ، اُن کا مزار دریائے مارکنڈہ کے کنارے شاہ آباد میں ہے ۔ لطائف قدوسی ، لطیفہ ۶ ، ص ۴۲ ۔ نزھتہ الخواطر ، ج ، ۴ : ص ۲۳) ۔

(۱) لطائف قدوسی ، لطیفہ ۵۹ ، ص ۴۲ ۔

(۲) لطائف قدوسی ، لطیفہ ۵۹ ، ص ۴۲

اسی طرح قومہ میں بھی ذکر خفی کرتے ، پھر سجدے میں بعد تسبیح ذکر خفی کرتے ، اسی طرح دونوں سجدوں کے درمیان جلسے میں ۔ اور دوسرے سجدے کی تسبیح کے بعد چند دم ذکر خفی کرتے اس طرح تمام نوافل میں شغل حق میں مشغول رہتے ۔ غرضکہ اس طرح آپ تمام شب میں چند دو گانے نوافل پڑھتے ، اور ان چند دوگانوں میں رات ختم ہو جاتی ۔[1]

سلسلہ چشتیہ میں ذکر بالجہر کی تعلیم خاص طور پر دی جاتی ہے ، آپ نے فرمایا کہ میری عمر کے کئی سال اس طرح سے گزرے ہیں کہ میں عشاء کی نماز کے بعد سے ذکر بالجہر شروع کرتا تھا ، یہاں تک کہ صبح ہو جاتی تھی ۔[2]

ابتدا میں آپ پر ''سلطان الاذکار'' کا اس قدر غلبہ تھا کہ آپ فرماتے ہیں کہ مجھے خیال ہوتا تھا کہ میں اس کی وجہ سے مسلوب العقل یا دیوانہ ہو جاؤں گا ۔ کیونکہ مجھ پر گھڑی گھڑی سلطان الاذکار کا غلبہ ہوتا تھا اور میں محو و بے خود ہو جاتا تھا ۔[3]

آپ کی راتیں عبادت الٰہی میں گزرتی تھیں ، بسا اوقات عشاء کی نماز کے بعد آپ اپنے آپ کو باندھ کر لٹکاتے اور تمام رات صلٰوۃ معکوس میں گزارتے ، اور صبح کو اپنے آپ کو کھولتے تھے ۔[4]

رمضان کے علاوہ روزے بھی آپ بڑی کثرت سے رکھتے تھے ۔ آپ کے صاحبزادے شیخ رکن الدین کا بیان ہے کہ آپ

---

(۱) لطائف قدوسی ، لطیفہ ۲۵ ، ص ۱۸
(۲) لطائف قدوسی ، لطیفہ ۲۲ ، ص ۱۵
(۳) لطائف قدوسی ، لطیفہ ۲۳ ، ص ۱۶
(۴) لطائف قدوسی ، لطیفہ ۲۴ ، ص ۱۸

صائم الدہر تھے ۔ میں نے چالیس سال میں آپ کو سوائے ایام ممنوعہ کے جو پانچ دن ہیں بغیر روزے کے نہیں دیکھا ۔[۱]

شادی :

عین اس زمانے میں جب کہ حضرت شیخ اپنے مرشد شیخ محمد کی خدمت میں رہ کر شدید ریاضتیں اور مجاہدے کر رہے تھے ۔ آپ کی شادی شیخ عارف کی چھوٹی صاحبزادی سے ہوئی ، یہ خاتون آپ کے مرشد کی بہن ، اور شیخ احمد عبدالحق ردولوی رح کی پوتی تھیں ۔[۲]

حضرت شیخ کی بیوی نہایت عابدہ ، زاہدہ اور ولیہ خاتون تھیں ، اگرچہ حضرت شیخ کے گھر میں فقر و فاقے کی تکلیف رہتی ۔ دو دو تین تین وقت کے بعد گھر والوں کو کھانے کی نوبت آتی ، لیکن وہ اور ان کے بچے نہایت صبر و شکر سے اپنا وقت گزارتے ، وہ صاحب کشف خاتون تھیں ، جو کچھ خواب میں دیکھتیں وہی پیش آتا ۔[۳]

حضرت شیخ نے دنیا سے اس درجہ قطع تعلق فرما لیا تھا کہ آپ کے عزیز و اقربا بھی آپ کو بھول چکے تھے ، آپ کے رشتہ داروں میں تقریبیں ہوتیں ، ان تقریبوں پر یہ رشتہ دار دوسروں کے ہاں کھانا اور مٹھائی بھجواتے ، اور حضرت شیخ کو اور آپ کے گھر والوں کو فراموش کر دیتے ، بعد میں کہتے کہ

(۱) لطائف قدوسی ، لطیفہ ۸۶ ، ص ۷۱-۷۲

(۲) حضرت شیخ کی شادی کی یہ تفصیل لطائف قدوسی ۔ لطیفہ ۱۵ ، ص ۱۱-۱۲ سے ماخوذ ہے ۔

(۳) لطائف قدوسی ، ص ۶۳ ، لطیفہ ۷۶ ۔

افسوس ہے کہ حضرت شیخ کے گھر والوں کا حصہ نہ جا سکا، ہم سے کیسی چوک ہوئی ۔

معیشت :

حضرت شیخ کے تذکرہ نگاروں نے آپ کے ذریعۂ معیشت پر روشنی نہیں ڈالی لیکن صاحب خزینتہ الاصفیاء مفتی غلام سرور لاہوری نے بحوالۂ معارج الولایت صرف اس قدر لکھا ہے کہ :

حضرت شیخ عبدالقدوس مادر زاد ولی تھے ، اور عالم طفولیت ہی سے آن میں آثار ولایت پائے جاتے تھے ، زبان سے جو کچھ فرماتے وہی ہوتا تھا ۔ وہ حلال روزی حاصل کرنے کے لیے زراعت کرتے تھے ، جب آنا کے کھیت میں غلہ تیار ہو جاتا تو وہ سب سے پہلے اس میں سے درویشوں کو دیتے ۔ پھر اس کے بعد اپنی ضرورت کی حد تک رکھ لیتے ۔[2]

حضرت شیخ کی معیشت کے حصول میں یہ جدوجہد کسب حلال اور محنت کی عظمت کو سامنے لاتی ہے ۔

خلافت سے سرفرازی :

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شادی کے کچھ دن بعد ہی آپ کے شیخ طریقت حضرت شیخ محمد نے آپ کو خرقۂ خلافت سے سرفراز فرمایا ، ان کے علاوہ بھی آپ نے طریقت کے مختلف خانوادوں اور شیوخ سے مختلف سلاسل میں خلافت حاصل کی ۔

آپ کے صاحبزادے حضرت شیخ رکن الدین نے آپ کی جو سوانح « لطائف قدوسی » کے نام سے مرتب کی ہے ، اس میں آپ کے مختلف سلسلوں سے خلافت کے شجرے دیئے ہیں ۔

---

(۱) لطائف قدوسی ، ص ۱۰۲ لطیفہ ۹۶

(۲) خزینۃ الاصفیا ، ج ۱ ، ص ۴۲۷ بحوالہ معارج الولایت ۔

صوفی شاہ سید محمد حسین مراد آبادی نے سلاسل اربعین[۱] کے نام سے ایک رسالہ تصنیف فرمایا تھا ، چونکہ یہ بزرگ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے سلسلے میں بیعت تھے ، اس لیے ان بزرگ نے اپنے اس رسالے میں حضرت شیخ کے متعدد سلسلۂ طریقت درج کیے ہیں - حضرت شیخ کے سلاسل طریقت پر تفصیل کے لیے اس رسالے کا مطالعہ ضروری ہے -

ردولی سے ہجرت :

۸۹۷ھ (۹۲ - ۱۴۹۱ء) میں ردولی کے حالات خراب ہوئے ، اور کفر کا اس درجہ غلبہ ہوا کہ سور کا گوشت بازاروں میں کھلم کھلا فروخت ہونے لگا - جب وطن کے حالات کی خرابی یہاں تک پہنچی تو آپ ملول و دل گیر ہو کر ترک وطن کر کے شاہ آباد - ضلع کرنال چلے آئے ، یہ پرگنہ اس زمانے میں عمر خاں شروانی[۲] کا تھا جو شاہ آباد پرگنے کا حاکم تھا ، وہ آپ کا معتقد تھا ،

---

(۱) سلاسل اربعین : تصنیف صوفی سید شاہ محمد حسین چشتی قدوسی - سنہ تصنیف : ۱۳۳۰ھ (۱۲ - ۱۹۱۱ء) مطبوعہ : مطبع بیت الشرف - دہلی :- سنہ طباعت : ۱۱ رجب ۱۳۳۱ھ (۱۹۱۳ء) -

(۲) عمر خاں شروانی : عمر خاں شروانی بن سکندر خاں کبکور - بہلول لودہی کے درباری امرا میں تھا ، جب احمد خاں بھٹی کی بغاوت کو فرو کر کے وہ واپس آیا تو بہلول لودہی نے اسے اس کے ذاتی مصارف کے لیے سرہند اور قصبہ شاہ آباد ضلع کرنال دیا ، اور بھتور اور پایل پور جاگیر میں عطا کیے - سکندر لودہی کے اوائل عہد حکومت ۸۹۷ھ (۹۲-۱۴۹۱ء) میں وہ کول کا شقہ دار یا ناظم تھا ، بھیکم پور کا شروانی خاندان اسی عمر خاں کی اولاد میں ہے (ماخوذ از شروانی نامہ ، ص ۳۴ - ۳۵ - ۳۷ - ۳۹)

اور چاہتا تھا کہ آپ کسی طرح اُس کے پرگنے میں قیام کریں۔ چنانچہ آپ شاہ آباد میں مستقل مقیم ہو گئے۔ اور تقریباً اڑتیس سال تک اس قصبے کو اپنے رشد و ہدایت کا گہوارہ بنائے رکھا، آپ کی ذات گرامی علم و معرفت، رموز و حکمت، احسان و سلوک کا وہ سرچشمہ تھی کہ ہزاروں تشنگان معرفت آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور فیضیاب ہو کر جاتے۔

آپ کے دوسرے صاحبزادے شیخ رکن الدین[۱] مصنف ''لطائف قدوسی'' اور آپ کے تمام دوسرے صاحبزادے سوائے شیخ حمید کے سب اسی قصبے میں پیدا ہوئے۔

---

(۱) شیخ رکن الدین : بن حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی : یہ ۵ جمادی الاول ۸۹۷ھ (۱۴۹۲ء) کو شاہ آباد ضلع کرنال میں پیدا ہوئے۔ اخبار الاخیار میں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اُن کے محامد و اوصاف کو بیان کرتے ہوئے لکھا کہ :

شیخ عبدالقدوس را اولاد بسیار شد، و پسران او همه عالم و متعبد و متلبس بلباس مشائخ
و از میان ایشان شیخ رکن الدین مردے متبرک بود، و بہ مشرب فقر و محبت موصوف برقدم والد خود قدم می نہاد (اخبارالاخیار، ص ۲۲۲)

شیخ رکن الدین نے درسی کتابوں کی تعلیم شیخ فتح اللہ بن نصیر الدین، سید احمد حسینی اور شیخ ابراہیم بن معین حسینی ایرجی سے حاصل کی، اور اپنے والد محترم حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے دست حق پرست پر بیعت ہو کر سلسلۂ چشتیہ اور دوسرے طریقوں کی تعلیم حاصل کی، اور طریقہ قادریہ کی تعلیم

(باقی حاشیہ بر صفحہ ۳۹۹)

شیخ محمد کی وفات :

اسی زمانے میں جب کہ آپ شاہ آباد میں مقیم تھے۔ آپ کے مرشد شیخ محمد ، واصل الی اللہ ہوئے ، حضرت شیخ محمد کے صاحبزادے شیخ بڈہیا حضرت شیخ کے پاس تعلیم حاصل کرتے تھے ، آپ ان کو ساتھ لے کر ردولی پہنچے ۔ یہ وہ وقت تھا کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۹۸)

ابراہیم بن معین ایرجی سے حاصل کی ، اور اپنے والد کی وفات کے بعد وہ گنگوہ میں متولی ہوئے ، شیخ رکن الدین کے مریدوں میں شیخ عبدالاحد سرہندی بن شیخ زین الدین سرہندی جو حضرت مجدد الف ثانی کے والد محترم ہیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ شیخ رکن الدین نے ۹۸۲ھ (۷۵ - ۱۵۷۴ء) میں گنگوہ میں وفات پائی ۔ ان کا مزار مبارک اپنے والد کی قبر کے متصل جانب جنوب واقع ہے ۔ شیخ رکن الدین کی تصانیف میں سب سے اہم کتاب ''لطائف قدوسی'' ہے ، جو حضرت شیخ عبدالقدوس کے حالات و ملفوظات کا مجموعہ ہے اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر ان کی یہ کتاب نہ ہوتی تو ہماری دسترس حضرت شیخ کے حالات تک بہت مشکل تھی ۔ لطائف قدوسی کی تالیف انھوں نے حضرت شیخ کی اجازت سے ان کی زندگی ہی میں ۹۴۴ھ (۳۸ - ۱۵۳۷ء) میں شروع کی تھی ۔ لیکن اس کی تکمیل حضرت شیخ کی وفات کے بعد ہوئی ۔ اس کے علاوہ ان کی دوسری تصنیف ''مرج البحرین'' ہے ، ان کی تیسری تصنیف حضرت شیخ کی کتاب رشد نامے پر حواشی ہیں ، اس کے ماسوا حضرت رکن الدین کے مکاتیب ، اور ایک چھوٹا سا رسالہ ''عید قرباں'' ہے ، جو لطائف قدوسی کے آخر میں شامل ہے (ماخوذ از تذکرہ ''شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور ان کی تعلیمات ، تالیف اعجازالحق قدوسی ص ۳۹۷ — ۴۰۶)۔

شیخ محمد پر مرض الموت کا شدید غلبہ تھا۔ حالت یہ تھی کہ کبھی وہ ہوش میں آ جاتے تھے، اور کبھی بے ہوش ہو جاتے تھے۔ جب سکرات کا عالم شروع ہوا تو آپ نے اپنے مرشد سے عرض کیا کہ حضور! یہ وقت ہوشیاری کا ہے، حضرت شیخ محمد نے فرمایا میاں! ہماری طرف سے بے فکر رہو، اب یہ عالم ہے کہ ہمارے سینے میں سوائے اللہ کے کوئی چیز نہیں گزرتی۔

حضرت شیخ محمد کی وفات کے بعد آپ نے اُن کے صاحبزادے شیخ بڈھیا کو اُن کا خلیفہ چُنا، اور ان کے والد کی جگہ انہیں سجادہ نشین کیا۔[1]

گنگوہ میں آمد:

حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی ۸۹۷ھ (۹۲-۱۴۹۱ء) سے ۹۳۴ھ (۲۸-۱۵۲۷ء) تک تقریباً سینتیس سال شاہ آباد میں مقیم رہے، ۹۳۴ھ (۲۸-۱۵۲۷ء) میں آپ کے ایک مرید ملک عثمان کرّانی نے جو گنگوہ کے رہنے والے تھے آپ سے درخواست کی کہ اگر آپ کے صاحبزادوں میں کوئی ہمارے وطن گنگوہ میں سکونت اختیار کرے تو ہمارے لیے موجب برکت و سعادت ہو گا حضرت شیخ نے ملک عثمان کرّانی کے اصرار پر پہلے حضرت شیخ رکن الدین کو گنگوہ روانہ فرمایا، ملک عثمان کرّانی نے ان صاحبزادے کا شاندار استقبال کیا، اور قصبہ گنگوہ کے اس محلے میں جو اب "محلہ سرائے" کے نام سے مشہور ہے، خیمے لگوائے، بعد میں حضرت شیخ رکن الدین کے دوسرے بھائی بھی وہاں آ گئے، لیکن ان میں سے کسی کا دل گنگوہ میں نہ لگا، یہ بار بار لوٹ کر شاہ آباد واپس آجاتے تھے۔ ایک دن حضرت شیخ نے ان صاحبزادوں سے فرمایا تم کیوں بار بار گنگوہ سے لوٹ کر واپس

(۱) لطائف قدوسی، ص ۴۰، لطیفہ ۵۳

آتے ہو آئندہ اسی قصبے کو تمھارا وطن بننا ہے ۔ یہاں تک کہ مغلوں کی تاخت و تاراج شروع ہوئی، اور حضرت شیخ ، ابراہیم لودہی کی شکست سے ایک سال قبل مغلوں کی غارت گری کے خوف سے اپنے اہل و عیال کو لے کر شاہ آباد سے گنگوہ منتقل ہو گئے ، اور آپ نے وہیں سکونت اختیار کر لی ۔

بابر اور ابراھیم لودھی کی جنگ :

آخر ۹۳۳ھ (۱۵۲۶ء) میں پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودہی اور بابر کے درمیان وہ معرکہ ہوا ، جس نے ہندوستان میں لودہیوں کے چراغ سلطنت کو گل کر دیا ، اور بابر نے اس بر صغیر پاک و ہند میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی ۔

اس لڑائی میں ابراہیم لودہی کے ساتھ ایک لاکھ سپاہی اور ایک ہزار جنگی ہاتھی تھے ، اور بابر کے پاس صرف بارہ ہزار فوج تھی ۔

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی [7] پانی پت کے میدان جنگ میں :

لطائف قدوسی میں ہے کہ جب بابر اور سلطان ابراہیم لودہی کے درمیان پانی پت میں جنگ ہوئی تو ملک میں اس قدر پریشانی اور ابتری پھیل گئی کہ لوگ اپنے وطن اور گاؤں چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے ، اس افراتفری میں ملک ویران ہو گیا ، نہ کہیں پناہ کی جگہ تھی ، اور نہ کہیں بھاگنے کی ، اس بدامنی اور پریشانی کے زمانے میں حضرت شیخ عبدالقدوس بھی اپنے متعلقین اور مریدین کے ساتھ گنگوہ چھوڑ کر کتانہ نامی گاؤں میں تشریف لے گئے ، اور کتانہ میں دریائے جمنا کے کنارے مشرقی جانب ٹھہرے اور دریا کے مغربی جانب سلطان ابراہیم لودہی کا لشکر پڑاؤ کیے ہوئے تھا ، اس لشکر میں بہت سے آپ کے مرید

و معتقد تھے ، جو آپ کے یہاں مقیم ہونے کی خبر سن کر جوق در جوق ملاقات کے لیے آئے ، جب سلطان ابراہیم لودہی کو خبر ہوئی تو وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ، اور آپ کو نہایت اصرار سے اپنے لشکر میں لے گیا ۔ آپ نے سلطان ابراہیم سے فرمایا مجھے اس مرتبہ خیریت معلوم نہیں ہوتی ، اور میں تمھیں پانی پت سے آگے بڑھتا ہوا نہیں دیکھتا ۔ پھر آپ نے اپنے اہل و عیال کو اپنے صاحبزادے شیخ رکن الدین کے ساتھ گنگوہ روانہ کر دیا ، اور آپ اپنے بڑے صاحبزادے شیخ حمید اور اپنے مرید سید راجا کے ساتھ ابراہیم لودہی کے لشکر میں رہے ، یہاں تک کہ پانی پت کے میدان جنگ میں پہنچے ، عین میدان جنگ میں جب کہ ابھی دونوں لشکروں کے درمیان جنگ چھڑی نہ تھی کہ آپ نے اپنے صاحبزادے شیخ حمید اور سید راجا سے فرمایا مجھے اپنے گھوڑے کی رفتار سے پتا چلتا ہے کہ سلطان ابراہیم کو شکست ہوگی ، مناسب یہ ہے کہ ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں ، لیکن آپ کسی وجہ سے روانہ نہ ہو سکے ۔

حضرت شیخ ، بابر کی قید میں :

اسی زمانے میں جب کہ آپ ابراہیم لودہی کے لشکر میں مقیم تھے ، آپ نے اپنے صاحبزادے شیخ حمید اور سید راجا سے فرمایا کہ ہمارے خواجہ ، خواجہ قطب الدین اوشی[۲۸] کو بھی قید و بند کا سامنا کرنا پڑا تھا ، یہ ہمارے پیروں کی سنت ہے ، ہم بھی اس سنت کو اختیار کریں گے ، اگر تم جانا چاہو تو جا سکتے ہو ، دونوں نے جواب دیا یوں تو حضور کی جو مرضی ہو ہم اس کے لیے حاضر ہیں ، لیکن ایسے نازک وقت میں ہم حضور کو چھوڑ کر کہاں جا سکتے ہیں ۔

دونوں لشکروں میں معرکہ شروع ہوا ، اور رجب ۹۳۲ھ (۱۵۲۶ء) کو سلطان ابراہیم لودہی کو بابر کے ہاتھوں شکست

ہوئی۔ سواروں نے حضرت شیخ کو اور آپ کے ساتھیوں کو گھیر لیا، اور آپ کے کپڑے اور گھوڑے کو لوٹ لیا، شیخ حمید اور سید راجا کے گلے میں حضرت شیخ کی سیاہ پگڑی ڈال کر اور انھیں اپنے گھوڑوں کے فتراک سے باندھ کر چلے؛ جب اُن کے گلے میں پگڑی ڈالی جا رہی تھی تو آپ نے ان دونوں سے فرمایا پریشان مت ہو، تمھارے گلے میں تمھارے پیروں کی دستار ہے، اور اس کی برکت سے تم نجات حاصل کرو گے، سواروں نے حقارت سے شیخ کو حکم دیا کہ وہ پیدل چلیں۔ اگرچہ آپ میں پیدل چلنے کی طاقت نہ تھی، لیکن خدا کے فضل اور اس کی مدد سے پانی پت کے میدانِ جنگ سے دہلی پہنچے، مولانا زادہ کمال الدین بھی اس سفر میں آپ کے ہمراہ تھے۔[1]

حضرت شیخ کی رہائی:

کچھ دن کے بعد حضرت شیخ اور آپ کے متعلقین کو رہا کر دیا گیا۔ اگرچہ آپ لودہیوں سے خوش تھے، آپ نے سکندر لودہی کا پورا دور حکومت دیکھا تھا۔ اُس نے شعار اسلام کی ترویج کی جو کوشش کی تھی اس کی بنا پر حضرت شیخ کو لودہیوں سے خاص تعلق خاطر تھا، لیکن جب بابر فتح یاب ہوا، تو آپ نے اُسے بھی ایک خط لکھا، اور اُسے اتباع شریعت، عدل و انصاف خلفائے راشدین رض کی پیروی کی طرف توجہ دلائی، اس خط کو ہم آئندہ اوراق میں آپ کے رشد و ہدایت کے ضمن میں نقل کریں گے۔

عہد ہمایوں:

بابر کی وفات کے بعد اُس کا بیٹا ہمایوں ۹۳۷ھ (۱۵۳۰ء) میں تخت نشین ہوا۔ مغلوں اور افغانوں کی کشمکش اس کے عہد میں بھی جاری رہی، لطائف قدوسی میں کئی ایسے واقعات ملتے

(۱) لطائف قدوسی، ص ۶۳ - لطیفہ ۷۷۔

ہیں کہ جن سے پتا چلتا ہے کہ حضرت شیخ کے مریدوں نے ان لڑائیوں میں حصہ لیا ، لیکن ہم طوالت کے اندیشے سے ان واقعات کو ترک کرتے ہیں - ہمایوں کو بھی حضرت شیخ سے نہایت عقیدت و محبت تھی - مراۃ الاسرار میں ابوالفضل نے تذکرۃ الاولیا' کے حوالے سے لکھا ہے کہ : محمد ہمایوں بادشاہ ، علم حقائق و معارف میں حضرت شیخ عبدالقدوس حنفی سے ملاقات رکھتا تھا ، اس لیے کہ حضرت شیخ اس فن میں ممتاز تھے -[1]

صاحب سیر المتاخرین نے حضرت شیخ سے ہمایوں کی عقیدت و محبت کو بیان کرتے ہوئے لکھا کہ

جنت آشیانی با برخے کار آگھاں بزاویہ' او
(شیخ عبدالقدوس) در شدے و انجمن آگہی
گرمی پزیرفتے -[2]

حضرت شیخ کا مسلک

وحدت الوجود :

تصوف میں مسئلہ وحدۃ الوجود کو خاص اہمیت حاصل ہے ، نقشبندیہ سلسلے کے علاوہ اس برصغیر پاک و ہند میں تصوف کے جو سلسلے رائج تھے مثلاً سہروردیہ ، چشتیہ ، قادریہ ان تینوں سلسلوں کے متقدمین صوفیا پر وحدۃ الوجود کا رنگ غالب تھا - مولانا روم بھی وحدۃ الوجود کے قائل ہیں ، سلسلہ' چشتیہ کے دوسرے بزرگوں کی طرح حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی بھی وحدۃ الوجود کے قائل تھے ، انہوں نے دسویں صدی ہجری میں

---

(۱) مقدمہ منتخب مکتوبات قدوسیہ از مولانا مشتاق احمد انبیہٹوی ، ص ٦ -
(۲) سیرالمتاخرین جلد اول - ذکر اولیائے ہند ص ۲۰۶ - مطبوعہ مطبع نو لکشور لکھنؤ -

اس نظریے کی اشاعت میں غیر معمولی حصہ لیا ، لیکن وہ وحدۃالوجود کے نظریے کے اس حد تک قائل تھے ، جس حد تک اسلام مانع نہیں ہے ۔

لطائف قدوسی کے اکھترویں لطیفے میں ہے کہ : ایک دفعہ حضرت شیخ نے گنگوہ میں نماز فجر کے بعد جماعت کی طرف متوجہ ہو کر حالت سرمستی میں وحدۃ الوجود پر گفتگو فرمائی ۔ آپ کے صاحبزادے حضرت شیخ رکن الدین کا بیان ہے کہ میں اور میرے بھائی شیخ حمید اور شیخ احمد اس مجلس میں حاضر تھے ، میں نے آپ سے گزارش کی کہ مسئلہ وحدۃ الوجود ، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنھم سے کہیں بھی منقول نہیں ہے ، اور نہ شارع علیہ السلام نے دین کا مدار مسئلہ وحدۃ الوجود پر رکھا ہے ، اور نہ اس کے متعلق کچھ بیان کیا ہے آج کل ہم لوگ جو اس مسئلے کو بیان کرتے ہیں ، اور اس پر اعتقاد رکھتے ہیں ، کہیں ایسا نہ ہو کہ کل قیامت کے دن اس مسئلے پر اعتقاد ہمارے لیے نفرت کا باعث ہو ۔ اور مواخذے کا سبب بنے ۔ آپ نے میرے جواب میں فرمایا کہ اگرچہ یہ مسئلہ صراحت سے شریعت میں بیان نہیں کیا گیا ، لیکن اشارۃ النص اور دلالۃ النص سے ہمیں اس کے متعلق بہت جگہ ملتا ہے ، بلکہ بعض جگہ تو صراحت سے بھی ملتا ہے ، لیکن اس کو علمائے ظاہر متشابہ کہتے ہیں ، اور ظاہر کے مطابق تاویل کرتے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ تبع تابعین کے عہد میں ظہور میں آیا ۔ اور وہ بھی زمانۂ خیر تھا،[۱] اس لیے کہ یہ بھی خیرالقرون ثالث

---

(۱) اس سے اشارہ ہے اس حدیث شریف کی طرف جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے ، پھر اس کے بعد جو آئے گا ، پھر اس کے بعد جو آئے گا (مؤلف)

تھا ۔ اور جنھوں نے اس مسئلے کو وجود بخشا ، وہ اس دور کے مشائخ کے سردار ، دین کے مقتدی اور مجتہدین وقت تھے ، اور تمام علمائے ظاہر، دین کے مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے ۔ ہمیں ان کے قول و فعل پر اعتماد کرنا چاہیے ، ہمیں اس کے علاوہ اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ اگر یہ مسئلہ خلاف شریعت ہوتا تو حضرت امام اعظم ، امام مالک ، امام شافعی ، امام احمد بن حنبل ، امام محمد و امام یوسف اور دوسرے ائمۂ اہل سنت و جماعت جو دین کے بانی تھے ، اور دوسرے مشائخ کبار اور موحدین اس مسئلے پر ضرور قلم اٹھاتے ، اور صراحت سے اس سے اختلاف کرتے ، اگر یہ مسئلہ دین کے خلاف ہوتا اور باطل ہوتا تو علمائے اہل سنت پر لازم تھا کہ وہ اس کے متعلق سکوت اختیار نہ کرتے ، اور اس کی تردید میں مشغول ہو جاتے ، کیونکہ حق کے متعلق سکوت کرنے والا گونگا شیطان ہے ، اسی طرح وہ اس کی بھی تردید کرتے ، جیسا کہ انھوں نے معتزلہ ، فلاسفہ اور دوسرے گمراہوں کی تردید کی ہے ، پس جب ائمۂ دین نے اس مسئلے میں سکوت اختیار کیا ہے ، اور اس کا رد اور انکار نہیں کیا تو اس سے یہ ظاہر ہوا کہ یہ مسئلہ دین کے خلاف نہیں ، کیونکہ بیان کے محل میں خاموشی خود بمنزل اقرار کے ہے ، اس سے ظاہر ہوا کہ اس مسئلے میں اختلاف ہے ، بعض کثرت وجود کے قائل ہیں ، جو کثرت وجود کے قائل ہیں ، وہ علمائے ظاہر ہیں ، اکثر زہاد ، عابدین ، اور مشائخ کبار اسی مسلک پر ہیں ، اور بعض وحدۃ الوجود کے قائل ہیں ، یہ بھی موحد اور عارفان حقیقت وجود ہیں ، اور ان میں بھی جلیل القدر علماء ، مقتدائے دین اور مجتہدان وقت ہیں ، اور اہل حق کا کشف بھی اس کے حق ہونے پر شاہد ہے ، پس یہ مسئلہ مختلف فیہ تو ہے لیکن مخالف دین نہیں ، اور نہ بندے کے لیے آخرت میں مضر ہے ، ماحصل یہ ہے کہ مسئلہ وحدۃ الوجود اسرار الٰہی میں سے ہے ۔

اور ایک ایسی حقیقت ہے ، جس کا تعلق باطنی سر بلندیوں سے ہے
اور ہر آدمی اور ہر مرتبے کے لائق و سزاوار نہیں ، اسی لیے
اسرار ربوبیت کے افشا کو کفر کہا گیا ہے ، حق یہ ہے کہ جب
بھی کوئی منصور حلاج کی طرح اناالحق کا نعرہ لگائے گا ، اسی
طرح دار پر جائے گا ۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ مسائل کی
نوعیت مختلف ہے ، معذور کا مسئلہ علیحدہ ہے ، تندرست کا مسئلہ
علیحدہ ہے ، اسی طرح مسئلۂ شریعت الگ ہے ، مسئلۂ طریقت
الگ ہے اور مسئلۂ حقیقت الگ ہے ، اسی لیے کلمۂ طیبہ
کے مفہوم و مطالب میں لا معبود الا اللہ مسئلہ شریعت ہے ،
لا مقصود الا اللہ مسئلہ طریقت ہے ، لا موجود الا اللہ مسئلہ حقیقت
ہے ۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ مسئلہ وحدۃ الوجود میں
محققین کے اختلاف کی بنیاد ایک دوسرے ہی اختلاف پر مبنی ہے ۔
ایک فرقہ جو کثرت وجود کا قائل ہے ذات حق سبحانہ و تعالیٰ
کو کہ واجب الوجود ہے ماوراء الوجود کہتا ہے ، جس کو
ہماری عقل ادراک نہیں کر سکتی ، وہ وجود کو صفت لازمی
مقتضا اس ذات کا قرار دیتا ہے کہ وجود اس ذات سے ازلاً و
ابداً جدا نہیں ہوتا ، اور جو لوگ وحدۃ الوجود کے قائل ہیں
وہ ذات حق سبحانہ و تعالیٰ کو عین وجود مطلق قرار دیتے ہیں ،
اس لیے کہ موجودیت میں اعلیٰ مرتبہ وجود مطلق ہے ، اور وہی
واجب الوجود ہے ، غرض کہ ہر فریق کے پاس متعدد براہین و
دلائل ہیں جنھیں اپنے موقع پر سمجھا جا سکتا ہے ۔

شیخ رکن الدین کا بیان ہے کہ میں نے اور میرے برادر
محترم شیخ حمید اور شیخ احمد نے اس روز حضرت شیخ سے اس
مسئلے پر اس قدر طویل گفتگو کی کہ صبح سے لے کر دوپہر کا
وقت ہو گیا ۔

جب یہ مجلس برخاست ہوئی تو حضرت شیخ کو خیال

گزرا کہ ابھی یہ لڑکے علم معرفت میں ناقص ہیں ، اور مسئلہ وحدۃ الوجود کے منکر ہیں ۔ آپ نے فرمایا کہ میں اب ان لڑکوں کے ساتھ نہیں رہوں گا کہ ان کا مسلک و مشرب اور میرا مسلک و مشرب جدا جدا ہیں ۔ پھر میں اور یہ کیسے اکھٹے رہ سکتے ہیں ، یہ کہہ کر آپ عالم جذب و سرمستی میں اٹھ کر روانہ ہو گئے ، آپ کی یہ کیفیت تھی کہ کسی کو کچھ کہنے سننے کی جرات نہ تھی ، تقریباً نصف کوس تک پیدل گئے ، پھر لوگوں نے آپ کے سامنے گھوڑا پیش کیا ، چنانچہ آپ گھوڑے پر سوار ہو کر قصبہ تھانیسر کی طرف روانہ ہوئے ، پھر آپ نے فرمایا کہ میں تھانیسر جا کر شیخ جلال تھانیسری[1] سے بھی پوچھتا ہوں کہ وہ اس مسئلے میں کیا مذہب و مشرب رکھتا ہے ، اگر وہ ہمارے مذہب و مسلک پر اعتماد نہیں رکھتا تو میں اس سے بھی قطع تعلق کر لوں گا ۔ مختصر یہ کہ اسی جوش و سرمستی میں آپ قصبۂ لکھنوتی سے بھی آگے بڑھ گئے ، اور آپ کے پیچھے

---

(۱) شیخ جلال تھانیسری : حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے مرید اور جلیل القدر خلفاء میں تھے ، یہ سترہ سال کی عمر میں علوم ظاہریہ کی تکمیل کر کے فارغ التحصیل ہو گئے ، پھر علوم باطنی کی طرف متوجہ ہوئے ، اور حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی سے بیعت ہو کر خرقۂ خلافت حاصل کیا ۔ علم و فضل کے اعتبار سے بھی وہ عہد اکبری کے اکابر علماء میں شمار ہوتے تھے ، اکبر ان کی بے حد تعظیم کرتا تھا ، صاحب تالیف و تصنیف تھے تحقیق اراضی الہند اور ارشاد الطالبین شیخ جلال کی تصانیف ہیں ، شیخ جلال نے ۱۴ ذی الحجۃ ۹۸۹ ھ (۱۵۸۱ ء) کو وفات پائی ۔

(خزینۃ الاصفیاء جلد اول ، ص ، ۴۴۹ ۔ رود کوثر ، سفینۃ الاولیاء ص ۹۶)

تمام فرزندان، مریدین اور قصبۂ گنگوہ کے تمام لوگ چلے جارہے تھے، کسی کی مجال نہ تھی کہ آپ کے سامنے دم مار سکے، جب دریائے جمنا قریب آیا تو ہم نے چپکے سے ملاحوں سے کہلا بھیجا کہ وہ کشتیوں کو گھاٹ کے قریب نہ لائیں، شاید اسی تدبیر سے آپ گنگوہ واپس لوٹ چلیں، لیکن ہماری یہ تدبیر بھی نہ چل سکی۔ آخر امیر شاہ اسلام نے جو شہنشاہ ہمایوں کی طرف سے اس وقت گنگوہ کا داروغہ مقرر تھا۔ جراٴت کر کے آپ کے گھوڑے کے پاؤں پکڑ کر عرض کیا کہ جب بادشاہ سلامت کو اس کی خبر ہوگی کہ آپ گنگوہ سے تشریف لے گئے، تو انھیں ضرور اس کا خیال ہوگا کہ ہمارے داروغہ نے شاید آپ کے ساتھ کوئی گستاخی کی ہے، اس وقت حضرت بادشاہ سلامت مجھ کو قتل کرا دیں گے، جب یہ نوبت آنے والی ہی ہے تو بہتر یہ ہے کہ اس جگہ خود آپ اپنے ہاتھوں سے ہی مجھے مار ڈالیئے۔ حضرت شیخ کا جوش اس وقت کچھ کم ہو چکا تھا، امیر شاہ اسلام نے آپ کے گھوڑے کی باگ پکڑی، اور آپ کو واپس گنگوہ لے کر آیا۔ آپ کی ہم فرزندوں پر عتاب کی یہ کیفیت تھی کہ آپ نے ہم کو چھوڑ دیا تھا، اور ہمارے پیچھے نماز نہیں پڑھتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ یہ لڑکے دوسرا ہی مشرب و مسلک رکھتے ہیں، میری نماز ان کے پیچھے کیسے درست ہو سکتی ہے۔ یہاں تک کہ آپ کے خلیفہ حضرت جلال تھانیسری اس خبر کو سن کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور قدم بوسی کی سعادت حاصل کرنی چاہی، حضرت شیخ نے ڈانٹ کر کہا خبردار! وہیں رہو، پہلے یہ بتاؤ کہ تم مسئلۂ وحدۃ الوجود میں کیا مسلک رکھتے ہو؟ شیخ جلال نے پہلے وہ آیتیں تلاوت کیں جو وحدۃ الوجود کی طرف اشارہ کرتی ہیں، پھر اس کی تائید میں مشائخ کرام کے بہت سے اقوال بیان کیے، حضرت شیخ نے انھیں سینے سے لگا لیا، اور بہت دیر تک عشق اور توحید کے متعلق

تقریر فرماتے رہے ، اس وقت میرے بھائی شیخ علی نے بھی وحدۃ الوجود کے متعلق کچھ اشعار پڑھے ۔ ساری محفل پر اس وقت عجیب و غریب کیفیت طاری تھی ، شیخ رکن الدین کا بیان ہے کہ مجھ پر اور شیخ حمید اور شیخ احمد پر اس واقعہ کے دو تین دن کے بعد تک حضرت شیخ کی خفگی رہی ، دو تین روز کے بعد آپ نہایت شفقت سے ہم سے بغل گیر ہوئے، اور بے انتہا نوازش فرمائی ، اس کے بعد میں نے اور میرے بھائی شیخ حمید اور شیخ احمد نے وحدۃ الوجود کی تائید میں رسالے لکھے ۔[1]

حضرت شیخ عبد القدوسؒ کو باوجود اس کے کہ آپ غیر معمولی طور پر متبع شریعت تھے ، اس شورش و سرمستی کی وجہ سے جو ہر وقت آپ پر طاری رہتی تھی ، سماع سے غیر معمولی رغبت تھی ، لیکن سماع سے اس رغبت کے باوجود آپ نے اس مسئلے کو شرعی نقطہ نظر سے کبھی جواز کا رنگ نہیں دیا ، بلکہ جب کبھی بھی یہ مسئلہ شرعی نقطہ نظر سے آپ کے سامنے رکھا گیا ، ہمیشہ آپ نے شریعت کے حکم کو اپنے عمل پر ترجیح دی ، اور اپنے سماع سننے کے عمل کو ایک مجبور و معذور کا عمل بتایا ۔

سماع کے جواز و عدم جواز میں علماء اور مشائخ کا ابتدا ہی سے اختلاف چلا آ رہا ہے ، بعض علماء نے اس کو بالصراحت حرام قرار دیا ہے ، بعض محتاط بزرگوں نے اس مسئلے میں نہ انکاری کنم نہ این کاری کنم کی راہ اختیار کی ہے ، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سلسلہ چشتیہ کے شیوخ ، سماع کو روحانی غذا قرار دیتے ہیں ، لیکن اس کے آداب مقرر کرکے اس کی

---

(۱) یہ تمام تفصیل لطائف قدوسی ، ص ۵۸-۶۰ لطیفہ ۷۱ سے ماخوذ ہے

پابندی ضروری قرار دیتے ہیں ۔ انھوں نے سماع کے لیے یہ چار شرطیں لازمی قرار دی تھیں ۔

(۱) مسمع (گانے والا) مرد کامل ہو ، لڑکا یا عورت نہ ہو ۔

(۲) مستمع (سننے والا) یادِ حق سے غافل نہ ہو ۔

(۳) مسموع یعنی جو چیز گائی جائے وہ فحش نہ ہو ۔

(۴) آلات سماع یعنی مزا میر موجود نہ ہوں ۔

مشائخ چشت کا خیال تھا کہ اگر ان چار چیزوں میں سے ایک چیز بھی موجود نہ ہو تو سماع حرام ہے ۔

شیخ عبد الرحمٰن شاہ آبادی نے ایک مرتبہ سماع سننے کے بعد اپنی کیفیت حضرت شیخ کو لکھی آپ نے اس کے جواب میں ایک خط ان کو لکھا کہ اس خط سے سماع کے متعلق آپ کا مسلک اور آپ کا ذوق اور سماع کا اصل مقصد سامنے آتا ہے آپ نے ان کو تحریر فرمایا کہ :

> شیخ الاسلام برادرم شیخ عبد الرحمٰن دام عرفانہ فی الذوق و الشوق!
>
> از فقیر حقیر عبد القدوس اسماعیل الحنفی بد آنچہ شوق سبحانی و ذوق ربانی در وقتِ سماع کہ ذوق عارفاں در آنست ، و شوقِ عاشقاں بر آنست ، دست می دہد و روزی می شود ، غنیمت می دانند ، و سعادت ابدی خوانند ، حضور مجلس سماع عارفاں برائے سعادت ایں دولت است ، ہر کہ را است مبارک باد اجتماعِ دوستانِ خدائے تعالیٰ و حضور ایشاں در مجلس سماع از جہت طمع این دولت است ، تا از برکتِ مجلس سماع

دلہائے مردان بے چارہ مفلسے را ذوقی رو بنماید و شوقے دست دہد

(ترجمہ)

شیخ الاسلام برادرم شیخ عبد الرحمٰن دام عرفانہ فی الذوق و الشوق!

فقیر حقیر عبد القدوس اسماعیل الحنفی کی جانب سے معلوم ہونا چاہیے کہ سماع کے وقت میں عارفوں کا ذوق اور عاشقوں کا شوق اس میں ہے اگر یہ ذوق اور شوق حاصل ہو۔ اور انسان کا مقدر ہو تو اسے غنیمت جانو۔ سعادت ابدی تصور کرو، عارفین کا مجلس سماع میں حاضر ہونا اسی دولت کے حصول کی سعادت کے حاصل کرنے کے لیے ہے، جس کسی کو یہ نعمت حاصل ہو، قابل مبارکباد ہے۔ خدائے تعالیٰ کے دوستوں کا اجتماع اور ان کی مجلس سماع میں حاضری اسی دولت کے حاصل کرنے کی طمع میں ہے، تاکہ مجلس سماع کی برکت سے ان مفلس اور بے چارہ مردوں کو بھی ذوق کی نعمت حاصل ہو۔ اور شوق کی دولت سے مالا مال ہوں

پھر اسی خط میں طالب سماع کو کامل اتباع شریعت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھا کہ:

ومع ذلک ایشان ابو الوقت نیز اند، تا در صفت وقت خود اقامت شرع کردہ اند، و نماز با وقات گزاردہ اند، و جمعہ و جماعت ترک نکردہ اند کہ ہرچہ یافتہ اند۔ از دولت اقامت شرع یافتہ اند، و ہر دولت کہ داشتند از دولت اقامت شرع داشتند، و چندان

نباید افتاد کہ از وقت بیفتد ، و قساوت روئے آرد کہ
شیطان را درآں دخل بود ، و بعضے مبتدیان را این
واقعہ پیش می آید و العیاذ باللہ ۔

(ترجمہ)

اور اسی کے ساتھ صوفی ابو الوقت بھی ہوتے ہیں (یعنی
وقت کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں) وہ اپنے اوقات
میں اقامت شرع کرتے ہیں ۔ اور نماز پابندی وقت
کے ساتھ ادا کرتے ہیں ۔ اور جمعہ اور جماعت کو
ترک نہیں کرتے ، کیوں کہ انھوں نے جو کچھ
حاصل کیا ہے ، وہ شرع کی دولت کے قائم رکھنے سے
پایا ہے ، اور وہ جو کچھ بھی دولت رکھتے ہیں ،
وہ دولت شرع کے قائم رکھنے کی وجہ سے رکھتے
ہیں ۔ اور آدمی کو اتنا نہ گرنا چاہیے کہ وقت
کے تقاضوں کو بھول جائے ، اور اس میں قساوت پیدا
ہو جائے کہ جس میں شیطان کا دخل ہوتا ہے ، یہ
واقعہ بعض مبتدیوں کو پیش آتا ہے ۔ و العیاذ
باللہ ۔[1]

رشد نامے میں حضرت شیخ نے ایک دو ہے کی توضیح فرماتے
ہوئے لکھا کہ:

سماع ، اسرار الٰہی کو تیرے قلب سے باہر لانے والا
اور سماع کے بارے میں شریعت کا فتویٰ یہ
وہ اس کے اہل کے لیے جائز ہے ، اور نا اہل
حرام ہے ۔ اہل سماع اس شخص کو

---

1 منتخب مکتوبات قدوسیہ ، از مولانا مشتاق ...
۳۹ ، ص ۱۱۰-۱۱۱

کہ کوئی آواز پیامِ یار کی سوا نہ سنے ، اور سوائے جمالِ دوست کے اور کوئی جمال نہ دیکھے۔[1]

تمام مسائل میں حضرت شیخ مسلک اہلِ سنت و الجماعتہ کے سختی سے پابند تھے ، اور فقہ حنفی کی پیروی کرتے تھے۔

شیخ محمد مودود خراسانی کو ایک خط میں علمائے سوء کی بد کرداریوں اور بد اعمالیوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھا کہ :

عزیز من! کار آسان است ، چنان کہ امروز پدید آمدہ است ، علم را وسیلتِ دنیا کردہ اند ، و تصانیف و قصائد بر اہلِ دنیا می پردازند ، و از ایشاں طلب دنیا و طمع دنیا می دارند ، و ایں طائفہ نزدِ اہلِ تحق، دشمنِ حق تعالیٰ اند۔

مشتبہات میں حضرت شیخ کا مسلک یہ تھا کہ آپ اُن چیزوں سے احتراز کرتے تھے ، جو شرعی حیثیت سے ذرا بھی مشتبہ ہوتی تھیں۔ لطائف قدوسی میں ہے کہ حضرت شیخ ہر قسم کی عبادت میں کمی نہ کرتے تھے ، خواہ وہ نماز ہو یا روزہ یا ذکر الٰہی ہو یا زہد و تقویٰ ہو یا توکل! آپ نے ابتدائی حالات ہی میں تمام انواعِ عبادت کو انتہا پر پہنچا دیا تھا ، آپ کے تقوے کا یہ عالم تھا کہ غیر نمازی قصاب کے ذبح کیے ہوئے بکرے کا گوشت نہ کھاتے تھے ، ایک قصاب آپ کا مرید تھا ، آپ نے ذبیحے کے تمام شرعی احکام اس کو سکھائے تھے ، اور اس کی تربیت کی تھی ، جب وہ ذبح کرتا تھا تو

---

(۱) رشد نامہ قلمی (تالیف حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی ، مملوکہ صوفی بشیر احمد قدوسی سجادہ نشین درگاہ حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی ، مقیم کراچی۔

کبھی کبھی وہ گوشت کھاتے تھے - شہر کے کنووں کا پانی استعمال نہ کرتے تھے ، بلکہ شہر سے باہر ایک بڑا حوض تھا ، جس سے آپ کے لیے پانی لایا جاتا تھا ، اسی طرح ہر قسم کے کھانے اور کپڑے میں بھی آپ انتہا درجے کی شرعی احتیاط ملحوظ رکھتے تھے -[1]

ایک دفعہ پکی ہوئی مرغیاں آپ کے سامنے لائی گئیں ، آپ نے اس میں سے ایک لقمہ اٹھایا پھر وہیں رکھ دیا ، اور فرمایا کہ انھیں میرے سامنے سے اٹھا لو ، حضرت شیخ رکن الدین نے عرض کیا کیوں؟ آپ نے فرمایا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مرغیاں صحیح طریقے پر ذبح نہیں ہوئیں ، جب معلوم کیا گیا تو حضرت شیخ کی بات صحیح نکلی -[2]

حضرت شیخ کی تعلیمات

رشد و ہدایت اور مریدوں کی تربیت :

حضرت شیخ کی پوری زندگی کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ آپ بے حد متبع شریعت تھے ، یہاں تک کہ وجد و حال اور عالمِ سرمستی میں بھی آپ احکام شریعت کو پیش نظر رکھتے تھے -

حضرت شیخ رکن الدین کا بیان ہے کہ حضرت شیخ اتباع سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم اور اتباع شرعِ محمدی میں اس قدر راسخ تھے کہ شریعت سے ذرّہ بھر تجاوز ظاہر و باطن میں نہ کرتے تھے ، نہ اس کو اپنے لیے پسند فرماتے تھے ، نہ دوسروں کے لیے ، اگر کسی کی کوئی بات خلافِ شریعت دیکھتے تو اس سے بیزاری اور برأت

---

(۱) لطائف قدوسی ، لطیفہ ۲۰ ص ۱۵
(۲) لطائف قدوسی ، لطیفہ ۶۶ ص ۵۰

کا اظہار فرماتے ، اور ایسے شخص کو اپنے قریب نہ آنے دیتے تھے۔ اگرچہ آپ کا تعلق مختلف الخیال جماعتوں سے تھا ، لیکن آپ پر ان کا کوئی خیال اثر انداز نہ ہوتا تھا ، البتہ وہ لوگ آپ کی ملاقات سے صراطِ مستقیم کو پا لیتے تھے ۔

اتباعِ شریعت ، حضرت شیخ کی تعلیمات کی روح تھا ، وہ روحانی ترقی کے لیے اتباعِ شریعت کو ضروری قرار دیتے تھے ۔ آپ کے اصلاح و تربیت کے اصول قرآنی تعلیمات اور اتباعِ شریعت پر مبنی تھے ، اور انھیں اصولوں کے تحت آپ اپنے مریدوں کی اصلاح و تربیت فرماتے تھے ۔ آپ کا ذہن فکر کے نئے نئے راستے تلاش کرتا تھا ، اور اس طرح آپ اپنے فکر کے ذریعہ شریعت کو آگے بڑھاتے اور پھیلاتے تھے ، آپ کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ انسان اور انسانیت روحانی سطح پر ترقی کریں ، اور معاشرے کی وہ تمام خرابیاں دور ہوں جو اسے گھن کی طرح کھائے جا رہی ہیں ۔

آپ نے اپنے مریدوں اور اپنے عہد کے سلاطین اور ان کے امرا اور اپنے معتقدین کے نام جو خطوط لکھے ہیں ، وہ آپ کے رشد و ہدایت کے کارناموں اور مریدوں کی اصلاح و تربیت کے آئینہ دار ہیں ، حقیقت یہ ہے کہ آپ سلسلۂ چشتیہ صابریہ کے مجدد تھے ، اور آپ نے اپنے عہد میں اس سلسلے کو حیاتِ نو بخشی تھی ۔ خود آپ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا کہ :

من ایں سلسلہ را رنگے دیگر بخشیدہ ام ۔[۱]

(ترجمہ)

میں نے اس سلسلے (چشتیہ صابریہ) کو دوسرا ہی رنگ بخشا ہے

(۱) مقدمہ منتخب مکتوبات قدوسیہ از مولانا مشتاق احمد انبہٹوی ، ص ۵ بحوالہ اقتباس الانوار ۔

حضرت شیخ جلال تھانیسری جو آپ کے عظیم المرتبت خلفاء میں ہیں، انھیں ایک خط میں شب بیداری اور عبادتِ شب کی نصیحت کرتے ہوئے لکھا کہ:

عزیز من! از دولتِ بیداریِ شب عاشقان و صادقان و مخلصان دست بداماںِ معشوق زدند و بمقصود مطلق رسیدند، و بوصول پیوستند، و واصلِ حق گشتند و ہرچہ یافتند و ہر کمال و جمال کہ داشتند از دولتِ بیداریِ شب داشتند۔

(ترجمہ)

عزیز من! دولتِ بیداریِ شب کی بدولت ہی عاشقوں، صادقوں اور مخلصوں نے دامنِ معشوق تک رسائی حاصل کی ہے، اور مقصود تک پہنچے ہیں، اور واصلِ حق ہوئے ہیں، اور جو کچھ بھی پایا ہے، اور جو کمال و جمال وہ رکھتے تھے، دولتِ بیداریِ شب ہی کی وجہ سے رکھتے تھے۔

ریاکار صوفیوں اور خام درویشوں پر تاسف:

پندرہویں صدی عیسوی میں اس برِ صغیر پاک و ہند کے صوفیائے خام طرح طرح کی گمراہیوں کا شکار تھے، اور ان کی گمراہی کے اثرات مختلف طور پر ظاہر ہو رہے تھے، یہ صورتِ حالات حضرت شیخ کو سخت ناگوار تھی، صوفیائے خام اپنے پیٹ کی خاطر غیر اسلامی فکر و کردار کو دین سے ہٹ کر اپنائے ہوئے تھے۔ ان حالات پر اظہار افسوس کرتے ہوئے اپنے ایک مرید شیخ عبد الرحمٰن کو لکھتے ہیں: (۲)

امروز از بد روز ماست پیری و مریدی از کجا این ہمہ جز بت پرستی و خود پرستی نیست ۔ و العیاذ من ذالک۔[1]

پھر اسی خط میں آخر میں شیخ عبد الرحمٰن کو نصیحت کرتے ہوئے لکھا کہ: امروز درویشی بلقمہ فروشی است ، ما مدبران را خدائے تعالیٰ ازیں درویشی و دین فروشی توبہ دہد ، اول بارے مسلمانی درست کنیم و بعدہ درویشی ۔[1]

شیخ احمد مٹھن سدہوری کو اُن کے ایک خط کے جواب میں صوفیائے حق پرست کے فقدان اور صالح علماء کی کمیابی پر اظہار تاسف کرتے ہوئے لکھا کہ:

و ایں خود امروز واقعہ است کہ ایشان امروز ناپید شدہ اند ۔[2]

اپنے دور کے علماء کی علمی سطحیت پر اظہار افسوس کرتے ہوئے تحریر فرمایا کہ:

و ایں ہم روزگار ما مدبران است کہ چند ورق کتاب خوانند و ترجمہ دانند و زبان بجنبانند و خود را عالم می دانند و خوانند و اہل کمال و حال دانند کہ آں ہمہ جہالت است نہ علم[3]۔

یہ دیکھ کر کہ علمائے سوء علم کو حصول دولت کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں ، اور منصب وجاہ کی خاطر دین کی خدمت سے منہ موڑ کر اپنے علم کو امراء کے قصائد اور اپنی تصانیف کو ان کی

(۱) منتخب مکتوبات قدوسیہ ، مکتوب ہژدہم در جواب شیخ عبد الرحمٰن ، ص ۵۷
(۲) ایضاً ، ص ۶۱ مکتوب نوزدہم
(۳) ایضاً ، ص ۶۱

مدح میں رنگ رہے ہیں ، اپنے ایک خط میں شیخ مودود کو اس صورت حال پر افسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

این فقیر سرگردانِ روزگار ست ، ہیچ تحصیل ندارد ، و عمر دربیابان و خرابہ گزرا نید ، و بجہل آخر شد ، کار این مدبر براین گونہ است :

سودۂ گشت از سجدہ راہِ بتان پیشانیم
چند خود را تہمت دینِ مسلمانی نہیم

ما مدبران را جز غم شکم و روزی نیست و ہیچ بہرہ زوزی نیست دنیا را دین خود ساختہ ایم ، و قبلۂ خود داشتہ ائیم دین کجا و اسلام کجا ، حال و مقام کرا ، علم و عمل چہ باشد - بیت -

چوں ز دل دنیات دور افکندہ نیست
جائے تو جز دوزخ سوزندہ نیست

چنانکہ امروز پدید آمدہ است ، علم را وسیلت دنیا کردہ اند ، و تصانیف و قصائد برائے اہلِ دنیا و طمع دنیا دارند ، این طائفہ نزد اہلِ حق دشمنانِ حق تعالیٰ اند۔

شاہانِ اسلام کے اوصاف :

اندازاً حضرت شیخ ، بہلول لودہی کے عہد میں پیدا ہوئے ، اور انھوں نے ہمایوں کے عہد میں وفات پائی تھی ، حضرت شیخ نے حسب ذیل بادشاہوں کا زمانہ دیکھا تھا ، اور حالات کا بغور مطالعہ کیا تھا ۔

(۱) منتخب مکتوبات قدوسیہ ۔ مکتوب سی و یکم درجواب محمد مودود ، ص ۹۳

(۱) بہلول لودہی (۲) سکندر لودہی (۳) ابراہیم لودہی (۴) بابر (۵) ہمایوں۔

ابتداً اگرچہ حضرت شیخ نے سیاست میں حصہ نہیں لیا ، اور سلاطین اور ارباب حکومت سے کوئی تعلق رکھنا پسند نہیں کیا ، لیکن بعد میں آپ نے سیاست میں حصہ لیا ، پاک و ہند کی تاریخ میں یہ بات ہمیشہ یاد رہے گی کہ آپ نے لودہیوں کے دور میں لودہی فرمانرواؤں اور ان کے اُمرا کو اور مغل دور میں مغل فرمانرواؤں اور اُن کے اُمرا کو اسلامی نقطۂ نظر سے ان کے فرائض اور پابندیوں سے آگاہ کیا ، اور انہیں اعلائے کلمۃ الحق ، اتباع سنت ، ترویج شریعت ، عدل و انصاف اور احترام علماء کی طرف توجہ دلائی۔

میرمحمد مودود کو اُن کے ایک استفسار اور خط کے جواب میں آپ نے اسلامی نقطۂ نظر سے اعلاسی حکومت کے سربراہوں ، فرمانرواؤں اور اُمرا کو کن اوصاف سے متصف ہونا چاہیے تحریر کیا کہ :

بدانکہ چون مقرر است کہ "الناس علی دین ملوکھم" پس ملوکان و عاملان اسلام را شاید و باید کہ در احکام شرائع احتیاط تمام کنند ، تا ہر خاص و عام در شرائع اقدام نمایند ، و بشرائع آراستہ و پیراستہ گردند ، و اسلام رونق گیرد ، و علماء و صلحاء عزت پذیرند ۔[۱]

(ترجمہ)

تمھیں جاننا چاہیے کہ جب یہ اصول مقرر ہے کہ الناس علیٰ دین ملوکھم (لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں) پس بادشاہوں اور ان کے عاملوں کو چاہیے کہ وہ احکام شرع کے ادا کرنے میں پوری پوری

(۱) منتخب مکتوبات قدوسیہ مکتوبات سی و یکم در جواب محمد مودود ، ص ۹۲ - ۹۳

احتیاط کریں ، تاکہ ان کو دیکھ کر عوام و خواص بھی شریعت کے پابند ہوں ، اور لوگ شریعت سے آراستہ و پیراستہ ہوں ، اور اس طرح اسلام رونق اختیار کرے اور علماء اور صلحا کی عزت ہو ۔

سکندر لودھی کے نام ایک خط :

مکتوبات قدوسیہ میں ہمیں آپ کا ایک خط سکندر لودہی کے نام ملتا ہے، آپ نے احیاء شریعت و سنت کے لیے اس کی دینی حمیت کو متحرک کرتے ہوئے غم خواری خلق ، ائمہ و علماء کی معاونت ، عدل و انصاف کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھا کہ :

شغل ہمایوں جہانداری اعلیٰ و اشرف اشتغال و اعمال است و جامع اشغال و اعمال بہر طائفہ از اولیا و اتقیا علماء و صلحاء و مبارزان راہ دین و مجاہدان درگاہ یقین عدل است کہ عدل یک ساعت او بہتر و فاضل تر از عبادت شصت سال ۔

پھر اسی خط میں ائمہ و علماء کی اعانت و غم خواری کی طرف توجہ دلاتے ہوئے آپ نے لکھا کہ :

درمیان عالم طائفہ ائمہ و علماء ضعفا است ۔ باید کہ در عہد ہمایوں روزگار در دولت جہانیان جہاندار چناں رونق و عز یابند کہ از ہر عہدے و اقلیمے برفعت شتابند ۔ چناں کہ ہمہ مفسدان و فاجران از خوف تیغ آبدار و از جلال سلطنت جہاندار در ظلمت شب دیجور عدم خزیدہ و ناپدید شدہ اند ، ... پس اگر معاذ اللہ ایشاں تیمارداری و غم خواری ضعفا و صلحاء و مشائخ از مقام مہربانی و کامرانی نکنند، از ایشاں غافل و عاطل شوند دمار از دیار برآید ۔

پھر آپ نے اس حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم انما تنصرون و ترزقون بضعفائکم (تم اپنے ضعفا کی وجہ سے مدد کیے جاتے اور اور رزق دیے جاتے ہو) توجہ دلاتے ہوئے لکھا کہ :

از یں جا مقرر گشت کہ درجۂ عالی مردم بدو کار منوط است ، و دولت دوجہانی و سعادت جاودانی ہم بداں مربوط۔ یکے خدمت خداوند جل و علیٰ بصدق و اخلاص کردن ، دوم خدمت خلق بجہد و طاقت نمودن کہ التعظیم لامر اللہ و الشفقۃ علیٰ خلق اللہ لخصوص طائفہ مومناں لاسیما زمرۂ صلحاء و علماء و اخفض جناحک لمن تبعک من المؤمنین ، چنانکہ در خبر آمدہ است ، "قال النبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم و آلہ الطیبین ، خصلتان لیس فوقھما شئی من الخیر الایمان باللہ و النفع لعباد اللہ" و اجتماع ایں دولت بر کمال در سلطان است کہ نفع و شفقت او بہمہ جہان ابلت - ما احسن الدین و الدنیا اذا اجتمعا بیان آنست ، و ایں بہمت بلند میسر آید ، تاہمہ بداں از ہمہ بلند برآید کہ آں را فتوۃ خوانند - و الید العلیا خیر من ید السفلیٰ - بیت :

ہر کہ صاحب ہمت آمد مرد شد
ہمچو خورشید از بلندی فرد شد

پس ہمت بلند باید ، درم و دینار جاہ و جلال نثار فقرا و صلحاء شاید کہ در خدمت محبت ایشاں ایں سعادت مساعدت نماید - من احب العلم و العلماء لم یکتب خطیئتہ ایام حیاتہ ، و خود ایں جا جلوہ گری ست ، یا داؤد اذا رایت طالباً لی فکن لہ خادماً۔[۱]

---

۱ - یہ مکتوب "مکاتیب قدوسیہ" ص ۲۴۳-۲۴۴ سے ماخوذ ہیں -

لودھی اُمرا کے نام مکاتیب :

طبقات اکبری میں ہے کہ سکندر لودھی کے ترپن اُمراء تھے، ان امرا میں سے جن کے نام آپ کے خطوط ملتے ہیں ان میں ہیبت خان[۱]، سعید خان شروانی[۲]، خواص خان[۳] ابراہیم خان شروانی[۴] اور دلاور خان شامل ہیں ، ان خطوط میں آپ نے ان کے دینی شعور کو بیدار کیا ہے ، اور انھیں احیاءِ شریعت اور اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے -

---

(۱) ہیبت خان : بن عمر خان شروانی ، "ہمایون اول" کے لقب سے ملقب تھا ، سکندر لودھی کی وفات کے بعد ابراہیم لودھی نے اس پر اور اس کے بیٹے عیسیٰ خان پر بہت عنایتیں اور مہربانیاں کیں ، لیکن جب ابراہیم لودھی اور اس کے بھائی جلال خان گوالیار کی طرف بھاگے تو یہ ان کے تعاقب کے لیے مقرر کیا گیا ، لیکن ہیبت خان کی گرفتاری میں ناکام ہو گیا ، سلطان ابراہیم لودھی نے اسے آگرے کے قید خانے میں ڈلوادیا ، اسی قید کی حالت میں اس نے ۹۳۲ھ (۲۶-۱۵۲۵ء) میں وفات پائی -

(۲) سعید خان شروانی : مسند عالی عیسیٰ خان کا داماد تھا ، سکندر لودھی کے عہد میں لاہور کا ناظم مقرر ہوا ، ۹۵۲ھ (۳۶-۱۵۳۵ء) میں کالنجر کی مہم میں شریک تھا (شروانی نامہ ، ص ۳۸-۱۰۱)

(۳) خواص خان : خواص خان کے متعلق صولت شیر شاہی ص ۵۲ کے ذیلی حاشیے میں بحوالۂ فرشتہ ہے کہ خواص خان در شجاعت رستم زمان و در سخاوت حاتم دوران بود ، اہل ہند

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۲۴)

بابر کے نام ایک خط :

۹۳۲ھ (۱۵۲۶ء) جب بابر نے پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی کو شکست دے کر اس برصغیر پاک و ہند میں مغل حکومت کی بنیاد رکھی تو حضرت شیخ نے اس کو نظام اسلامی کے قیام، شریعت اسلامیہ کی ترویج، عدل و انصاف اور حکومت کے نظام کو خلافت راشدہ کے نظام کے سانچے میں ڈھالنے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھا کہ وہ شہروں کو شریعت محمدیہ کے جمال و عدل سے آراستہ کرے، زکواۃ کے علاوہ جو بھی ٹیکس مقرر کیے جائیں وہ شریعت اسلامیہ کے مطابق ہونے چاہییں، ملک کے علماء، ائمہ اور ضعفا کو اتنی عزت دینی چاہیے کہ وہ ہر زمانے میں اور ہر ملک میں عزت و قدر کی نگاہ سے دیکھے جائیں اور وہ اطمینان اور آرام سے زندگی بسر کرسکیں اور ان سے محبت رکھیں، حکومت کے عہدوں پر امین و متدین لوگوں کو متعین کرے، اور وہ خود بھی اسلام کا پابند ہو، اور نماز با جماعت ادا کرے تا کہ دین کمال کو پہنچے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

او را از جملہ اہل اللہ شمارند، و او را خواص خاں ولی می گویند۔ شیرشاہ سوری کے زمانے میں وہ بیحد مقبول تھا، اور شیرشاہ اس کی بے حد عزت کرتا ہے۔ لیکن سلیم شاہ اپنے عہد میں اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور اثر کو دیکھ کر اس سے خوف زدہ ہوا آخر تاج خاں حاکم سنبھل نے سلیم شاہ کے اشارے پر اسے اپنا مہمان بنا کر قتل کردیا، لاش دہلی لائی گئی۔ (حاشیہ شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور ان کی تعلیمات، تالیف اعجاز الحق قدوسی، ص ۳۴۴=۳۴۵)

(۳) ابراہیم خاں شروانی: خان اعظم عمر خاں شروانی کا بڑا لڑکا تھا (شروانی نامہ، ص ۳۶)

حضرت شیخ کا یہ خط بہت طویل ہے ، ہم اس کے ضروری اقتباس ذیل میں درج کرتے ہیں ، جن سے اندازہ ہو سکے گا کہ حضرت شیخ اس برصغیر پاک و ہند میں نظام اسلام کے قیام کے لیے کس درجہ کوشاں تھے ۔

اس خط میں تیمارداری فقرا و ضعفاء ، علما ، صلحاء ، مشائخ و مساکین کی طرف توجہ دلاتے ہوئے بابر کو لکھا کہ :

پس اگر معاذ اللہ ایشاں از تیمار داری و غم خواری فقراء و ضعفاء و علماء و مشائخ و مساکین غفلت و عطلت نمایند دمار از دیار برآید ۔

پھر اسی خط میں آگے چل کر آپ نے عدل و انصاف اور ترویج دین کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھا کہ :

باید و سزد کہ برائے شکرِ نعمتِ منعم سایۂ عدل بر عالمیان چناں کشند کہ ہیچ کس بر ہیچ کس ظلم نکند ۔ و ہمہ خلق و ہمہ سپاہ بہ اوامر و نواہی شرع مستقیم و مستدیم بوند ، نماز بجماعت بگذارند ، و علم و علماء را دوست دارند ، و در بازار ہر شہرے محتسباں بگردند ، تا شہر و بازار بہ جمال عدل شرع محمدی[ص] بیارایند ، و روشن و منور گردانند ۔

چنانکہ در عہد سلف و خلفاء راشدین[رض] با جمیع شرائط بے شبہ بود . ہم چناں در عہد ہمایوں روزگار و سلطانِ جہاں دار بے شبہ ادا شود ، و دین بکمال رسد ۔ و بروئے این عہد جمالِ عہدِ خیرالقرونِ قرنی پدید آید ، و عہدہ دارانِ سرکارِ آن مسلمان پاک در دین ، چالاک ، امینان ۔ متدینان در ولایت تعین گردند ، و تحصیلِ مال

بروجہ شرع کنند ، تا جمال ما احسن الدین و الدنیا اذا اجتمعا بظہور انجامد ، و آں شاہ عالم پناہ دریں حضور پر سرور بود ،

باید و سزد کہ در دیوان اسلام و در دار السلام ہیچ کس را از کفار عہدہ دیوانی وہیچ وجہ نبود ، و در دفاتر قلم نزنند ، و اسیر و عامل نباشند ، چنانکہ در شرع خواری ایشان کہ " وہم صاغرون " است ، ہم برآن نوع ذلیل و خوار باشند ، وسال گزاری کنند ، و جزیہ زکواۃ سال بروجہ شرع از ایشان بگیرند ، و از جامہ پوشش مسلمانان منع سازند ، و کفر خود بستور دارند، و مراسم کفر بر طریق غلبہ و اعلان نکنند ، تا رونق اسلام بعز کمال رسد ۔[1]

ھمایوں کے نام خط :

مغل فرمانرواؤں میں ہمایوں وہ آخری بادشاہ تھا، جس کے نام ہمیں مکتوبات قدوسیہ میں آپ کے دو مکتوب ملتے ہیں ، پہلے مکتوب میں آپ نے اُسے اخلاق حمیدہ سے متصف ہونے پر مبارکباد دی ہے ۔

دوسرے مکتوب میں آپ نے اس کو مخلوق خدا کی خدمت اور عالموں اور صالحوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھا کہ :

الحمد للہ العظیم شانہ کہ ہمت آں عزیزدارین بر احسان جملہ خلائق لا سیما طائفہ علماء و فقراء مصروف ست ، و سعادت کونین و دولت دارین ہم دریں موعود ست تا باد چنیں باد ، ھل من مزید باد ۔[2]

---

۱ ۔ مکتوبات قدوسیہ ، مکتوب صد و شصت و نہم بجانب محمد بابر بادشاہ ص ۲۳۵—۲۳۶ ۔

۲ ۔ ایضاً ۔ مکتوب ۱۷۱ ، ص ۲۳۸ ۔

مغل اُمرا کے نام خطوط :

مغل اُمراء میں ہمیں آپ کے دو خط تردی بیگ[1] کے نام ملتے ہیں ۔ آپ نے اُسے شاہانِ اسلام اور اُن کے اُمرائے سلطنت کے فرائض یاد دلاتے ہوئے لکھا کہ ان کا فرض ہے کہ وہ اپنی مملکت اور حدودِ حکومت میں اسلام کو ترقی دیں ، ظلم و طغیان کا خاتمہ کر کے ملک کو عدل و انصاف سے رونق دیں ، تاکہ ملک کے رہنے والے امن و اطمینان سے زندگی بسر کر سکیں ۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں کہ :

> الشکر للہ کہ امروز آن عزیز محظوظ ست و بادشاہِ اہلِ اسلام و اعوان و ارکان دولتِ سلطنتِ وے مکرسان و محسنان اند ۔ توقع تام است کہ در ایں روزگار رونقِ اسلام و عزتِ علماء و مشائخ برفعت شتابد و ظالمان و مفسدان مخزول و مردود گردند ، و ملک بعدل و انصاف آراستہ گردد ، و بہ آرام و قرار پیراستہ شود ، انشا اللہ تعالیٰ خاتست محمود بالنبی ص وآلہ الامجاد[2]

ہم نے حضرت شیخ کے بعض خطوط کے یہ اقتباسات پیش کیے ہیں ، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مکاتیب قدوسیہ میں آپ کے تمام مکاتیب جو آپ نے اپنے مریدوں ، صاحبزادوں ، عزیزوں اور اس دور

---

۱ ۔ تردی بیگ : ہمایوں کا قدیم نوکر اور خدمت گزار تھا ، گجرات کی فتح کے بعد جانپانیر کی حکومت پر مقرر ہوا ۔ یہ اکبر کے عہد میں ہیمو بقال کی لڑائی کے بعد ۹۶۳ھ (۱۵۵۶ء) میں بیرام خاں کے اشارے پر اُس کے نوکروں کے ہاتھوں قتل کیا گیا ۔ (ماثرالامرا ، ج ، ۱ : ص ۴۶۸-۴۶۹) ۔

۲ ۔ مکتوبات قدوسیہ ۔ مکتوب ۱۳۱ بجانب امیر تردی بیگ ۔ ص ۲۲۴ - ۲۲۵

کے علماء و مشائخ کو لکھے ہیں ، وہ گنجینۂ سعادت ہیں ، جو آپ کی اصلاحی کوششوں اور روحانی تربیت اور آن اعلیٰ مقاصد کو سامنے لاتے ہیں جن کے لیے آپ نے ساری عمر جد و جہد کی تھی۔

حضرت شیخ کی وفات :

۲۳ جمادی الاخر ۹۴۴ھ (۱۵۳۷ء) کو یہ آسمان علم و فضل ، عرفان و تصوف کا آفتاب اسی سال سے کچھ زائد عمر میں اس برّصغیر پاک و ہند کے گوشے گوشے کو منور کر کے غروب ہو گیا۔[1]

لطائف قدوسی میں ہے کہ حضرت شیخ نے اپنی وفات سے تین سال پہلے لوگوں سے ملنا جُلنا چھوڑ دیا تھا ، ہمیشہ عالم محویت اور بے خودی میں رہتے تھے ، کسی سے بات چیت نہیں کرتے تھے ۔ اس عالم کو دیکھ کر آپ کے صاحبزادوں شیخ رکن الدین اور شیخ احمد نے آپ سے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا بابا ! میں نے اپنے قلب کو ذکرِ حق میں بے حد مصروف رکھا ہے ۔ اب میرا تمام وجود دریائے ذکر ہو گیا ہے ، جب بحرِ فنا موجیں مارتا ہے ، اس وقت اس عالم شہادت کو میرے سامنے سے ہٹا کر مجھے دوسرے عالم میں لے جاتے ہیں ، اور میں مشاہدۂ حق کرتا ہوں ، جو مجھے اس عالم میں آنے نہیں دیتا ، جس کی وجہ سے مجھ پر یہ بے خودی اور محویت کا عالم طاری رہتا ہے۔

لیکن اس محویت و بے خودی کے باوجود احکام شریعت پر عمل کرنے میں ذرا بھی فرق نہیں آتا تھا ۔ اور عادت کے مطابق آدابِ وضو اور نماز روزے کا بڑا خیال رکھتے تھے ۔ محویت کی یہ کیفیت تھی کہ ہر نماز کے وقت پر آپ کو اطلاع دی جاتی تھی کہ فلاں نماز کا وقت آگیا ہے ، اور اس نماز کی اتنی رکعتیں ہیں۔

---

۱ - لطائف قدوسی ، ص ۷۰ - لطیفہ - ۸۷ -

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آخر عمر میں آپ بے حد ضعیف ہو گئے تھے ، اور تقریباً بصارت بھی جواب دے گئی تھی ، منتخب مکتوبات قدوسیہ میں ایک خط ہے ، جس میں اپنے مرید اور خلیفہ شیخ عبدالرحمٰن کو اُن کے خط کے جواب میں تاخیر ہونے کی معذرت کرتے ہوئے لکھا کہ :

و آنچہ نبشتہ بودند کہ جواب عریضۂ سابقہ صادر نشد لائح باد ، این فقیر در نبشتن مکتوب معذور دارند کہ گم شدہ و خراب گشتہ است ، چہ نویسد ، و چشم نیز خیرہ شدہ است مع ذالک اگر کسے کاغذ و دوات بیارد این فقیر املا کند ، او بنویسد و ھذاتکلف ۔

(ترجمہ)

اور تم نے جو لکھا ہے کہ پہلے عریضے کا جواب نہیں ملا ، تو واضح ہو کہ اس فقیر کو لکھنے میں معذور سمجھو کہ کمزور اور ضعیف ہو گیا ہے ، کیا لکھے ، اور آنکھیں بھی کمزور ہوچکی ہیں ، اس کے باوجود اگر کوئی کاغذ اور قلم دوات لے آتا ہے ، یہ فقیر لکھواتا جاتا ہے ، اور وہ لکھتا جاتا ہے ، یہ ایک قسم کا تکلف ہے ۔

بیماری اور وفات کی کیفیت :

آپ کے صاحبزادے حضرت شیخ رکن الدین نے آپ کے مرض الموت اور وفات کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھا کہ : ۱۵ جمادی الآخر ۹۴۴ھ (۱۵۳۷ء) پیر کے روز عین اس دن کہ جس روز مخدوم العالم حضرت شیخ احمد عبدالحق؁ کا عرس تھا ، آپ کو جاڑے کے ساتھ بخار آیا ، چار روز تک مسلسل آپ کو جاڑا بخار آتا رہا ، جمعہ کے روز آپ کو کچھ افاقہ ہوا ، کچھ دیر سوئے ،

اور نماز جمعہ ادا فرمائی، نماز جمعہ کے بعد پھر بخار شروع ہوا ۔ پھر اور مزید چار دن آپ کو بخار آیا ، یہاں تک کہ منگل کے روز ۲۳ جمادی الآخر ۹۴۴ھ (۱۵۳۷) کو چاشت کے وقت آپ واصل الی اللہ ہوئے اور اپنے آخری وطن قصبہ گنگوہ ضلع سہارنپور میں مدفون ہوئے ، جہاں آج بھی آپ کا مزار پُر انوار زیارت گاہِ خاص و عام ہے ۔[1]

عمر :

حضرت شیخ کی عمر کے متعلق کہ وفات کے وقت آپ کی عمر کیا تھی ، صحیح طور پر متعین کرنا مشکل ہے ، لیکن یہ امر یقینی ہے کہ آپ کی عمر اسّی سال سے کچھ متجاوز ہوچکی تھی ، منتخب مکاتیب قدوسیہ میں آپ کا ایک خط ہے ۔ جس میں آپ نے اپنی عمر کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے مرید حضرت شیخ عبدالرحمان کو لکھا کہ :

> از فقیر حقیر سوختہ و ہیچ نیوختہ عمر بہ آخر رسیدہ و ہیچ نرسیدہ آہ ہزار آہ این چہ افتاد کہ ہیچ نیفتاد ... عمرقریب ہشتاد (۸۰) شد و راہِ حق ہیچ نہ ایستادہ شد ، الرحیل بانگ میزند ۔[2]

ہمارا خیال ہے کہ اس خط کے بعد مزید دو چار سال آپ حیات رہے ہوں گے ، اگر آپ کی عمر چوراسی سال ہم فرض کرلیں تو آپ کا سنہ ولادت ۸۶۰ھ (۱۴۵۵-۵۶ء) قرار پاتا ہے ، جیسا کہ ہم آپ کی ولادت کے ضمن میں لکھ آئے ہیں ، واللہ اعلم بالصواب ۔

اولاد :

حضرت شیخ کی اولاد کے متعلق ہمیں جو تصریحات تذکروں اور شجروں میں ملتی ہیں ، انھیں ہم درج ذیل کرتے ہیں ۔

---

۱ ۔ لطائف قدوسی ، ص ۱۰۷ ۔ لطیفہ ۸۷

۲ ۔ منتخب مکتوبات قدوسیہ ، مکتوب سی و ہفتم ۔ ص ۱۰۷

آپ کے صاحبزادے حضرت شیخ رکن الدین کی تصنیف لطائف قدوسی حضرت شیخ کے حالات زندگی پر سب سے زیادہ معتبر کتاب ہے۔ لطائف قدوسی کی تصنیف کے سلسلے میں حضرت شیخ رکن الدین نے لکھا کہ: میں نے یہ تحریر اور لطائف حضرت قطبی کی اجازت سے ماہ جمادی الاول ۹۴۴ھ (۱۵۳۷) میں لکھنی شروع کی تھی۔ مگر انھوں نے یہ کتاب حضرت شیخ کی وفات کے بعد ماہ شعبان ۹۴۴ھ (۱۵۳۸ء) میں مکمل کی، لیکن اس کتاب میں جہاں کہیں بھی انھوں نے اپنے بھائیوں کا تذکرہ کیا ہے، ان کے نام یہ ہیں۔

(۱) حضرت شیخ حمید الدین (۲) حضرت شیخ احمد

(۳) حضرت شیخ رکن الدین (۴) حضرت شیخ محمد علی

ان کے علاوہ آن کے اور کسی بھائی کا تذکرہ لطائف قدوسی میں ہمیں نہیں ملتا۔

زبدۃ المقامات :

لیکن ہاشم کشمی نے اپنے مشہور تذکرے زبدۃ المقامات میں بغیر ناموں کی صراحت کے حضرت شیخ کے صاحبزادوں کی تعداد سات بتاتے ہوئے لکھا کہ :

شیخ را ہفت پسر بود کہ ہریک در حال و قال بے مثل بود[۲]۔

صاحب خزینۃ الاصفیاء مفتی غلام سرور لاہوری نے آپ کے ایک اور صاحبزادے عبدالکبیر عرف بالا پیر کا تذکرہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ :

شیخ عبدالکبیر عرف بالا پیر از خلفائے ارجمند و فرزند سعادت پیوند شیخ عبدالقدوس گنگوہی است در شجاعت

---

۱ - لطائف قدوسی، ص ۱۷

۲ - زبدۃ المقامات، مطبوعہ نول کشور، ص ۹۹

و سخاوت و خوارق و کرامات و وجد و ذوق و سماع و شوق بوقتِ خود ثانی نداشت ۔[1]

شجرۂ خاندان قدوسیہ :

لیکن خاندانِ قدوسیہ کے شجرے میں جو اس خاندان کے افراد کے پاس موجود ہے ، اس میں آپ کے دس صاحبزادوں کے نام یہ ہیں :

(۱) حضرت شیخ حمید الدین	(۲) حضرت شیخ احمد
(۳) حضرت شیخ رکن الدین	(۴) حضرت شیخ محمد علی
(۵) حضرت شیخ عبدالسلام	(۶) شیخ محمد محدث
(۷) قطب الدین	(۸) ابو سعید
(۹) محی الدین	(۱۰) نظام الدین ۔[2]

اسی شجرے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان صاحبزادوں میں سے شیخ حمید ، شیخ رکن الدین ، شیخ محمد علی ، شیخ عبدالسلام اور شیخ محمد محدّث سے اولاد کا سلسلہ چلا ، شیخ عبدالحمید ، شیخ محمد علی ، شیخ عبدالسلام اور شیخ محمد کی اولاد آج بھی قصبہ گنگوہ (بھارت) اور پاکستان کے مختلف خطوں میں آباد ہے ۔ قطب الدین ابو سعید ، محی الدین اور نظام الدین نے بچپن ہی میں وفات پائی ۔

خلفاء :

تذکرہ نگاروں نے حضرت شیخ کے خلفاء کی تعداد ایک ہزار لکھی ہے ۔ لیکن مختلف تذکروں میں ہمیں آپ کے خلفا کے جو نام ملتے ہیں وہ یہ ہیں ۔

---

۱ ۔ خزینۃ الاصفیاء ، ج ، ۱ : ص ۴۱۸

۲ ۔ شجرۂ خاندان قدوسیہ ، غیر مطبوعہ مرتبہ شاہ منظور احمد قدوسی۔

(۱) شیخ حمید صاحبزادہ حضرت شیخ (۲) شیخ رکن الدین صاحبزادہ حضرت شیخ (۳) شیخ احمد صاحبزادہ حضرت شیخ (۴) شیخ علی صاحبزادہ حضرت شیخ (۵) حضرت جلال تھانیسری (۶) شیخ عبدالغفور اعظم پوری (۷) شیخ بھورہ (۸) شیخ عمر دینی (۹) شیخ خضر عرف شیخ بڈھن جون پوری (۱۰) شیخ بہاؤ الدین ولد شیخ بہشتی نبیرہ حضرت شیخ جمال ہانسوی ، (۱۱) صوفی شیخ جعفر خادم خاص حضرت شیخ (۱۲) دتو شروانی (۱۳) بھولا ملقب باف سہارنپوری (۱۴) ملک مبارک خضر آبادی (۱۵) ملک عثمان کرانی گنگوہی (۱۶) شیخ حسام الدین معروف بہ شیخ اوجھر (۱۷) میاں نصراللہ دیپال پوری (۱۸) سید احمد ملتانی (۱۹) شیخ عبدالرحمٰن شاہ آبادی (۲۰) شیخ احمد سٹھن (۲۱) شیخ عزیز اللہ دانشمند (۲۲) شیخ عبدالستار ۔[1]

حضرت شیخ کے ان خلفاء نے برصغیر پاک و ہند میں سلسلہ چشتیہ صابریہ کو غیر معمولی فروغ بخشا ۔ ممتاز صوفیائے کرام تمام اکابر علمائے دیوبند حضرت شیخ کے ہی سلسلے میں منسلک نظر آتے ہیں ۔

اس سلسلے میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکی وہ بزرگ ہیں ، جنھوں نے سلسلہ صابریہ کی برکات کو نہ صرف اس برصغیر پاک و ہند میں بلکہ دوسرے ممالک اسلامیہ میں بھی پہنچایا ۔ اور آخر میں (ان ہی) کی بدولت ہر مکتب خیال کے اکابر علماء اس سلسلے میں منسلک ہوئے ۔[2]

---

۱ ۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور ان کی تعلیمات ص ۴۹۳

۲ ۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی : بن حافظ محمد امین اپنے ننہالی قصبے نانوتہ میں ۲۲ صفر ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۷ء) کو اور بقول حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن ۱۲۳۱ھ (۱۶–۱۸۱۵ء) کو قصبہ تھانہ بھون میں پیدا ہوئے ، جو آپ کا آبائی وطن تھا ، (بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۳۴ پر)

حضرت شیخ کی تصانیف :

حضرت شیخ نے اسّی سال سے کچھ زائد عمر پائی ، اُن کی عمر کا طویل حصہ ریاضتوں ، مجاہدوں اور مریدوں اور عوام کی اصلاح و تربیت میں گزرا ، لیکن اس غیر معمولی علم و فضل کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

آپ نسباً تھانہ بھون کے مشائخ فاروقی سے تعلق رکھتے ہیں ، پہلے آپ نے کلام مجید حفظ کیا ، فارسی کے علوم مروجہ کے بعد عربی کی تعلیم کی طرف توجہ کی ، لیکن عربی زیادہ نہیں پڑھی ، حضرت سید احمد شہید کی شہادت کے بعد آپ نے مولوی نصیر الدین دہلوی کے ہاتھ پر بیعت کی ، پھر میاں جی نور محمد جھنجانوی سے بیعت ہوئے ، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں تھانہ بھون اور اس کے نواح کے مسلمانوں نے امیر جہاد حاجی صاحب کو مقرر کیا تھا ، مولانا محمد قاسم نانوتوی ، مولانا رشید احمد گنگوہی ، قاضی عنایت تھانوی اور مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی اور حافظ ضامن صاحب تھانوی اس معرکۂ جہاد میں شریک تھے ۔ ان تمام بزرگوں نے انگریزوں سے سخت اور مردانہ وار مقابلہ کیا ، لیکن بدقسمتی سے اس جنگ میں فیصلہ انگریزوں کے حق میں ہوا ، اس کے بعد حضرت حاجی صاحب ۱۲۷۶ھ (۱۸۵۹ء) میں مکۂ معظمہ ہجرت کر گئے ۔ مکۂ معظمہ میں پہلے رباط اسمٰعیل میں قیام فرمایا ، پھر ایک عقیدت مند نے حارۃ الشاب میں ایک مکان خرید کر آپ کی نذر کر دیا ، اور آپ اس میں منتقل ہو گئے ۔ مکۂ معظمہ ہی میں حضرت حاجی صاحب ۸۴ سال تین ماہ بیس یوم کی عمر میں مرض اسہال میں مبتلا ہو کر ۱۳ جمادی الآخر ۱۳۱۷ھ (۱۸۹۹ء) کو وفات پائی (تذکرہ علمائے ہند ، ص ۱۲۳ ۔ تذکرہ مشائخ دیو بند ، (مفتی عزیز الرحمٰن) حالات حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی)

بنا پر جس سے حق تعالیٰ نے آپ کو نوازا تھا ، آپ نے تصنیف و تالیف کی طرف بھی توجہ فرمائی ۔

آپ کے صاحبزادے حضرت شیخ رکن الدین نے آپ کے تبحر علمی اور ذوق تصنیف و تالیف کو بیان کرتے ہوئے لکھا کہ :

اما بعلم لدنی و فیض الٰہی چندان استعداد بود کہ در ہر علمے بحثہا غریب کردند ، و تصانیف بسیار کردند ، و می فرمودند کہ در ابتداء حال نسخۂ عوارف بجہت برکت در حجرۂ ما می بود ، در آں نسخہ چنداں دخل نبود ، عاقبت الامر کار تا بحدے رسید کہ نسخۂ عوارف را شرح عربی کردند ، و نکات و اسرار غریب نبشتند[1]

لطائف قدوسی سے ہمیں آپ کی جن تصانیف کا پتا چلتا ہے ہم ان کے نام ذیل میں درج کرتے ہیں :

(۱) بحر الانشعاب : (۲) شرح مصباح (۳) شرح عوارف (۴) فوائد القرات (۵) شرح صحائف (۶) رسالہ قدسی (۷) رشد نامہ (۸) نور المعانی (۹) انوار العیون (۱۰) حاشیہ فصوص الحکم (۱۱) مظہر العجائب (۱۲) مجموعہ کلام فارسی (۱۳) رسالہ نور الہدیٰ (۱۴) رسالہ قرۃ العین (۱۵) مکتوبات قدوسیہ (۱۶) منتخب مکتوبات قدوسیہ (۱۷) اوراد شیخ عبدالقدوس ۔

ہم نے ان تمام تصانیف پر تفصیلی تبصرہ اپنی تالیف ”شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور ان کی تعلیمات“ میں کیا ہے ۔

حضرت شیخ کا اپنی کتابوں کے متعلق تاثر :

حضرت شیخ نے اپنی تصانیف کے متعلق ایک خط میں اظہار خیال کرتے ہوئے اپنے مرید و خلیفۂ خاص حضرت جلال تھانیسری

کو ایک خط میں لکھا کہ :

باید کہ شرح لمعات در پیش دارند ، تا ہزاران و ہزاران شوق و ذوق در کار دارند ، ہرچند مختصر است ، شرح است قدسی ، نوریست علوی و کتابہائے دیگر کہ ایں فقیر از سر سوختگی و دوختگی در تحریر آوردہ است ہرچند ابتر است ، دفتراست ، رموز دیوانگان و رندان ، دیوانگان و رندان دانند ، و زبان مرغان مرغان دانند ۔[۱]

حضرت شیخ کی شاعری :

حضرت شیخ شعر و سخن کا بھی ذوق رکھتے تھے ۔ فارسی اور ہندی شاعری میں آپ کا مقام بلند تھا ، ہم آپ کی تصانیف کے ضمن میں آپ کے فارسی مجموعہ کلام کا ذکر کرچکے ہیں ۔ اگرچہ آپ کا فارسی کلام کا مجموعہ اس زمانے کی لڑائیوں اور ہنگاموں میں ضائع ہوگیا لیکن آپ کے جو فارسی اشعار ہمیں آپ کی تصانیف اور مکاتیب میں ملتے ہیں ، یا ہماری خاندانی بیاضوں میں موجود ہیں ہم انہیں یہاں درج کرتے ہیں ۔ فارسی میں آپ قدوسی اور احمدی دو تخلص اختیار کرتے تھے ۔ آپ کی فارسی غزلوں سے آج بھی سماع کی محفلیں رونق پاتی ہیں ، وحدۃ الوجود آپ کی شاعری کا موضوع خاص ہے ۔

نمونہ کلام فارسی :

آستیں بر رخ کشیدہ ہمچو مکار آمدی

با خودی خود در تماشا سوئے بازار آمدی

در بہاراں گل شدی در صحن گلزار آمدی

بعد ازاں بلبل شدی با گریہ زار آمدی

---

۱ ۔ منتخب مکتوبات قدوسیہ ، مکتوب بست و دوم ، ص ۴۷ ۔

خویشتن را جلوه کردی اندریں آئینہا
آئینہ ابہش نہادی خود باظہار آمدی
شور منصور از کجا و دار منصور از کجا
خود زدی بانگ انا الحق بر سر دار آمدی
گفت "قدوسے فقیرے" در فناؤ در بقا
خود بخود آزاد بودی ، خود گرفتار آمدی

اس غزل کے مقطے پر اجمیر شریف کی ایک محفل سماع میں صوفی محمد حسین الہ آبادی نے حالت وجد میں وفات پائی ۔

گاہ مجنوں گشتہ دور از ننگ و ناموس آمدی
صورت لیلیٰ شدی با خویش محبوس آمدی
خوش صنم در بت کدہ پیش برہمن گشتہ ائی
با طواف حاجیاں در کعبہ ملبوس آمدی
گاہ در خلوت سرا شد با حجاب دلبری
گہہ شدی بیمار عشق از نبض محسوس آمدی
گفتہ ای اوّل انا الحق باز عبدالحق شدی
خود شدی قدوس باز آں عبد قدوس آمدی

من نمی گویم انا الحق یار می گوید بگو
من نمی گویم مرا دلدار می گوید بگو
من نہ از خود می سرایم ایں ندا در کوئے یار
آستین و جبّہ و دستار می گوید بگو
ہست یکا یک ذرہ شاہد از ندائے نغمہ ام
آب گوید ، خاک گوید ، نار می گوید بگو

آنچہ نتواں گفت اندر صومعہ با زاہداں
بے تحاشا بر سر بازار می گویند بگو

حضرت شیخ کی اور غزلوں کے جستہ جستہ چند شعر ذیل میں پیش ہیں ، جن کو شعریت ، معنویت اثر آفرینی اور سوز و گداز کا بہترین مرقع کہا جا سکتا ہے :

اللہ ترا باش و کرم ہیچ مبادا
دیگر چہ بود زیں دگرم ہیچ مبادا
گر یک نظر دوست بما ہست چو شاہم
دیگر چہ بود زیں دگرم ہیچ مبادا

گرچہ تو چوں ابر زر باریدہ ای بر بحر و بر
لیک بخت بے نصیب ما نگشتہ بحر و بر
تا چو از من رفتہ ای من در فراق افتادہ ام
دائما حیران و سوزاں میخورم خون جگر

---

۱ - حضرت شیخ کی یہ تینوں غزلیں حال ہی میں مجھے حکیم شاہ قریش احمد قدوسی موجودہ سجادہ نشین درگاہ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ نے ہندوستان سے بھجوائی ہیں ، اول اور تیسری غزل کے متعلق موصوف نے لکھا ہے کہ کہ آپ کی یہ دونوں غزلیں عام ہیں اور آج بھی سماع کی محفلوں میں گائی جاتی ہیں ، دوسری غزل کے متعلق انہوں نے تحریر فرمایا کہ یہ غزل آن کے اجداد میں شاہ عماد الدین سجادہ نشین حضرت شیخ کی بیاض سے نقل کی گئی ہے -

ظلمتِ شب کہ بگیرد جہاں
ز آں سر زلف است کہ جانم گرفت
جز تو رخ حور نشاید مرا
شوقِ رخت چونکہ بجانم گرفت

ہندی شاعری :

ہندی شاعری میں حضرت شیخ ''الکھ داس'' تخلص کرتے تھے، آپ اردو زبان کے ابتدائی مصنفین میں ہیں، آپ کا شمار اُن صوفیاء کرام میں ہوتا ہے، جنھوں نے اردو کی ابتدائی نشو و نما میں حصہ لیا ہے آپ کی ہندی شاعری میں بعض ایسے اردو کے الفاظ کے ملتے ہیں جو آج بھی ہماری زبان میں رائج ہیں - مولانا محمود خان شیرانی نے اپنی مشہور کتاب پنجاب میں اردو میں آپ کے دوہے، شبد وغیرہ درج کیے ہیں -[1]

حضرت شیخ کے کلام میں ایک شعر ریختہ کے نام سے بھی ملتا ہے-

صدق رہبر، صبر توشہ، دشت منزل، دل رفیق
ست نگری، دہرم راجا، جوگ سار[2]

یعنی سچائی رہنما ہے، صبر توشہ سفر ہے، لا مکان منزل ہے، دل رفیق سفر ہے، حقیقت شہر ہے، مذہب اس کا راجا ہے، اور راستہ اس کا جوگ (اخلاص و بندگی) ہے -

---

۱ - پنجاب میں اردو، ص ۲۱۴-۲۱۶ -

۲ - اردو کے نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ - از مولوی عبدالحق، ص ۳۴-۳۵ -

۲۶

حضرت مجدد الف ثانیؒ

علامہ اقبال کی عقیدت

علامہ اقبال کو حضرت مجدد الف ثانی سے جو عقیدت و محبت تھی، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ علامہ اقبال کے صاحبزادے ڈاکٹر جاوید اقبال جب پیدا ہوئے تو علامہ اقبال نے نذر مانی تھی کہ جاوید جب بڑے ہو جائیں گے تو ان کو حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مزار پر لے کر جائیں گے، چنانچہ ۲۹ جون ۱۹۳۴ء کو وہ اپنے صاحبزادے ڈاکٹر جاوید اقبال کو سرہند لے کر گئے اور بارگاہ حضرت مجدد الف ثانی میں حاضری دے کر ۳۰ جون ۱۹۳۴ء کو لاہور واپس ہوئے، مزار مبارک کی زیارت سے علامہ کے قلب پر جو اثر ہوا، اس کے متعلق وہ اپنا تاثر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> مزار نے میرے دل پر بہت اثر کیا، بڑا پاکیزہ مقام ہے پانی اس کا سرد و شیریں ہے، سرہند کے کھنڈر دیکھ کر، مجھے مصر کا قدیم شہر فسطاط یاد آگیا، جس کی بنا حضرت عمر بن العاصؓ نے رکھی تھی، اگر کھدائی ہو تو معلوم نہیں اس زمانے کی تہذیب و تمدن کے متعلق کیا کیا انکشافات ہوں، یہ شہر فرخ سیر[1]

۱۔ فرخ سیر: بن عظیم الشان بن عالم بہادر شاہ بن اورنگ زیب۔ عہد حکومت فرخ سیر (۱۱۲۴ھ - ۱۱۳۱ھ) (فٹ نوٹس مقالات الشعرا، ص ۲۰۸)

کے زمانے تک بحال تھا ، اور موجودہ لاہور سے وسعت و آبادی میں دُگنا ۔[1]

وہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی بارگاہ میں اُن کے فیوض و برکات کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں :

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی[2]

بالِ جبریل میں پنجاب کے پیرزادوں سے خطاب کرتے ہوئے حضرت مجدد الف ثانیؒ کی شان میں نغمہ سرا ہیں :

حاضر ہوا میں شیخ مجدد کی لحد پر
وہ خاک کہ ہے زیرِ فلک مطلعِ انوار
اس خاک کے ذرّوں سے ہیں شرمندہ ستارے
اس خاک میں پوشیدہ ہے ، وہ صاحبِ اسرار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیِ احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان
اللہ نے بر وقت کیا جس کو خبردار
کی عرض یہ میں نے کہ عطا فقر ہو مجھ کو
آنکھیں مری بینا ہیں ، و لیکن نہیں بیدار
آئی یہ صدا سلسلۂ فقر ہوا بند
ہیں اہلِ نظر کشورِ پنجاب سے بیزار

---

۱ ۔ ذکر اقبال ، ص ۱۹۱ ۔

۲ ۔ بالِ جبرئیل ، ص ۳۰۴ (کلیات اقبال اردو)

عارف کا ٹھکانا نہیں وہ خطہؑ کہ جس میں
پیدا کلہؑ فقر سے ہو طرہؑ دستار
باقی کلہؑ سے تھا ولولہؑ حق
طروں نے چڑھایا نشہؑ خدمت سرکار[1]

علامہؑ اقبال علیہ الرحمہ حضرت مجدد الف ثانی کے اس درجہ معرف و معترف تھے کہ علامہ نے ۲۸ جون ۱۹۱۶ء کو علم ظاہر و علم باطن پر ایک مضمون جس میں انھوں نے لکھا کہ :

حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمہ اپنے مکتوبات میں کئی جگہ ارشاد فرماتے ہیں کہ تصوف شعار حقہ اسلامیہ ہیں خلوص پیدا کرنے کا نام ہے ، اگر تصوف کی یہ تعریف کی جائے تو کسی مسلمان کو اس پر اعتراض کی جرات نہیں ہو سکتی ۔ راقم الحروف اس تصوف کو جس کا نصب العین شعائر اسلام میں مخلصانہ استقامت پیدا کرنا ہو عین اسلام جانتا ہے[2]

حالات :

علامہ حضرت مجدد الف ثانی سے اس قدر متاثر ہیں کہ وہ آن کے نظریہؑ ہمہ از اوست کے قائل ہیں ، آن کے نظریہؑ خودی کا ماخذ حضرت مجدد الف ثانی کا نظریہ ہمہ از اوست ہے ، حضرت مجدد سالک کی آخری منزل مقام عبدیت کو قرار دیتے ہیں ، جہاں سالک کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک بندہؑ محض ہے ، بندہ بندہ ہے اور خدا خدا ہے ۔

---

۱ ۔ بال جبرئیل ، ص
۲ ۔ انوار اقبال ، مطبوعہ اقبال اکادمی ، ۲۶۸
۳ ۔ اسلامی تصوف اور اقبال ، ص ۲۱۱ ـ ۲۱۲ بحوالہؑ ذکر اقبال ، ص ۱۹۱

حضرت مجدد الف ثانی کا اسم گرامی احمد ، لقب بدر الدین، کنیت ابوالبرکات ہے ، حضرت مجدد کے والد کا نام شیخ عبدالاحد ہے ، حضرت مجدد الف ثانی کی ولادت ۱۴ شوال روز جمعہ بوقت نصف شب ۹۷۱ھ (۱۵۶۴ء) میں ہوئی ، آپ کا سلسلہ نسب حضرت عمر بن الخطاب رض سے جا ملتا ہے ۔

سلسلۂ نسب :

حضرت مجدد الف ثانی کا سلسلہ نسب حضرات القدس میں اس طرح منقول ہے ۔

> حضرت احمد مجدد الف ثانی ، بن شیخ عبدالاحد ، بن شیخ زین العابدین ، بن شیخ عبدالحی ، بن شیخ محمد بن شیخ حبیب اللہ ، بن امام رفیع الدین ، بن خواجہ نور بن خواجہ نصر ، بن خواجہ سلیمان ، بن خواجہ یوسف ، بن سلطان شہاب الدین علی معروف بخواجہ مسعود ، بن خواجہ عبداللہ ، بن خواجہ واعظ اصغر ، بن خواجہ واعظ اکبر ، بن خواجہ ابوالفتح بن خواجہ اسحاق ، بن خواجہ ابراہیم ، بن ناصر ، بن عبداللہ ، امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ۔[1]

قرآن مجید کی تعلیم کے بعد حضرت مجدد الف ثانی سے اپنے والد سے تعلیم حاصل کرتے رہے ، اس کے بعد سیالکوٹ میں بعض کتابوں کی تعلیم مولانا کمال کشمیری اور علم حدیث مولانا محمد یعقوب کشمیری سے حاصل کیا ، پھر مولانا عبدالرحمٰن کی خدمت میں حدیث مسلسل بواسطۂ واحد اور دیگر مفردات کی اجازت

---

۱ ۔ حضرات القدس ، مطبوعہ محکمہ اوقاف پنجاب ، ص ۲۸

حاصل کی ، سترہ سال کی عمر میں علوم ظاہری سے فراغت حاصل کر کے درس و تدریس میں مشغول ہوگئے ، اسی زمانے میں آپ آگرے تشریف لے گئے ، وہاں اکابر علماء سے آپ کو ملنے کا اتفاق ہوا ، یہیں آپ کی فیضی اور ابوالفضل سے ملاقات ہوئی ۔ کچھ دنوں آگرے میں قیام کیا ، پھر آپ کے والد آپ کو آگرے سے لے آئے ، واپسی میں جب تھانیسر پہنچے تو وہاں کے ایک رئیس شیخ سلطان کی صاحبزادی سے آپ کا نکاح ہوا ۔

حضرات القدس میں ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی کی علمی بلندیوں کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ابوالفیض فیضی جب قرآن مجید کی تفسیر بے نقط لکھ رہا تھا ، اور ہندوستان کے مشہور علماء مولانا جمال الدین تلوی وغیرہ اس کی امداد و اعانت کے لیے ہر وقت اس کی مجلس میں موجود رہتے ، اچانک ایسا مشکل مقام آ گیا کہ اس توضیح و تشریح سے سب عاجز رہے تب فیضی نے حضرت مجدد الف ثانی کو لکھا کہ یہ وہ مقام ہے کہ جس کی تشریح سے علماء قاصر رہے ہیں ، اگر آپ اس کے مطالب و مفاہیم کو لکھیں تو میں شکر گزار ہوں گا ، حضرت مجدد صاحب نے قلم برداشتہ اس کے مفاہیم و مطالب کو بے نقط عبارت میں لکھا ، جسے پڑھ کر فیضی اور اس کی مجلس کے علماء حیران رہ گئے ۔[1]

بیعت و خلافت :

حضرت مجدد الف ثانی نے اپنے والد سے بیعت ہو کر سلسلۂ چشتیہ

---

۱ ۔ حضرات القدس ، مطبوعہ محکمۂ اوقاف پنجاب ، ص ۳۲ ۔ ۳۳

اور قادریہ میں خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ چناں چہ آپ نے خود رسالہ مبداء و معاد میں تحریر فرمایا کہ :-

این فقیررا نسبت فردیت از پدر بزرگوار خود حاصل شدہ، و پدر بزرگوار را از عزیزے کہ جذب قوی داشتند و بخوارق مشہور بودند بدست آمدہ۔ . . . این درویش را توفیقِ عباداتِ نافلہ خصوصاً ادائے صلٰوۃ نافلہ از پدر وے است و پدر بزرگوار را این سعادت ازشیخ خود کہ در سلسلہ٘ چشتیہ بودند، حاصل شدہ بود۔

(ترجمہ)

اس فقیر کو نسبت فردیت اپنے والد بزرگوار سے حاصل ہوئی اور والد بزرگوار کو ایک عزیز (شیخ کمال کیتھلی) سے جو جذب قوی رکھتے تھے اور خوارق میں مشہور تھے حاصل ہوئی۔ اس فقیر کو عبادات نافلہ خصوصاً صلٰوۃ نافلہ کی توفیق اپنے والد سے حاصل ہوئی اور انھوں نے یہ سعادت اپنے شیخ (شیخ رکن الدین) سے حاصل کی جو سلسلہ چشتیہ میں تھے۔

سلسلہ٘ چشتیہ :

حضرات القدس میں آپ کا سلسلہ٘ چشتیہ اور قادریہ اس طرح مندرج ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی مرید شیخ عبدالاحد (والد خود) مرید شیخ رکن الدین، مرید شیخ عبدالقدوس گنگوہی، مرید شیخ محمد، مرید شیخ محمد عارف، مرید شیخ احمد عبدالحق،

مرید شیخ جلال پانی پتی ، مرید شیخ شمس الدین ترک پانی پتی ، مرید شیخ علاء الدین احمد صابری کلیری ، مرید شیخ بابا فرید گنج شکر ، مرید خواجہ قطب الدین بختیار کاکی ، مرید خواجہ معین الدین سجزی اجمیری

سلسلۂ قادریہ :

حضرت مجدد الف ثانی ، مرید (والد خود) ، مرید شیخ رکن الدین ، مرید سید ابراہیم معین ایرجی ، مرید شیخ بہاء الدین انصاری حسینی قادری ، مرید شیخ احمد چلپی قادری ، مرید سید موسیٰ قادری ، مرید سید عبدالقادر ، مرید سید حسن ، مرید سید محی الدین ابوالنصر ، مرید سید ابو صالح ، مرید سید عبدالرزاق ، مرید والد خود ، غوث الثقلین شیخ عبدالقادر جیلانی[7]۔

عزم حج اور بیعت :

جب آپ کے والد ماجد نے ۱۰۰۷ھ (۹۶ - ۱۶۹۵ء) میں وفات پائی ، تو آپ حج کے ارادے سے اپنے وطن سے روانہ ہوئے ، دہلی پہنچے تو آپ کی ملاقات بعض قدیم دوستوں سے ہوئی ، آپ کے ایک دوست شیخ حسن کشمیری نے حضرت خواجہ باقی باللہ کی تعریف کی ، حضرت مجدد صاحب خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے ، حضرت باقی باللہ نے آپ کا ارادۂ حج معلوم کر کے فرمایا کہ اگر ایک آدھ ہفتہ دہلی میں قیام کرو تو کچھ حرج نہیں ، چنانچہ آپ راضی ہوگئے ، تین چار روز کے بعد سلسلۂ نقشبندیہ میں حضرت خواجہ باقی باللہ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی دو ماہ اور

کچھ دن میں آپ نے سلسلۂ نقشبندیہ میں خرقۂ خلافت حاصل کیا، اور آپ کے مرشد نے آپ کو وطن رخصت کیا ۔

شجرۂ نقشبندیہ:[1]

حضرات القدس میں آپ کا شجرۂ نقشبندیہ اس طرح منقول ہے :

رسید فیض بہ صدیق[رض] احمد مختار
از و رسید بہ سلمان[رض] مخزن اسرار
از و بہ قاسم[رض] و جعفر[رض] ابو یزید از و
بہ خرقانی و ز و بوعلی سر ابرار
از و ست یوسف و ز و عجدوانی عارف
ز فغنوی ست بہ راستینی بزرگوار
از و ست حضرت بابا بس ست امیر کلال
بہائے ملت و دیں نقشبند فخر کبار
عقیب ایں ہمہ یعقوب چرخی است دگر
از و بہ خواجہ عبیداللہ واقف اسرار
از و ست زاہد و درویش خواجہ امکنگی[رح]
از و بہ خواجۂ باقی ست معدن انوار
از و امام زماں قطب وقت شیخ احمد[رح]
کہ ہست بانی ایں راہ منبع اسرار[1]

خواجہ باقی باللہ کی بشارت :

اسی زمانے میں جب کہ حضرت مجدد الف ثانی دہلی میں ٹھہرے ہوئے تھے ، حضرت خواجہ باقی باللہ نے اپنے ایک مخلص کو ایک

---

۱ ۔ حضرات القدس ، ص ۳۳ ۔

خط میں لکھا کہ: ''سرہند کے ایک شخص شیخ احمد نامی نے جو کثیر العلم اور قوی العمل ہے، فقیر کے ساتھ کچھ نشت و برخاست رکھی ہے، اس کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسا چراغ ہوگا کہ اس سے دنیا روشن ہو جائے گی الحمد للہ کہ اس کے احوالِ کاملہ نے مجھے اس کا یقین دلایا ہے''[1]۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا، آپ کا آستانہ صاحبان کمال اور اہلِ حال کا مرکز بن گیا، آپ کا سلسلہ پاک و ہند سے ماوراء النہر، روم و شام اور مغرب تک جا پہنچا۔

کچھ عرصے وطن میں رشد و ہدایت کے بعد حضرت مجدد الف ثانی دوبارہ اپنے پیر کی خدمت میں دہلی حاضر ہوئے۔ اس مرتبہ حضرت خواجہ باقی باللہ نے آپ کو اجازت ارشاد عنایت فرمائی۔ وطن آنے کے بعد پھر آپ رشد و ہدایت میں مصروف ہوگئے کہ اچانک حضرت خواجہ باقی باللہ کے ارشاد پر آپ کو لاہور جانا پڑا، وہیں آپ کو حضرت خواجہ باقی باللہ کی وفات کی خبر ملی، اس خبر کے سنتے ہی آپ دہلی حاضر ہوئے، اور اپنے پیر کے مزار پر فاتحہ پڑھی اور سرہند واپس تشریف لائے[2]۔

دینِ الٰہی کی گمراہیاں:

اکبر کے دینِ الٰہی نے جو گمراہیاں پیدا کی تھیں، وہ جہانگیر کے دور میں بھی بعض اپنی اصلی صورت میں اور بعض دوسرے رنگ

۱۔ زبدۃ المقامات۔ مطبوعہ نول کشور، ص ۱۴۵ - ۱۴۴ و حضرات القدس، ص ۴۴۔

۲۔ حضرات القدس، ۳۰ - ۳۱۔

میں ظہور پزیر رہیں ۔ حضرت مجدد الف ثانی نے اپنے زمانے میں تجدد اور احیائے دین کی جو خدمات انجام دیں وہ ان دونوں عہدوں کی پیدا کردہ گمراہیوں کے خلاف تھیں ۔

اکبر کے عہد میں دین الٰہی کی صورت میں جو گمراہیاں رونما ہوئیں ، وہ علی الاعلان اسلام کے خلاف تھیں ، اس نے حکم دیا تھا کہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی جگہ ، لا الہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ پڑھا جائے ، اس کے زمانے میں مذہب کا مدار روایت پر نہیں بلکہ محض عقل پر رکھا گیا تھا ۔

علماء سوء نے بادشاہ کی خوشامد میں اس دین کو تقویت پہنچانے میں طرح طرح کی تاویلیں کیں اور حدیثیں گھڑیں ، شیخ تاج الدین جو تاج العارفین کہلاتے تھے ، انھوں نے آیات قرآنی اور احادیث نبوی میں ایسی تاویلیں کیں کہ بادشاہ اکبر خود بھی حیران رہ گیا ، اس نے بادشاہ کے لیے سجدہ تجویز کیا غازی خاں بدخشی نے بھی اس سجدے کی تائید کی اور اسے سجدۂ تعظیمی کا نام دیا ۔ شیخ امان پانی پتی کے بھتیجے ملا ابو سعید نے داڑھیاں منڈوانے کے متعلق ایک حدیث نکالی ۔

ملا عبدالقادر بدایونی نے لکھا کہ اکبر نے اپنی ہندو رعایا کو خوش کرنے کے لیے اپنا رخ اسلام سے پھیر لیا تھا ، بادشاہ قران کا منکر ہو گیا تھا ، شراب حلال کی گئی تھی ، جزیہ موقوف کردیا گیا تھا ، عربی کے مطالعے کو بنظر تحقیر دیکھا جانے لگا ، ہر کوچہ و بازار میں ہندوؤں کی رسمیں منائی جاتی تھیں ، اس نے حکم دیا تھا کہ گائے ، بھینس اور اونٹ کو ذبح نہ کیا جائے ، بارہ سال

سے کم بچے کی ختنہ نہ ہو، اس کے علاوہ اکبر نے آفتاب کی تعظیم
مریدوں کی معاشرت، خوراک اور تدفین کے لیے جو طریقے اختیار کیے
تھے اس سے مسلمانوں کا دل اکبر سے کھٹا ہو گیا تھا۔

لیکن اس دور میں بھی کچھ علمائے حق موجود تھے، جنھوں
نے اس دور ضلالت و گمراہی میں اکبر کے خلاف آواز اٹھائی،
چناں چہ جون پور کے شیعہ قاضی القضات ملا محمد یزدی نے علی الاعلان
فتوی دیا کہ بادشاہ بد مذہب ہو گیا ہے، اس سے جہاد واجب ہے،
اسی طرح بنگال کے قاضی القضات معز الملک نے بھی فتوی دیا،
اکبر نے ان دونوں علماء کو کسی بہانے سے بلا بھیجا، جب یہ
دونوں آگرے سے دس کوس پر فیروز آباد پہنچے تو دونوں کو الگ
الگ کر کے قلعہ گوالیار میں قید کر دیا، پھر حکم دیا کہ ان
دونوں کو کشتی میں بیٹھا کر غرق کر دیا جائے، چناں چہ دونوں
کو غرق کر دیا گیا، قاضی القضاۃ قاضی یعقوب سانکپوری کو
جنھوں نے متعہ کے خلاف فتوی دیا تھا، موت کے گھاٹ اتار دیا
گیا۔ دربار کے بعض امرا قطب الدین خاں کوکہ، اور شہباز کنبوہ
نے جب بادشاہ کو سمجھانے کی کوشش کی تو ڈانٹ ڈپٹ کر
ان کی آواز بند کر دی، جہانگیر اگرچہ اکبری عہد کی بد عنوانیوں
سے نالاں تھا، لیکن اس عہد کی بعض گمراہیوں کو اس نے خود
بھی جائز رکھا تھا، مثلاً سجدۂ تعظیمی وغیرہ، اکبر کے بعد
دین الٰہی کی تیزی اگرچہ ختم ہو چکی تھی، لیکن اس کے اثرات
برابر باقی تھے، جہانگیر کے عہد میں بعض گمراہیاں دوسرے
رنگ میں ظاہر ہوئی تھیں، اور بعض بدعتیں جاری تھیں،

حضرت مجدد الف‌ثانی نے عہد اکبری اور عہد جہانگیری کی بدعات اور گمراہیوں کے خلاف آواز بلند کی ، اور شریعت اسلامیہ کی ترویج کے لیے جو کوششیں کیں ، وہ پاک و ہند کی تاریخ کا ایک روشن باب ہیں ۔

حضرت مجدد کے رشد و ہدایت کا طریقہ کار :

عین اس زمانے میں جب کہ اکثر علماء و مشائخ عافیت اسی میں سمجھتے تھے کہ خاموش ہو کر گوشوں میں بیٹھ جائیں ، حضرت مجدد الف ثانی نے جس کی تفصیل آئندہ اوراق میں آئے گی جہانگیر کے سامنے سجدہ نہ کر کے اور قید و بند کی سختیاں جھیل کر حق کو سر بلند کردیا ، اور دوسرے علماء کے لیے ایک مثال قائم کی کہ وہ حق کی سر بلندی میں دلیر ہوں ۔

اس کے علاوہ آپ نے اپنے مریدین کی ایک بڑی تعداد رشد و ہدایت کے پیغام کو عام کرنے کے لیے تیار کی ، اور انھیں ہر طرف بھیجا کہ وہ اسلام کی تبلیغ کریں ۔

اس کے ماسوا مختلف ممالک کے نامور لوگوں سے خط و کتابت کی ، اور ان پر دین کی حقیقت و اہمیت کو واضح کیا ۔

مزید یہ کہ بادشاہ کے امراء کو اپنے حلقہء ارادت میں داخل کیا ، تاکہ وہ بادشاہ کے مزاج میں اسلام کے مطابق انقلاب پیدا کریں ۔

اکبر کی وفات کے بعد جب جہانگیر تخت نشین ہوا تو آپ نے اس کی سعی کی کہ لوگوں سے عہد لیں کہ وہ اسلام کے خلاف

احکام شاہی کی اطاعت نہیں کریں گے اور آپ نے اپنی جد وجہد کو افواج شاہی تک پھیلا دیا۔

یہ تھا وہ طریقۂ کار جس پر حضرت مجدد الف ثانی نے اپنی تبلیغ کی بنیاد رکھی۔

تعلیمات :

آپ نے حالات کے مقتضا کے مطابق جن تعلیمات اسلامی پر زور دیا ان میں دین سے بدعت کو نکال دینا تھا۔ فرمایا کہ یہ فقیر کسی بدعت میں خوبی اور نورانیت محسوس نہیں کرتا۔ ظلمت اور کدورت کے سوا ان میں مجھے کچھ محسوس نہیں ہوتا۔"

ایک خط میں اپنے ایک مرید فتح خان افغان کو لکھا کہ:
سب سے اعلیٰ نصیحت سعادت مند دوستوں کے لیے یہ ہے کہ سنت کا اتباع کریں، اور بدعت سے بچیں، جو شخص کسی متروک سنت کو زندہ کرے اسے سو شہیدوں کا ثواب ملتا ہے۔

بعض صوفیانہ اقوال سے شریعت اور طریقت میں فرق بتایا جاتا تھا، آپ نے اس فرق کو مٹایا، ایک خط میں ملا بدر الدین کو لکھا کہ: مستقیم الاحوال صوفیہ احوال و اقوال، اعمال اور علوم و معارف میں ہرگز شریعت سے تجاوز نہیں کرتے، اگر کسی کا حال سکر کے وقت شریعت کے مخالف ہو تو معذور ہے، اور اس کا کشف غیر صحیح ہے، اس کی تقلید ناجائز اور نا درست ہے۔
ایک اور خط میں فتح خاں کو لکھا کہ: استقامت کا طریقہ شریعت، اور باطن کی درستی کی علامت ظاہر کو شرعی احکام سے سنوارنا ہے...

سنت اور فرض کا زندہ کرنا سب سے بڑا کام ہے ، اور سب سے بڑا ثواب ان پر ہی مرتب ہوتا ہے ۔ آپ کا سب سے اہم تجدیدی کارنامہ شریعت کی ترویج ہے، ایک خط میں شیخ محمد یوسف کو لکھا کہ : اپنے ظاہر کو ، ظاہر شریعت سے اور اپنے باطن کو باطن شریعت سے آراستہ کریں اور حقیقت اور طریقت دونوں شریعت ہی کی حقیقت ہیں نہ کہ شریعت اور ہے ، اور طریقت و حقیقت کچھ اور ۔ انھیں علیحدہ علیحدہ کرنا الحاد اور زندقہ ہے ۔

وحدت الشہود :

حضرت مجدد الف ثانی سے پہلے اکثر پہلے تمام صوفیہ وحدت الوجود کے قائل تھے ؛ لیکن آپ نے سب سے پہلے وحدت الوجود کے مقابلے میں فلسفہ ٔ وحدت الشہود کا نظریہ قائم کیا ، وحدت الوجود کا خلاصہ ہمہ اوست ، اور وحدت الشہود کا مقصد ہمہ از اوست ہے ۔ وحدت الوجودیوں کے نزدیک خارج میں احدیت مجردہ کے سوا کچھ موجود نہیں ، اور یہ کثرت جو نظر آتی ہے محض ان اعیان ثانیہ کا عکس ہے ۔ وحدت الشہودیوں کے نزدیک وہ کثرت جو نظر آتی ہے ، وہ عکس نہیں بلکہ خارج میں موجود ہے ۔ وہ ممکن کو واجب کا عین نہیں مانتے ، اس لیے وہ ہمہ اوست کہنے کو درست قرار نہیں دیتے ۔ بلکہ ہمہ از اوست کہنے کو صحیح قرار دیتے ہیں ۔

علامہ اقبال[7] وحدت الشہود کے قائل ہیں، اور اپنے نظریہ ٔ خودی میں انھوں نے حضرت مجدد الف ثانی ہی سے فیض حاصل کیا ہے ۔

شیخ بدیع الدین

سنہ ۱۶۱۹ء میں جب کہ حضرت مجدد الف ثانی کو رشد و ہدایت کا چراغ روشن کیے ہوئے کئی سال گزر چکے تھے ، اور آپ کے خلفاء برصغیر پاک و ہند بلکہ ممالک افغانستان و ترکستان تک میں پھیل چکے تھے ، آپ نے اپنے ایک مرید شیخ بدیع الدین کو جہانگیر کے لشکر میں رشد و ہدایت کے لیے بھیجا ، شیخ بدیع الدین نے لشکر شاہی میں تبلیغ اور ارشاد و ہدایت کا کام بڑے زور شور سے شروع کیا ، شاہی لشکر کے بہت سے آدمی آن کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوگئے ، لیکن ساتھ ہی مخالفتوں نے بھی سر اٹھایا ، چند دن کے بعد شیخ بدیع الدین نے اپنے مرشد کی نافرمانی کی ، اور لشکر شاہی سے اپنے مرشد کے بغیر اجازت اپنے وطن چلے آئے ، یہ امر حضرت مجدد صاحب کو ناگوار گزرا ، جب شیخ بدیع الدین اپنے مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے آن کے اس طریقے پر ، اظہار ناراضگی فرمایا ، شیخ بدیع الدین نے معافی چاہی ، اور دوبارہ لشکر شاہی میں جاکر نہایت زور و شور سے تبلیغ کا کام شروع کیا ، لیکن اس مرتبہ مخالفت زیادہ بڑھ گئی ۔

جہانگیر کی مخالفت :

اسی زمانے میں حضرت مجدد الف ثانی رح نے اپنے ایک خط میں اپنے عروج روحانی کا ذکر کیا تھا ، یہ آپ کے مکاتیب میں دفتر اول کا گیارہواں مکتوب ہے ، یہ خط آپ نے اپنے مرشد خواجہ باقی باللہ رح کے نام لکھا تھا ، اس میں تحریر فرمایا تھا کہ :

دوسری عرض یہ ہے کہ اس مقام کے ملاحظے کے وقت

اور بہت سے مقام ایک دوسرے کے اوپر ظاہر ہوئے ، نیاز و عاجزی سے توجہ کرنے کے بعد ، جب اس مقام سے اوپر کے مقام پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ حضرت ذوالنورین رض کا مقام ہے ، اور دوسرے خلفاء کا اس مقام میں عبور واقع ہوا ہے ، اور یہ مقام بھی تکمیل و ارشاد کا مقام ہے . . . . اس مقام کے اوپر ایک اور مقام نظر آیا جب اس مقام پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ حضرت فاروق اعظم رض کا مقام ہے ، اس مقام سے اوپر حضرت صدیق اکبر رض کا مقام ظاہر ہوا ، بندہ اس مقام پر بھی پہنچا ، اور اپنے مشائخ میں حضرت خواجہ نقشبند[1] قدس سرہ کو ہر مقام میں اپنے ہمراہ پاتا تھا . . . . اس مقام سے اوپر سوائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اور کوئی مقام معلوم نہیں ہوتا ، اور حضرت صدیق رض کے مقابل ایک اور نہایت عمدہ نورانی مقام کہ اس جیسا کبھی نظر میں نہ آیا تھا ، ظاہر ہوا ، وہ مقام اس مقام سے تھوڑا سا بلند تھا ، جس طرح کہ صفہ کو سطح زمین سے ذرا بلند بناتے ہیں ، اور معلوم ہوا کہ وہ مقام محبوبیت کا مقام ہے ، اور وہ مقام رنگین اور منقش تھا ، اپنے آپ کو اس مقام کے عکس سے رنگین معلوم کیا ۔

---

۱ ۔ خواجہ نقشبند : کا نام محمد بن بخاری ہے ، آپ اویسی تھے ، اور روحانی تربیت خواجہ عبدالخالق غجدوانی سے حاصل کی تھی ، آپ نے ۲۳ ربیع الاول ۷۹۱ھ میں وفات پائی ۔ (نفحات الانس (اردو ترجمہ) ص ۳۱۵-۳۱۹)

اس خط سے حضرت مجدد الف ثانی کے خلاف مخالفت کا ایک طوفان کھڑا کیا گیا ، لوگوں نے شیخ بدیع الدین پر اعتراض کیے کہ تمھارا پیر تو اپنے آپ کو حضرت ابوبکر صدیق رض سے بھی افضل سمجھتا ہے ، شیخ بدیع الدین نے یہ خط اپنے مرشد کی خدمت میں بھیج کر اُن سے توضیح چاہی ، اس کے جواب میں حضرت مجدد صاحب نے اُن کو لکھا کہ میں نے یہ خط اپنے مرشد کے نام لکھا تھا ، ہمارے سلسلے کا اصول یہ ہے کہ مرید کو جتنے واقعات بھی پیش آئیں بعینہ اپنے مرشد کو لکھ دینے چاہییں - تاکہ مرشد بتا سکے کہ ان میں کون سے صحیح اور کون سے غیر صحیح ہیں ، لیکن اس پر بھی لوگوں کی تشفی نہیں ہوئی ، آپ کے مریدوں میں فتح اللہ گیلانی اور قاضی سنام نے آپ سے علیحدگی اختیار کرلی ، آپ نے اس پر ایک مکتوب میرزا فتح اللہ کو لکھا ، جس میں تحریر فرمایا -

> وہ شخص جو اپنے آپ کو حضرت صدیق رض سے افضل جانے ، اس کا حال دو امر سے خالی نہیں ، یا وہ زندیق محض ہے یا جاہل . . . . وہ شخص جو حضرت امیر رض کو حضرت صدیق رض سے افضل کہے ، اہل سنت و الجماعت کے گروہ سے نکل جاتا ہے ، تو پھر اس شخص کا کیا حال ہے جو اپنے آپ کو افضل جانے -

شدہ شدہ یہ بات جہانگیر کے کانوں تک پہنچائی گئی - جہانگیر کو حضرت مجدد الف ثانی[7] کی روز افزوں عقیدت ، شہرت اور مقبولیت سے خطرہ لگا ہوا تھا ، لیکن وہ اس خدشے کا اظہار نہیں

کر سکتا تھا اب اسے موقع ہاتھ آ گیا، چناں چہ اس نے اپنے آپ کو سرہند کے حاکم کی معرفت بلا بھیجا، وہ خود آپ کے بلانے اور قید کا تذکرہ نہایت گستاخی اور سوء ادب سے اپنی تزک کے ۱۰۲۸ھ کے واقعات میں کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"ان ہی دنوں مجھ سے عرض کیا گیا کہ شیخ احمد نامی ایک مکار سرہند میں مکر و فریب کا جال بچھا کر کئی نادان بے سمجھ لوگوں کو اپنے فریب میں پھانسے ہوئے ہے، ہر شہر اور ہر علاقے میں اس نے اپنے مریدوں میں سے ایک کو جو معرفت کی دوکانداری، معرفت فروشی، اور لوگوں کو فریب دینے میں پوری مہارت رکھتے ہیں، خلیفہ کے نام سے مقرر کیا ہے، مذخرفات اور واہیات قسم کے خطوط اپنے مریدوں اور معتقدوں کے نام لکھ کر مکتوبات کے نام سے ایک مجموعہ جمع کیا ہے اس نے اس مجموعے میں اکثر ایسی فضول اور بے ہودہ باتیں لکھی ہیں جو کفر اور زندقیت تک پہنچتی ہیں، از آنجملہ اس نے ایک مکتوب میں لکھا

۱۔ مکتوبات امام ربانی: حضرت مجدد صاحب کی زندگی ہی میں مرتب ہوگئے تھے، ان کی تین جلدیں ہیں، دفتر اول کا نام دُرالمعرفت ہے، اسے خواجہ یار محمد بدخشی نے آپ کے قید ہونے سے تین سال پہلے سنہ ۱۶۱۶ء میں مرتب کیا تھا، یہ دفتر سب سے زیادہ مفصل ہے، دوسرے دفتر کا نام نورالحقائق ہے۔ یہ ۹۹ مکاتیب کا مجموعہ ہے، یہ مجموعہ آپ کے قید ہونے سے کچھ پہلے خواجہ عبدالحی حصاری نے خواجہ محمد معصوم کے ایما پر جمع کیا تھا، آپ کے مکاتیب کے تیسرے دفتر کا نام معرفت الحقائق ہے، اس میں آپ کے ۱۲۴ خطوط ہیں، اس کے مرتب خواجہ محمد ہاشم کشمی برہان پوری ہیں، یہ مجموعہ آپ کی وفات سے تین سال پہلے مرتب ہوا تھا۔

ہے کہ سلوک کی منزلیں طے کرتے ہوئے میرا گزر مقام ذوالنورین رض
میں ہوا، جو عالی شان اور نہایت پاکیزہ تھا، وہاں سے گزر کر
میں مقام فاروق رض میں پہنچا، اور مقام فاروق رض سے مقام صدیق میں آیا،
اس نے ہر مقام کی تعریف اس کے تناسب حال لکھی ہے، پھر اس
نے لکھا ہے کہ وہ وہاں سے مقام محبوبیت میں پہنچا، جو نہایت
منور اور رنگین تھا، اس مقام پر میں نے اپنے اندر مختلف انوار اور
الوان کو منعکس پایا۔ استغفراللہ برعم خویش وہ خلفا کے مرتبے سے
بھی آگے بڑھ گیا، اور ان سے بھی زیادہ عالی مرتبے پر فائز ہو گیا،
اس کے علاوہ اس نے اور بھی گستاخانہ باتیں لکھی ہیں، جن کا
تذکرہ طوالت کا باعث ہے۔ اس بنا پر میں نے حکم دیا کہ اسے
بارگاہ عدالت آئین میں حاضر کیا جائے، حسب الحکم وہ حاضر کیا
گیا، میں نے اس سے جو بھی پوچھا، وہ اس کا معقول جواب نہ
دے سکا۔ بے وقوف اور کم عقل ہونے کے ساتھ نہایت خود پسند
معلوم ہوا، میں نے اس کی اصلاح کے لیے یہی مناسب سمجھا کہ
اسے چند دن قید رکھا جائے، تاکہ اس کے دماغ کی شوریدگی اور
اس کے دماغ کی آشفتگی دور ہو، اور عوام میں اس کے مذخرفات کی
وجہ سے جو شورش پھیل رہی ہے، وہ رک جائے، چنانچہ میں
نے اسے انی رائے سنگھ دلن[1] کے حوالے کیا کہ وہ اسے قلعہ گوالیار
میں قید کر دے۔[2]

۱۔ انی رائے سنگھ دلن: ولد بیر نراین راجپوتوں کی گوت "بڑگوجر"
سے تھا، آخیر عہد اکبری میں خواصوں کا سردار مقرر ہوا، جہانگیر

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۳۵۹)

سبحۃ المرجان میں ہے کہ جب حضرت مجدد الف ثانی جہانگیر کے سامنے پیش ہوئے تو آپ نے اس کو نہایت معقول جواب دئیے ، جس پر جہانگیر خاموش ہو گیا ۔ لیکن اتنے میں کسی امیر نے کہا کہ شیخ کا تکبر تو دیکھیے کہ آپ کو سجدہ نہیں کیا ، حالانکہ آپ ظل اللہ اور خلیفۃ الٰہی ہیں ۔ اس پر بادشاہ غضبناک ہوا اور آپ کو قلعہ گوالیار میں قید کرا دیا ۔

سبحۃ المرجان میں یہ بھی ہے کہ شاہجہاں آپ کا بے حد معتقد تھا ۔ ان کے دربار میں آنے سے پہلے اس نے حضرت مجدد صاحب کے پاس افضل خاں اور خواجہ عبدالرحمن مفتی کو بعض فقہی کتابیں دے کر بھیجا کہ علماء نے بادشاہ کے لیے سجدہ تحیت جائز قرار دیا ہے ۔ آپ بادشاہ سے ملاقات کے وقت سجدہ کریں ، میں ذمہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۵۸)

نے اپنے عہد میں آسے انیرائے سنگھ دلن کا خطاب دیا اور اپنے امرائے خاص میں منسلک کر لیا ، شاہجہاں نے تخت نشین ہونے کے بعد اپنے جشن کے پہلے سال منصب سہ ہزار و پانصد سوار سے نوازا ، اور ۷ صفر ۱۰۳۸ھ کو اس کے باپ کی وفات کے بعد آسے راجا کے خطاب سے سر بلند کیا ، جلوس شاہجہانی کے دسویں سال اس کا انتقال ہوا (توزک جہانگیری (اردو ترجمہ جلد ۱) مترجمہ اعجاز الحق قدوسی ، حواشی جشن پنجم ، ص ۳۲۶ بحوالہ امرائے ہنود ص ۵۱ — ۵۳ -

۲ - توزک جہانگیری ، اردو ترجمہ - اعجاز الحق قدوسی جلد : ۲ ص ۱۱۸ — ۱۱۹ -

لیتا ہوں کہ آپ کو کسی قسم کا ضرر نہ پہنچے گا ، آپ نے فرمایا کہ علماء کا فتویٰ تو معذوروں اور کمزوروں کے لیے ایک اجازت ہے ، لیکن عزیمت یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی کو سجدہ نہ کیا جائے ۔

قید بند :

حضرت مجدد الف ثانی ایک سال تک قلعہ گوالیار میں قید رہے ، مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے مال و اسباب اور کتابوں کو بھی نقصان پہنچایا گیا ، ایک خط میں اپنے صاحبزادے حضرت خواجہ محمد معصوم کو لکھتے ہیں کہ : وہ راضی برضا رہیں ۔ اپنی والدہ کو بھی یہی سمجھائیں ، پھر تحریر فرمایا کہ :

> "غم حویلی و سرا و چاہ و باغ و کتب و اشیائے دیگر خود سہل است ، باید کہ ہیچ چیز مزاحم وقت شما نشود ، وغیر از مرضیات حق جل و علا مراد و مرضی شما نباشد ۔ اگر ما ہم مردیم این ہمہ اشیاء ہم رفت کہ در حیات ما رفتہ باشد ہیچ فکر نکنند ۔ والدۂ خود را تسلی دہند"

گوالیار کے قلعے میں حضرت مجدد الف ثانی ایک سال قید رہے ، حضرت مجدد الف ثانی نے اس قید خانے کو تبلیغ اور رشد و ہدایت سے ایک خانقاہ بنادیا ۔ ذکر و فکر کی محفلیں قائم ہونے لگیں ، اور وہاں نیکی اور تقویٰ کا درس دیا جانے لگا ۔

رہائی :

یہاں تک کہ ۱۰۲۹ھ میں جہانگیر نے آپ کو قلعہ گوالیار

سے طلب کر کے رہا کر دیا ۔ جہانگیر ۱۰۲۹ھ کے واقعات میں لکھتا ہے کہ :

(۲۱ خورداد ۱۰۲۹ھ (۱۶۲۰ء) اسی تاریخ میں میں نے شیخ احمد سر ہندی کو جو اپنی دوکان کو خود فروشی اور بیہودہ گوئی سے سجانے کی وجہ سے بغرض تادیب ، چند روز سے قید میں تھا اپنے حضور میں طلب کر کے اسے رہا کر دیا ، اور اسے خلعت اور ہزار روپے بطور خرچ عنایت کر کے ، جانے اور رہنے کا اختیار دیا ۔ شیخ نے از روئے انصاف کہا کہ یہ تنبیہ و تادیب در حقیقت ایک طرح کی ہدایت اور سبق ہے ، میرا نقش مراد آپ کی خدمت میں رہنے سے جلی ہوگا [۱] ۔

تیسرا اندراج جو توزک جہانگیری میں حضرت مجدد صاحب کے متعلق ملتا ہے ۔ وہ یکم سہر ۱۰۳۲ھ (۱۶۲۳ء) کا ہے، جس میں جہانگیر نے لکھا کہ منجملہ ان کے شیخ احمد سر ہندی کو دو ہزار روپے عنایت کیے [۲] ۔

پوری توزک میں تین جگہ حضرت مجدد صاحب کا تذکرہ ہے ، جسے ہم نے اوپر نقل کردیا ہے، ان کے علاوہ پوری توزک میں ہمیں آپ کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا کہ جس سے یہ معلوم ہوسکتا کہ رہائی کے بعد جہانگیر اور حضرت مجدد صاحب کے تعلقات کی

---

۱ - توزک جہانگیری ، اردو ترجمہ ، جلد : ۲ (اعجازالحق قدوسی) ص ۲۱۸ ۔

۲ - ایضاً ، ص ۳۸ ۔

نوعیت کیا رہی البتہ توزک سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں جہانگیر پر مذہبی رنگ غالب ہو گیا تھا اور آپ ترویج شریعت کا خاص خیال رہتا تھا ، ممکن ہے کہ جہانگیر کی طبیعت میں یہ انقلاب حضرت مجدد صاحب کا فیض ہو مگر توزک میں کوئی صراحت ہمیں اس قسم کی نہیں ملتی ، لیکن قیاس غالب یہ ہے کہ آپ نے اس زمانے میں جب کہ آپ لشکر شاہی کے ساتھ رہے ، ارشاد و تلقین کا سلسلہ برابر جاری رکھا ہوگا ، اس زمانے کے بعض خطوط سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی جہانگیر سے ایسی گفتگو رہتی تھی ، جس میں آپ اس کے سامنے اصلاح و تلقین کے فرائض انجام دیتے تھے ، ایک خط میں مجلس شاہی میں بادشاہ سے ایک گفتگو کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ :

> عجیب و غریب صحبتیں گزر رہی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان گفتگوؤں سے امور دینیہ اور اصول اسلامیہ میں سر مو سستی اور مداہنت دخل نہیں پاتی۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان محفلوں میں بھی وہی باتیں ہوتی ہیں، جو خاص خلوتوں اور مجلسوں میں بیان ہوا کرتی ہیں، اگر ایک مجلس کا حال لکھا جائے تو دفتر ہو جائے۔ خاص کر آج ماہ رمضان کی سترہویں رات کو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام بعثت اور عقل کے عدم استقلال اور آخرت کے ایمان اور اس کے عذاب و ثواب اور رویت دیدار کے اثبات، اور حضرت خاتم الرسل کی نبوت کی خاتمیت اور ہر صدی کے مجدد اور خلفائے راشدین رضؓ کی اقتدا ، اور تراویح کی سنت

اور تناسخ کے باطل ہونے اور جنوں اور جنیوں کے احوال
اور ان کے عذاب و ثواب کی نسبت بہت کچھ مذکور
ہوا، بادشاہ بڑی خوشی سے سنتا رہا اسی اثنا میں اور بھی
بہت سی چیزوں کا ذکر ہوا ، اور اقطاب و اوتاد اور
ابدال کے احوال اور ان کی خصوصیتوں وغیرہ کا بیان
ہوا ، اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ سب کچھ قبول کرتے
رہے ، اور کوئی تغیر ظاہر نہ ہوا ، ان واقعات اور
ملاقات میں کوئی اللہ کی پوشیدہ حکمت اور خفیہ راز
ہوگا۔

حضرت مجدد الف ثانی کے اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ
قلعہ گوالیار سے رہا ہونے کے بعد وہ شاہی لشکر میں کیوں رہے، اور
جب آپ کو جہانگیر نے قید سے رہا کیا اور جانے اور نہ جانے کا
اختیار دیا تو آپ نے لشکر شاہی میں رہنے کو ترجیح دیتے ہوئے
فرمایا کہ :

نقش مرادم در ملازمت خواہد بست ، وہ نقش مراد کیا تھا،
ہماری رائے میں وہ نقش مراد بادشاہ کی اصلاح و ہدایت تھی، جب
بھی اصلاح و ہدایت کا موقع ہوتا آپ اس سے فائدہ اٹھاتے ، جیسا
کہ آپ کے اس خط سے ظاہر ہوتا ہے ۔ مختصر یہ ہے کہ آپ نے
اکبری الحاد اور جہانگیر کے عہد کی برائیوں کے قلع قمع کرنے
میں بڑی جد و جہد کی ، اور آپ کے مجددانہ کارناموں نے دین کو
حیات نو بخشی ۔

وفات :

حضرت مجدد الف ثانی تین چار سال لشکر شاہی میں رہے ، لشکر شاہی کے ساتھ ۱۰۳۲ھ میں آپ اجمیر حاضر ہوئے ، اور خواجہ بزرگ رح کے مزار کی زیارت سے شرف ہوئے ، مزار کے خادموں نے حضرت خواجہ بزرگ رح کے مزار کا قبرپوش آپ کی خدمت میں پیش کیا جسے آپ نے نہایت ادب سے لیا ، اور فرمایا چوں کہ یہ لباس حضرت خواجہ رح سے بہت نزدیک رہا ہے ، اس لیے اسے میرے کفن کے لیے سنبھال کر رکھا جائے ۔

اب عمر زیادہ ہوچکی تھی ، سفر کی زحمتیں برداشت نہیں ہوتی تھیں اس لیے آپ بادشاہ سے اجازت لے کر اپنے وطن سرہند تشریف لے آئے ، اور تھوڑے ہی عرصے میں بروز سہ شنبہ قریب چاشت بتاریخ ۲۸ صفر ۱۰۳۴ھ (۱۰ دسمبر ۱٦۲۴ء) آپ رحمت حق سے پیوست ہو گئے ۔

تصانیف :

آپ کی تصانیف میں (۱) شرح رباعیات (۲) رسالہ مبدء و معاد (۳) معارف لدینہ ۔ (۴) رسالہ تعلیقات تہلیلیہ ، تعلیقات عوارف ، اور مکتوب دفتر اول و دوم و سوم ہیں [1] ۔

۱۔ حضرت مجدد الف ثانی کے یہ تمام حالات حیات مجدد از پروفیسر محمد فرمان رود کوثر اور تذکرہ علمائے ہند سے ماخوذ ہیں ۔

اولاد :

(۱) خواجہ محمد صادق[1] :

حضرت مجدد الف ثانی کے سب سے بڑے صاحبزادے خواجہ محمد صادق علیہ الرحمہ تھے۔ یہ ۱۰۰۰ھ (۹۲-۱۵۹۱ء) میں پیدا ہوئے ، علوم عقلیہ و نقلیہ کے جامع تھے ، اکثر علوم کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی تھی ، بعض علوم مولانا طاہر لاہوری اور مولانا معصوم کابلی سے پڑھے تھے ، اٹھارہ سال کی عمر میں علوم ظاہری کی تکمیل کی ، اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے ، شیخ بدرالدین سرہندی مؤلف حضرات القدس بھی ان کے تلامذہ میں تھے ۔ سرہند میں جب شدید طاعون پھیلا، تو یہ بھی اس میں مبتلا ہوئے، ان کے دو بھائی محمد فرخ و محمد عیسیٰ ان کی وفات سے ایک روز پہلے طاعون میں مبتلا ہو کر وفات پا چکے تھے ، انھوں نے بھی طاعون میں مبتلا ہو کر ۹ ربیع الاول بروز دو شنبہ سنہ ۱۰۲۵ھ (۱۶۱۶ء) میں وفات پائی ۔

خود حضرت مجدد الف ثانی نے اپنے ایک عزیز کو خط میں لکھا کہ :

> بتاریخ نہم ربیع الاول روز دو شنبہ فرزند مرحوم خواجہ محمد صادق بجوار رحمت حق پیوست ، و خود را فدائے عموم خلائق ساخت۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ۔[1]

---

(۱) یہ تمام تفصیل حضرات القدس ۔ مطبوعہ محکمہ اوقاف پنجاب لاہور ، ص ۲۲۰ - ۲۲۳ سے ماخوذ ہے ۔

(۲) خواجہ محمد سعیدؒ :

آپ کے دوسرے فرزند خواجہ محمد سعید تھے ۔ جن کی ولادت ماہ شوال ۱۰۰۵ھ (۱۵۹۷ء) میں ہوئی یہ انتہا درجے پر شریعت کے پابند ، متبع سنت ، اور صاحبِ تقویٰ بزرگ تھے ۔ علوم ظاہری اور کمالات باطنی کو اپنے والد ماجد سے حاصل کیا تھا ، اور آپ کے سامنے آپ کے خلیفہ ہونے کی حیثیت سے طریقت کی تعلیم دیتے تھے ، خود حضرت مجدد الف ثانی طالبانِ طریقت کو ان کے اور اپنے تیسرے صاحبزادے حضرت خواجہ محمد معصومؒ کے سپرد فرماتے تھے ، فرمایا کرتے تھے کہ ہر قطب کے دو امام ہوتے ہیں ، تم دونوں امام ہو ۔ ایک موقع پر فرمایا کہ میں عروج و نزول کے جس مقام پر بھی پہنچا ہوں ، میں نے محمد سعید کو اپنے ہمراہ پایا ۔

(۳) خواجہ محمد معصوم :

یہ حضرت مجدد الف ثانی کے تیسرے صاحبزادے تھے ، ان کی ولادت باسعادت ۱۰۰۹ھ (۱۶۰۰ - ۱ء) میں ہوئی ، ان کی ولادت کے بعد حضرت مجدد الف ثانی فرمایا کرتے تھے کہ اس لڑکے کی ولادت ہمارے لیے بے حد مبارک ثابت ہوئی ، اس کی ولادت کے چند ماہ بعد ہمیں حضرت خواجہ باقی باللہؒ کا شرفِ ملاقات حاصل ہوا ، اور یہ تمام علوم و معارف ظہور پزیر ہوئے ، حضرت مجدد الف ثانی ان صاحبزے کی تعلیم و تربیت کی طرف خصوصی توجہ فرماتے تھے ، ان سے مخاطب ہو کر فرمایا کرتے تھے کہ بابا ! علم حاصل کرنے سے جلد فارغ ہو جاؤ کہ ہمیں تم سے بڑے بڑے کام لینے ہیں ، حضرت خواجہ محمد معصوم تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے والد سے

بیعت ہوئے ، یہاں تک کہ آپ نے آن کو خلافت سے سرفراز فرمایا ۔ اور انھوں نے شریعت اور تقویٰ سے آراستہ ہو کر مسند ارشاد کو زینت بخشی ، چناں چہ خود حضرت خواجہ محمد معصوم نے اپنے بعض مکاتیب میں لکھا کہ : میں ابھی چودہ سال ہی کا تھا کہ میرے والد نے مجھے قطبیت کی بشارت دی ، اور مرتبۂ قیومیت سے نوازا ۔[1]

حضرت خواجہ محمد یحییٰ :

خواجہ محمد یحییٰ حضرت مجدد الف ثانی کے سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے ، ان ہی کے بچپن میں حضرت مجدد الف ثانی نے وفات پائی ۔ قرآن مجید کے حافظ تھے ، اور علوم نقلیہ اور عقلیہ کے اکثر علوم کی تعلیم اپنے دونوں بھائیوں خواجہ محمد سعید اور خواجہ محمد معصوم سے حاصل کی تھی ، طریقۂ نقشبندیہ کی تعلیم حضرت خواجہ محمد سعید سے حاصل کی ، اور سلوک کے تمام منازل حضرت خواجہ محمد معصوم سے طے کیے خرقۂ خلافت بھی اپنے ان دو بھائیوں سے حاصل کیا ۔[2]

محمد فرخ ، محمد عیسیٰ اور اُم کلثوم :

محمد فرخ ، محمد عیسیٰ ، ان دونوں صاحبزادوں نے حضرت مجدد کی زندگی ہی میں ایام وبا میں وفات پائی ۔ حضرات القدس میں آپ کی ایک صاحبزادی اُم کلثوم کا تذکرہ ہے ،[3] لیکن زبدۃ المقامات میں منقول ہے کہ آپ کی تین صاحبزادیاں تھیں ۔

---

۱ ۔ حضرات القدس ، ص ۲٦۲ تا ۲۹۵ ۔

۲ ۔ ایضاً ، ص ۲۹۵ ۔

۳ ۔ حضرات القدس ، ص ۲۹۵ تا ۲۹۷ ۔

اِن میں سے ایک نے شیر خوارگی کے زمانے میں وفات پائی ، دوسری صاحبزادی نے پندرہ سال کی عمر میں حضرت مجدد الف ثانی کے سامنے وفات پائی ، تیسری صاحبزادی ، زبدۃ المقامات کی تصنیف کے وقت حیات تھیں ۔[1]

خلفاء :

حضرت مجدد الف ثانی کے خلفاء میں جنھوں نے آپ کے بعد اس برصغیر میں سلسلۂ نقشبندیہ کو فروغ و ترقی دی ، اُن میں سے چند کے نام یہ ہیں ۔

(۱) میر محمد نعمان[1] (۲) شیخ نور محمد پٹنی[2] (۳) شیخ حمید بنگالی[3] (۴) شیخ محمد طاہر لاہوری[4] (۵) خواجہ محمد صادق بدخشانی[5] (۶) شیخ بدیع الدین سہارنپوری[7] (۷) شیخ محمد طاہر بدخشی (۸) شیخ یار محمد قدیم (۹) شیخ عبد الهادی (۱۰) خواجہ محمد صادق کابلی (۱۱) حاجی خضر خاں افغان (۱۲) شیخ احمد دبینی (دیوبندی) (۱۳) شیخ احمد برکی (۱۴) شیخ یوسف برکی (۱۵) شیخ کریم الدین عرف عبدالکریم (۱۶) شیخ حسن برکی (۱۷) شیخ عبدالحی (۱۸) خواجہ محمد ہاشم کشمی برہانپوری (۱۹) شیخ آدم بنوری (۲۰) شیخ بدر الدین مؤلف کتاب حضرات القدس ۔

---

۱ - زبدۃ المقامات ، ۳۲۶ -

۲ - میر محمد نعمان بن میر شمس الدین معروف بہ میرزا بزرگ : ولادت : ۹۷۷ (حضرات القدس ص - ۳۱۱)

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۳۶۹ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۶۸)

(۲) شیخ نور محمد پٹنی : حضرت مجدد الف ثانی کے جلیل القدر خلفاء میں تھے، انھوں نے خرقۂ خلافت حاصل کرنے کے بعد اپنے پیر کے حکم سے شہر پٹنہ میں رشد و ہدایت کا چراغ روشن کیا (حضرات القدس ص ۳۱۳)۔

(۳) شیخ حمید بنگالی : منگل کوٹ کے رہنے والے تھے، خرقۂ خلافت حاصل کرنے کے بعد اپنے وطن بنگال آئے، اور وہیں درس و تدریس، ارشاد و تلقین میں مصروف رہے (حضرات القدس ص - ۳۱۴)۔

(۴) شیخ محمد طاہر لاہوری : حضرت مجدد الف ثانی نے ان کو خلافت دے کر لاہور میں متعین فرمایا تھا کہ وہ وہاں رشد و ہدایت کے فرائض انجام دیں، شیخ محمد طاہر نے ۵۶ سال کی عمر میں ۲۰ محرم ۱۰۴۰ھ (۱۶۳۰ء) بروز پنجشنبہ بوقت چاشت، وفات پائی (حضرات القدس - ۳۱۹ تا ۳۲۶)۔

(۵) خواجہ محمد صادق بدخشانی : حضرت مجدد صاحب کے اکابر خلفاء میں تھے، یہ ہندوستان میں پیدا ہوئے، خانخانان عبدالرحیم سے وابستہ ہو گئے، شاعری میں بلند پایہ رکھتے تھے، ''ہدایت'' تخلص کرتے تھے، ''حکایت شیشۂ گرماچین'' کو مثنوی کے طرز میں مولانا روم کی مثنوی کے وزن میں لکھا تھا حضرت مجدد صاحب کے مرید ہو کر خرقۂ خلافت حاصل کیا، اور ماہ شوال ۱۰۵۰ھ (۱۶۴۱ء) میں وفات پائی، دہلی میں حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے مقبرے میں مدفون ہوئے (حضرات القدس، ص ۳۲۹ تا ۳۳۴)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۶۸)

(۶) شیخ بدیع الدین سہارنپوری : صاحبِ کشف و کرامات تھے ، حضرت مجدد صاحب کے مرید ہو کر درجۂ کمال کو پہنچے ، اور خرقۂ خلافت حاصل کر کے اپنے وطن واپس ہوئے ، اور تمام عمر رشد و ہدایت میں مصروف رہے (حضرات القدس - ص ۳۳۳ تا ۳۴۰) -

(۷) شیخ محمد طاہر بدخشی ، حضرت مجدد صاحب کے خلفائے خاص میں تھے ۔ جون پور کے مشاہیر مشائخ میں تھے ۔ حضرت مجدد صاحب نے آن کو ، ۱۰۰۱ھ (۹ - ۱۶۰۸ء) میں خرقۂ خلافت سے سر فراز فرما کر جون پور روانہ کیا (حضرات القدس ، ص - ۳۴۰ تا ۳۴۳) -

(۸) شیخ یار محمد قدیم ! ''قدیم'' ان کو اس لیے کہتے ہیں کہ ان کے ہمنام ایک یار محمد دوسرے بھی تھے ، جو حضرت مجدد صاحب کے مکاتیب کے دفتر اول کے جامع ہیں ، ان کو حضرت مجدد صاحب یار محمد جدید کہا کرتے تھے کہ وہ ان کے بعد مرید ہوئے تھے ، انھوں نے اکبر آباد میں وفات پائی (حضرات القدس - ص - ۳۴۳ تا ۳۴۴) -

(۹) شیخ عبدالھادی : اپنے شہر کے مشہور لوگوں میں تھے ، ابتداً حضرت خواجہ باقی باللہ سے وابستہ ہوئے ، آنھوں نے ان کی تربیت حضرت مجدد صاحب کے سپرد کی ، یہاں تک کہ آپ نے ان کو خلافت سے سر فراز فرمایا (حضرات القدس - ص ۳۴۴ تا ۳۴۵) -

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۶۸)

(۱۰) خواجہ محمد صادق کابلی : ابتدا میں نہایت مالدار تھے ، اور شاہزادہ سلیم (جہانگیر) کے ملازموں میں تھے ، یکایک قلب میں جذبۂ طلب حق بیدار ہوا، اور الہ آباد سے حضرت خواجہ باقی باللہ کی ملاقات کے لیے دہلی پہنچے ۔ لیکن حضرت خواجہ باقی باللہ وفات پا چکے تھے ، پھر یہ خواجہ حسام الدین مرید خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، انھوں نے فرمایا کہ تم جس چیز کے طالب ہو تمھیں اس کے لیے سر ہند میں حضرت مجدد صاحب کی خدمت میں حاضر ہونا چاہیے، چنانچہ وہ حضرت مجدد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے ، اور مرید ہو کر آپ کی بارگاہ میں یہاں تک تقرب حاصل کیا کہ وہ فرزندوں اور محرموں کے رشتے میں شمار ہوتے تھے ۔ خرقۂ خلافت سے سر فراز ہونے کے بعد انھوں نے لاہور میں سکونت اختیار کرلی تھی ، ۱۰۱۸ھ (۱۰ - ۱۶۰۹ء) میں عبدالہادی نے وفات پائی (حضرات القدس - ص - ۳۴۵ تا ۳۴۷) -

(۱۱) حاجی خضر خاں : قصبۂ بہلول پور کے رہنے والے تھے، جو مضافات سر ہند میں ہے، مجدد صاحب کے والد شیخ عبدالاحد سرہندی قدس سرہ کے مرید تھے پھر یہ حضرت مجدد صاحب کے مرید ہو کر اس مرتبۂ عالی پر فائز ہوئے کہ ایک دن حضرت مجدد صاحب نے شیطان کو دیکھا ، اس سے پوچھا کہ ہمارے یاروں میں کون ایسا ہے ، جس پر تیرا قابو نہیں چلتا ، اس نے جواب دیا صرف حاجی خضر ایسے ہیں کہ جن پر میں قابو نہیں پاتا ، ہر چند میں ہزار حیلے حوالے کرتا ہوں ، لیکن ان پر میرا بس

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۶۷)

نہیں چلتا ، اور وہ میرے جال میں نہیں آتے (حضرات القدس ۔ ص ۔ ۳۴۷ تا ۳۴۸) ۔

(۱۱) شیخ احمد دیبنی (دیوبندی) یہ حضرت مجدد صاحب کے قدیم مخلصوں میں تھے ، ابتدا میں وہ علوم ظاہری میں حضرت مجدد صاحب کے شاگرد تھے ، اتفاق سے برہان پور میں شیخ فضل اللہ کی خدمت میں مرید ہو کر خرقۂ خلافت حاصل کیا ، بعد میں حضرت مجدد صاحب کے مرید ہوئے ، اور خلافت سے سرفراز ہوئے ، انھوں نے ستر سال کی عمر میں وفات پائی ۔ (حضرات القدس ص ۔ ۳۴۷ ۔ ۳۴۹) ۔

(۱۲) شیخ احمد برکی : یہ شہر ود کے رہنے والے تھے ، جو کابل و قندھار کے درمیان واقع ہے ان کی وفات پر حضرت مجدد صاحب نے ایک خط میں ان کے فرزندوں کو لکھا کہ : مولانا ! آیات حق میں سے ایک آیت تھیں ، ان کا وجود اس وقت مسلمانوں کے لیے حق کی ایک نشانی تھا ۔

(۱۳) شیخ یوسف برکی : حضرت مجدد صاحب نے ان کو خلافت سے سرفراز فرمانے کے بعد ارشاد و ہدایت کے لیے جالندھر بھجوایا تھا (حضرات القدس ۔ ص ۳۵۴ تا ۳۵۵) ۔

(۱۴) شیخ کریم الدین عرف عبد الکریم : موضع عثمان پور کھتر کے رہنے والے تھے ، جو پرگنہ اٹک میں واقع ہے ، یہ مرشد کی تلاش میں نکلے ، اتفاق سے سرہند کے بازار میں گھوم رہے تھے کہ صوفی منشی نے مرشد کے سلسلے میں ان کی رہنمائی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۶۷)

حضرت مجدد صاحب کی طرف کی، اور آپ سے بیعت ہو کر خلافت سے سرفراز ہوئے ، شیخ کریم الدین نے ۳ محرم ۱۰۵۰ھ (۱۶۴۰ء) میں اپنے وطن میں وفات پائی ، (حضرات القدس - ص ۱۶۲ تا ۳۵۵)

(۱۵) شیخ حسن برکی ، شیخ احمد برکی کے تلامذہ میں تھے ، شریعت و حقیقت کے جامع تھے ، صاحبِ مقالات عالیہ تھے ، حضرت مجدد صاحبؒ سے مرید ہو کر خرقہ خلافت حاصل کیا ،
(حضرات القدس - ص ۳۶۲ تا ۳۶۶)

(۱۶) شیخ عبدالحی : پٹنہ میں مقیم تھے ، یہ حضرت مجدد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مرید ہو کر تھوڑی ہی مدت میں خلافت حاصل کی ، حضرت مجدد صاحب کے مزاج میں ان کو اس قدر تقرب حاصل تھا کہ وہ آپ کے محرمانِ راز میں تھے ، اور آپ کی اکثر خدمات حضوری ان سے متعلق تھیں ، حضرت مجدد صاحبؒ کے مکتوبات کے دوسرے دفتر کے جامع یہی ہیں ۔ خلافت حاصل کرنے کے بعد اپنے وطن واپس ہوئے ۔ اور اپنے وطن میں پہنچ کر مرجع عام و خاص ہوئے ۔ شیخ عبدالحی ۱۰۵۴ھ (۱۶۴۴-۴۵ء) میں عازم حرمین شریفین ہوئے ، اس وقت ان کی عمر ساٹھ سال کی تھی ۔ (حضرات القدس ، ص ۳۶۶ تا ۳۶۸)

(۱۷) خواجہ محمد ہاشم کشمی برہان پوری : بن خواجہ قاسم ، یہ کشم بدخشاں کے رہنے والے ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتے تھے ، ان کے آباء و اجداد سلسلۂ کبرویہ میں بیعت تھے ، لیکن خواجہ محمد ہاشم ابتداء ہی سے خواجگانِ نقشبندیہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۶۷)

سے دلچسپی رکھتے تھے۔ یہ اسی تلاش و جستجو میں ہندوستان آئے چند روز برہان پور میں میر محمد نعمان خلیفہ حضرت مجدد صاحب کی خدمت میں رہے، اور سلسلۂ نقشبندیہ کے ذکر اور مراقبے کی تعلیم اُن سے حاصل کی ۱۰۳۰ھ (۱۶۲۰ء) سے میں حضرت مجدد صاحب نے انھیں سرہند بلوالیا، یہ سرہند پہنچے، اور تقریباً دو سال سفر و حضر میں حضرت مجدد صاحب کے ساتھ رہے، اور حضرت مجدد صاحب کی یمن و توجہ کی وجہ سے احوال باطنی اور مقامات معنوی کی بلندیوں تک پہنچے، یہاں تک کہ مرید ہو کر خلافت سے سرفراز ہوئے پھر یہ حضرت مجدد صاحب کے حکم سے برہان پور آئے، اور یہیں انھوں نے اپنی شمع ہدایت روشن کی، طالبان معرفت اُن کے گرد پروانہ وار جمع ہوئے، خواجہ محمد ہاشم کشمی مکاتیب مجدد الف ثانی کے تیسرے دفتر کے جامع ہیں، وہ علوم باطنی کے ساتھ ساتھ علوم رسمی و صوری سے بھی بہرہ ور تھے، بلند پایہ شاعر تھے، خواجہ محمد ہاشم کشمی نے اپنے مرشد اور نقشبندیہ سلسلے کے بزرگوں کے حالات زبدۃ المقامات کے نام سے ۱۰۳۸ھ (۱۶۲۸-۱۶۲۹ء) میں لکھے، غالباً انھوں نے یہ کتاب حضرت خواجہ محمد سعید و خواجہ محمد معصوم کی فرمائش پر لکھنی شروع کی تھی، اس تالیف کو انھوں نے حضرت مجدد صاحب کی وفات کے تین سال بعد برہان پور میں مکمل کیا، کتاب کا اصل نام "برکات احمدیہ" اور تاریخی نام "زبدۃ المقامات" رکھا، بعد میں موخرالذکر نام بہت مقبول و

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۶۷)
مشہور ہوا - یہ تذکرہ ۱۳۰۷ھ (۱۸۹۰ء) مطبع نولکشور سے طبع ہوا -

(۱۸) شیخ بدر الدین سرہندی بن شیخ ابراہیم سرہندی حضرت مجدد صاحب کے نہایت مخلص مرید و خلیفہ تھے، یہ پندرہ سال کی عمر میں حضرت مجدد صاحب سے بیعت ہوئے ، اور سترہ سال مسلسل آپ کی خدمت میں رہے ، خیال ہے کہ حضرت مجدد صاحب کی وفات (۱۰۳۴ھ) کے وقت ان کی عمر ۳۲ سال کی تھی ، علوم ظاہری کی تکمیل بھی انہوں نے حضرت مجدد صاحب سے کی ، کچھ کتابیں آپ کے صاحبزادوں سے پڑھیں ، رفتہ رفتہ بارگاہِ حضرت مجدد صاحب میں وہ تقرب حاصل کیا کہ محرمانِ اسرار کے زمرے میں شامل ہو گئے - شیخ بدرالدین سرہندی کے نام حضرت مجدد صاحب کے کئی مکتوب ہیں ، جو آپ کے مکتوبات میں ہمیں ملتے ہیں ، شیخ بدر الدین صاحبِ تصانیف کثیرہ تھے ، آن کی تصانیف میں حضرات القدس، کرامات الاولیا ، ترجمہ فتوح الغیب اور روائح مشہور ہیں - (ماخوذ از مقدمہ حضرات القدس - ص ۸ تا ۲۱ از جناب محمد محبوب اللہی - مطبوعہ محکمہ اوقاف پنجاب) -

۴۷

حضرت میاں میر[1]

میاں میر کے متعلق علامہ اقبال کا تاثر :

اسرار و رموز میں علامہ اقبال برصغیر پاک و ہند کے مشہور بزرگ حضرت میاں میر کے متعلق اپنی بے پناہ عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

حضرتِ شیخِ میاں میرِ ولی　　ہر خفی از نورِ جانِ او جلی

بر طریق مصطفیٰ محکم پئے　　نغمۂ عشق و محبت را نئے

تربتش ایمانِ خاکِ شہرِ ما

مشعلِ نورِ ہدایت بہرِ ما!

ان کی تربیت کو اپنے شہر کی سرزمین کا ایمان، اور ان کی پندو موعظت کو اپنے اہل وطن کے لیے مشعل نور ہدایت قرار دیتے ہیں، اتباع رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں آن کے قدم کو مستحکم ، اور ان کے نغموں کو عشق و محبت کی جان بتاتے ہیں -

یہ بزرگ جنھوں نے پنجاب کی سر زمین کو اپنے رشد و ہدایت سے منور کر دیا ، جنھوں نے بھٹکے ہوئے انسانوں کو نیکی کی راہ

---

۱ - اسرار و رموز ، ص ۷۰ - ۷۱ -

دکھائی، جنھوں نے ایک گرتے ہوئے معاشرے کو انتشار و ابتری سے بچایا، جنھوں نے پنجاب میں سلسلۂ قادریہ کو نشاۃ ثانیہ بخشی، جنھوں نے تنزل و انحطاط کے دور میں احیائے ملت اور اعلاء کلمۃ الحق کی کوششیں کیں، ان کی یہ تمام مساعی و کوششیں پاکستان کی روحانی و ثقافتی تاریخ میں ہمیشہ آب زر سے لکھی جائیں گی۔

حالات :

حضرت میاں میر کا نام شیخ میر محمد، کنیت میاں میر ہے، آپ کے والد کا نام قاضی سائیں دتہ، بن قاضی قلندر اور والدہ محترمہ کا نام بی بی فاطمہ بنت قاضی قاضن ہے۔

آپ کا وطن سندھ کا مشہور اور قدیم شہر سیوستان (سیوہن) ہے۔ میاں میر خاندانی اعتبار سے فاروقی ہیں، آخر میں آپ کا نسب حضرت عمر فاروق رض سے جا ملتا ہے۔ آپ کے والد قاضی سائیں دتہ اپنے علم و فضل تقویٰ و تقدس کے اعتبار سے نہ صرف سیوستان میں ممتاز مانے جاتے تھے، بلکہ پورے سندھ میں آپ کی عظمت مسلّم تھی تحفۃ الکرام میں ہے کہ: قاضی سائیں دتہ از اولاد فاروق و اجلۂ علمائے روزگار بود، شریعت را باز طریقت و طریقت تو امان حقیقت داشتہ در سوستان نامی بل در تماسی مفد گرامی گزشتہ۔[1]

دارا شکوہ نے اپنی کتاب سکینۃ الاولیاء میں میاں میر کا سنہ ولادت آپ کے بھتیجے کے حوالے سے ۹۳۸ھ (۱۵۳۱-۳۲ء)

---

(۱)۔ تحفۃ الکرام، جلد ۳، ص ۱۳۸ -

تحریر کیا ہے[1] ، میر علی شیر قانع ٹھٹوی نے اپنی مشہور کتاب تحفۃ الکرام میں آپ کا سنہ ولادت ۹۵۷ھ (۵۱-۱۵۵۰ء) لکھا ہے ۔[2]

تعلیم طریقت :

بارہ سال کی عمر میں آپ نے دینی علوم کی تکمیل مختلف اساتذہ سے کی ، پھر آپ کی والدہ نے آپ کو سلسلۂ قادریہ کے سلوک کی تعلیم دی ۔[3]

بیعت :

پھر آپ اپنی والدہ محترمہ سے اجازت لے کر اور علائق دنیوی سے منہ موڑ کر سلسلۂ قادریہ میں شیخ خضر سیوستانی[4] سے مرید ہوئے ، جو سیوہن کے باہر ایک پہاڑ پر مقیم تھے ، ان ہی بزرگ سے ریاضتوں اور مجاہدوں کے بعد خرقۂ خلافت عطا کرنے کے بعد آپ کے شیخ نے آپ سے فرمایا تمہارا کام مکمل ہو چکا ، اب تمہیں اختیار ہے ، جہاں چاہے سکونت اختیار کرو ۔

---

(۱) سکینۃ الاولیا (اردو ترجمہ) ص ۱۹ ۔

(۲) تحفۃ الکرام ، جلد ۳ : ص ۱۳۸ ۔

(۳) خزینۃ الاصفیاء ، جلد ۱ : ص ۱۵۴ ، مطبوعہ نولکشور ۔

(۴) شیخ خضر سیوستانی : سندھ میں سلسلۂ قادریہ کے عظیم المرتبت صوفیاء میں شمار ہوتے ہیں ، ان کا وطن سیوہن تھا ، سندھ میں سلسلۂ قادریہ کے فیوض و برکات کے عام کرنے میں شیخ خضر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۷۹ پر)

لاہور میں آمد :

اکبر کے عہد حکومت میں پچیس سال کی عمر میں میاں میر لاہور تشریف لائے، لاہور پہنچ کر آپ مولانا سعد اللہ کے حلقۂ درس میں شریک ہوگئے، جو اس دور کے متبحر عالم تھے، پھر کچھ زمانے تک مولانا نعمت اللہ اور مفتی عبدالسلام لاہوری[1] سے بھی تعلیم حاصل کی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۷۸)

کا بڑا حصہ ہے، ان کے آئینۂ اخلاق میں اتقا، تقدس توکل و استغناء کا عکس نمایاں نظر آتا ہے، توکل کی انتہا یہ تھی کہ انھوں نے اپنی ساری زندگی میں کچھ بھی اپنے پاس نہ رکھا، وہ ابتداءً اپنے وقت کا بڑا حصہ ایک قبرستان میں گزارتے تھے، پھر وہ سیوھن کے باہر ایک پہاڑ پر مقیم ہوگئے، جہاں ان کا سارا وقت عبادتوں، مجاہدوں اور یاد الٰہی میں گزرتا تھا، انھوں نے ایک تنور بھی بنوایا تھا۔ جسے موسم سرما میں رات کے وقت گرم کر کے رات اس تنور کے پاس بسر کرتے، گرمی اور سردی میں ان کا لباس ایک تہہ بند تھا، شیخ خضر نے ۹۹۴ھ میں وفات پائی (خزینۃ الاصفیاء جلد ۱، ص ۱۳۶)

(۱) مفتی عبدالسلام لاہوری: اپنے دور کے ان بے مثل علماء میں سے تھے جن کی درس و تدریس میں مثال نہیں ملتی، انھوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۸۰ پر)

ریاضتیں اور مجاہدے :

لاہور میں آپ دن کے وقت بزرگوں کے مقابر، باغوں یا جنگلوں میں یادِ حق میں گزارتے تھے، اور جو مریدین و معتقدین آپ کے ساتھ ہوتے وہ بھی الگ الگ ایک ایک درخت کے نیچے یادِ الٰہی میں مشغول ہو جاتے ، جب نماز کا وقت آتا تو سب مل کر نماز باجماعت ادا کرتے ، راتوں کو عبادت الٰہی میں مشغول رہتے ، اکثر یہ اشعار پڑھتے :

کسے کو غافل از حق یک زمان ست
در آن دم کافر ست اما نہان ست
گزیں غفلت بجان پیوستہ بودے
درِ اسلام بر وے بستہ بودے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۷۹)

نے کتب درسیہ کی تعلیم شیخ اسحاق بن کاکو، شیخ سعد اللہ اور قاضی صدر الدین سے پائی تھی ، اور حکمت و فلسفے کی کتابیں علامہ فتح اللہ شیرازی سے پڑھی تھیں ، تعلیم کی تکمیل کے بعد وہ لاہور میں درس و تدریس میں پچاس سال مشغول رہے ، ان کے مشہور تلامذہ میں شیخ محب اللہ الہ آبادی، مفتی عبدالسلام دیوی اور میاں میر لاہوری ہیں ، ان کی تصانیف میں بیضاوی کا حاشیہ ہے ۔

ماثر الامرا میں ہے کہ وہ لشکر میں مفتی تھے ، ایک طویل عرصے تک اس خدمت پر مامور رہے ، پھر اس خدمت سے علیحدہ ہو گئے ، مفتی عبدالسلام نے اسی سال کی عمر میں ۱۰۳۷ھ (۲۸ - ۱۶۲۷ء) میں وفات پائی (نزہۃ الخواطر جلد ■ : ص ۲۲۳ - ۲۲۴)

جن باغوں اور مقامات میں آپ عبادت کے لیے جاتے، داراشکوہ نے سکینۃ الاولیاء میں ان مقامات اور باغوں کے نام صراحت سے لکھے ہیں۔

سرہند میں تشریف آوری :

لاہور میں جب میاں میر کی ولایت کی شہرت ہوئی، معتقدین کا ہجوم ہونے لگا تو آپ سرہند تشریف لے گئے، لیکن وہاں گھٹنوں کے درد اور سخت بیماریوں میں مبتلا رہے۔

پہلا مرید :

سب سے پہلے مرید جن کو آپ نے درجۂ کمال تک پہنچایا وہ حاجی نعمت اللہ سرہندی تھے، اس زمانے میں جب کہ آپ سرہند میں بیمار تھے، حاجی نعمت اللہ کو آپ کی بیماری اور تنہائی کا حال معلوم ہوا، وہ فوراً آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر انتہائی اخلاص و سعادت سے آپ کی تیمارداری میں مصروف ہوگئے، یہاں تک خدمت کی کہ پیشاب پاخانہ بھی اپنے ہاتھ سے اٹھاتے تھے، جب حضرت میاں میر صحت یاب ہوئے تو آپ نے ان سے خوش ہو کر فرمایا، ہمارے پاس دنیاوی مال و متاع نہیں جو ہم تم کو دیں، لیکن اگر تم چاہو تو ہم تمھیں روحانی نعمتوں سے مالا مال کر سکتے ہیں، حاجی نعمت اللہ نے عرض کیا کہ اس سے بڑھ کر اور کون سی نعمت ہو سکتی ہے، چناں چہ آپ نے ان کو بیعت کر کے ایک ہی ہفتے میں سلوک کے درجۂ کمال پر پہنچا دیا۔ حاجی نعمت اللہ پہلے طالب تھے جو آپ کی روحانی تعلیمات سے مستفیض ہوئے۔

لاہور میں دوبارہ تشریف آوری :

سرہند میں ایک سال قیام کے بعد آپ پھر دوبارہ لاہور تشریف لائے اور آخر عمر تک باغبانوں کے محلے میں ، جسے اب خانپورہ کہتے ہیں مقیم رہ کر رشد و ہدایت میں مصروف ہوگئے ، اور سارے پنجاب کو اپنی روحانی نعمتوں سے مالا مال کر دیا ، اور اپنے مریدوں کی اصلاح فکر اور تہذیب نفس کر کے ایک ایسی جماعت پیدا کی ، جس سے رشد و ہدایت کے چشمے پھوٹے ۔

طریقۂ بیعت :

بہت کم لوگوں کو بیعت کرتے تھے ، جب کوئی شخص آپ کی خدمت میں آتا تو اس سے پوچھتے کس لیے آئے ہو؟ اگر وہ کہتا کہ آپ کی ملاقات کے لیے آیا ہوں تو اس سے نہایت مہربانی سے پیش آتے ، اور فرماتے آؤ بیٹھو ، پھر کچھ دیر کے بعد ہاتھ اٹھا کر اس کے لیے دعا کرتے اور اسے رخصت کرتے ، اگر وہ کہتا کہ میں طلب حق کے لیے آیا ہوں ، فرماتے جاؤ اپنا کام کرو ، بابا ! حق کی طلب آسان کام نہیں ، بہت مشکل ہے ، جب تک کہ تم اس کی طلب میں یگانہ نہ ہو جاؤ گے ، اسے نہ پاسکو گے ، اور چوں کہ دل ایک ہے ، اور ایک چیز میں صرف ایک ہی چیز سما سکتی ہے ، اس لیے مجرد ہونا چاہیے ، جب کوئی آپ کا مرید ہوتا تو اسے یہ شعر سناتے :

شرط اول در طریق معرفت دانی کہ چیست

ترک کردن ہر دو عالم را و پشت پا زدن

یہ شعر اکثر پڑھا کرتے تھے :

کسے را امتحان نا کردہ صد بار
نگردانی تو او را صاحب اسرار

آخر جب طالب ترک و تجرید اختیار کرنے کا ارادہ ظاہر کرتا اور قطع علائق کرلیتا تو اسے ریاضت شاقہ ، کم خوری ، کم خوابی اور کم گوئی کی تلقین فرماتے ۔

مریدوں کی تربیت :

مریدوں کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ فرماتے ، مثلاً خواجہ بہاری جو آپ کے مرید و خلیفہ ہیں بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میرے گھر میں کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے ، اتفاقاً مکان گرنے کے آثار ظاہر ہوئے ، میں نے لوگوں سے کہا فوراً باہر چلے جاؤ ، یہ مکان گرنے والا ہے ، لوگ باہر چلے گئے ، لیکن میں وہیں بیٹھا ہوا کلمۂ طیب بلند آواز سے پڑھتا رہا ، یہاں تک کہ چھت گری ، دو لکڑیاں آپس میں کچھ اس طرح ملیں کہ میں ان کے بیچ میں آکر سلامت رہا ۔ جب یہ بات لوگوں نے حضرت میاں میر سے بیان کی تو لوگوں کو امید تھی کہ اس واقعہ کے سننے کے بعد آپ میری تعریف فرمائیں گے ، لیکن آپ نے فرمایا ”ہائے مرتبہ ، ہائے مرتبہ“ مرتے وقت بھی اس کا خیال دل سے نہ گیا ، آپ کا اشارہ اس طرف تھا کہ چوں کہ میں نے کلمۂ طیب بلند آواز سے پڑھا تھا ، تاکہ لوگ کہیں کتنا بڑا درویش ہے کہ مرتے وقت بھی خدا

کو یاد کرتا رہا ، گویا یہ اِس پر تنبیہ تھی کہ مجھے کلمہ آہستہ آہستہ پڑھنا چاہیے تھا ۔[1]

میاں میر کے متعلق علامہ اقبال کی ایک روایت :

علامہ اقبال نے مثنوی اسرار و رموز میں اِس ضمن میں کہ مسلم کی زندگی کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہے ، اگر جہاد میں یہ مقصد پیش نظر نہ ہو ، اور جہاد ، زمین حاصل کرنے کی ہوس میں ہو تو ایسا جہاد اسلام میں حرام ہے ، اس ضمن میں انھوں نے حضرت میاں میر کے ایک واقعہ کو نظم کرتے ہوئے لکھا کہ : ان کے ارادت مندوں میں ہندوستان کا ایک بادشاہ تھا ، جس کی ہوس ملک گیری اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ وہ چاہتا تھا کہ تمام ممالک پر قبضہ کر لے ، ہوس نے اس کی جان میں آگ لگا رکھی تھی ، اور وہ تلوار کو محض اِس لیے چلاتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ ملک حاصل کرے ۔ اس میں ملک گیری کا جذبہ اِس قدر بڑھا ہوا تھا کہ وہ ملک گیری کے لیے ایک طویل عرصے سے مصروفِ جنگ تھا ۔ ایک روز یہی بادشاہ حضرت میاں میر کی خدمت میں حاضر ہو کر طالبِ دعا ہوا کہ ملک گیری میں اس کو کامیابی حاصل ہو ۔ حضرت میاں میر اس کی بات سن کر خاموش رہے ۔ یہاں تک کہ اسی وقت ایک مرید نے آپ کی خدمت میں چاندی کے چند سکے بطور نذر پیش کیے ۔ اس نے کہا کہ حضور ! میں نے یہ سکے نہایت محنت کر کے حاصل کیے ہیں ، آپ میری اِس حقیر نذر کو قبول فرمائیں ، حضرت میاں میر نے اس مرید سے

---

۱ ۔ یہ تمام تفصیل سکینۃ الاولیاء (اردو ترجمہ) سے ماخوذ ہے ۔

فرمایا کہ یہ روپیہ ہمارے اس بادشاہ کو دے دو ۔ جو اب بھی بادشاہی کے لباس میں گدا ہے ، اگرچہ اس کی حکومت چاند ، سورج ، ستاروں پر ہے ، لیکن پھر بھی یہ اپنی حرص و ہوس کی وجہ سے دنیا کے مفلس ترین لوگوں میں ہے ۔ وہ دوسروں کے دستر خوان پر نظریں جمائے ہوئے ہے ، اس کی حرص و ہوس کی بھوک نے زمانے کو جلا رکھا ہے ، اُس کی ناداری سے خدا کی مخلوق پریشان ہے ، اس کی تہی دستی سے ضعیف آزار میں ہیں ۔ اس نے اپنے فکرِ خام کی وجہ سے لوٹ مار کا نام تسخیر رکھا ہے، خود اس کا لشکر ، اس کے غنیم کا لشکر اس کی بھوک کی تلوار سے ٹکڑے ٹکڑے ہے ۔ فقیر کی بھوک کی آگ تو اُسی کی حد تک رہتی ہے ، لیکن بادشاہ کی بھوک کی آگ ملک و ملت کو فنا کر دیتی ہے ۔ جس نے بھی تلوار غیر اللہ کے لیے اُٹھائی ، اُس کی تلوار اُسی کے سینے میں گھپی ۔[1]

علامہ اقبال کے اصل اشعار یہ ہیں :

حضرت شیخ میاں میرِ ولی
ہر خفی از نورِ جانِ او جلی
بر طریقِ مصطفیٰ محکم پئے
نغمۂ عشق و محبت را نئے
تربتش ایمان خاکِ شہرِ ما
مشعلِ نور ہدایت بہر ما

---

۱ ۔ علامہ اقبال کی اس روایت کا خلاصہ مثنوی اسرار و رموز ، ص ۷۰ - ۷۲ سے میں نے اپنے الفاظ میں لکھا ہے ۔

بر درِ او جبهہ فرسا آسماں
از مریدانش شہہِ ہندوستاں
شاہ تخمِ حرص در دل کاشتے
قصدِ تسخیرِ ممالک داشتے
از ہوس آتش بجاں افروختے
تیغ را ھل من مزید آموختے
رفت پیشِ شیخ گردوں پایۂ
تا بگیرد از دعا سرمایۂ
مسلم از دنیا سوئے حق رم کند
از دعا تدبیر را محکم کند
شیخ از گفتار شہ خاموش ماند
بزمِ درویشاں سراپا گوش ماند
تا مریدے سکۂ سیمیں بدست
لب کشود و مہرِ خاموشی شکست
گفت این نذرِ حقیر از من پذیر
اے ز حق آوارگاں را دست گیر
غوطہ ہا زد در خوئے محنت تنم
تا گرہ زد درہمے در دامنم
گفت شیخ این زر حقِ سلطانِ ما است
آنکہ در پیراہنِ شاہی گدا ست

حکمِ رانِ مہر و ماہ و انجم است
شاہِ ما مفلس ترینِ مردم است
دیدہ بر خوانِ اجانب دوخت است
آتشِ جوعش جہانے سوخت است
قحط و طاعون تابعِ شمشیر او
عالمے ویرانہ از تعمیرِ او
خلق در فریاد از ناداریش
از تہی دستی ضعیف آزاریش
سطوتش اہلِ جہاں را دشمن است
نوعِ انسان کاروان، او رہ زن است
از خیالِ خود فریب و فکرِ خام
می کند تاراج را تسخیر نام
عسکرِ شاہی و افواجِ غنیم
ہر دو از شمشیرِ جوعِ او دونیم
آتشِ جانِ گدا، جوعِ گدا ست
جوعِ سلطان ملک و ملت را فنا ست
ہر کہ خنجر بہرِ غیر اللہ کشید
تیغِ او در سینۂ او آرمید[۱]

شاہان وقت کی عقیدت :

جہانگیر:

شاہانِ وقت حضرت میاں میر سے غیر معمولی عقیدت و محبت

۱- اسرار و رموز، ص ۲۰۷ - ۲۰۷ -

رکھتے تھے ۔ جہانگیر[1] اپنی توزک میں حضرت میاں میر کا تذکرہ نہایت عقیدت و احترام سے کرتے ہوئے چودھویں جشن ۱۰۲۸ھ (۱۶۱۹ء) کے واقعات میں لکھتا ہے کہ :

جب مجھے اس کی اطلاع ملی کہ لاہور میں میاں شیخ میر محمد نامی ایک درویش سندھی نژاد ہیں ، جو نہایت فاضل ۔ ریاضت کش ، مبارک نفس ، صاحب حال بزرگ ہیں ، اور وہ گوشۂ توکل و عزلت میں گوشہ نشین ہو کر فقر کی دولت سے غنی اور دنیا سے بے نیاز ہیں ، یہ سن کر میری حق پسند طبیعت اُن کی ملاقات کے لیے بیقرار ہوئی ، اور اُن کے دیکھنے کا جذبۂ اشتیاق اور بڑھا ۔ چوں کہ لاہور جانا مشکل تھا ، اس لیے میں نے اُن کی خدمت میں ایک رقعہ لکھا ، اور اس رقعے میں اپنے اشتیاق ملاقات کو ظاہر کیا ، وہ بزرگ بڑھاپے اور کمزوری کے باوجود زحمت سفر برداشت کر کے میری ملاقات کے لیے تشریف لائے ، اور ایک طویل مدت تک تخلیے میں اُن کے ساتھ میری صحبت رہی ۔ فی الحقیقت وہ نہایت شریف النفس بزرگ ہیں ، اور اس زمانے میں ان کا وجود نہایت غنیمت ہے ، یہ نیاز مند

---

۱ - جہانگیر : ۱۰۱۴ھ میں تخت نشین ہوا ۔ اور ۲۸ صفر ۱۰۳۷ھ کو ۲۳ سال ۸ ماہ اور پندرہ روز حکومت کر کے وفات پائی (حاشیہ مقالات الشعراء ، ص ۳۲۵ ، بحوالہ مفتاح التواریخ ۔)

آن سے نہایت والہانہ محبت رکھتا ہے ۔ بہت سی
حقائق و معارف کی بلند باتیں آن سے سنیں ، میں نے
ہر چند چاہا کہ آن کے سامنے نذر پیش کروں ۔ لیکن
آن کے عزم و حوصلے کو دیکھ کر اور اس سے
بلند و بالا پا کر میرے دل نے اس ارادے کو پورا کرنے
کی اجازت نہ دی ، سفید ہرن کی کھال کی جائے نماز
آن کی خدمت میں پیش کی ، وہ ملاقات سے فارغ ہونے
کے بعد فوراً واپس لاہور تشریف لے گئے ۔[۱]

سکینۃ الاولیاء میں ہے کہ جہانگیر نے اس ملاقات کے موقع
پر آپ سے عرض کیا کہ : آپ مجھ سے کسی بات کی خواہش
کریں ؟ آپ نے فرمایا کہ میں جو کچھ تم سے طلب کروں گا تم
دو گے ؟ جہانگیر نے کہا ہاں ، فرمایا تو بس میں یہ چاہتا ہوں
کہ تم مجھے رخصت کی اجازت دو ، جہانگیر نے آپ کو نہایت
تعظیم و توقیر سے رخصت کیا ، اور آپ لاہور واپس تشریف لے آئے ،
واپس آنے کے بعد بھی جہانگیر نے آپ سے خط و کتابت جاری رکھی ،
ایک خط کے آخیر میں لکھا :

بعرض پیر دستگیر شیخ میر ، از بن نیازمند درگاہ الٰہی بعد
از عرض دعا التماس یہ ہے کہ دعا کے وقت کبھی کبھی
اس بندے کو یاد فرمایا کریں ۔[۲]

---

(۱) توزک جہانگیری ۔ جلد ۲ ۔ (آردو ترجمہ ۔ اعجاز الحق قدوسی ،
ص ۱۵۰ ۔

(۲) سکینۃ الاولیا (آردو ترجمہ) ص ۳۸ ۔

شاہجہان[1] :

شاہجہان بھی آپ سے بے حد عقیدت رکھتا تھا ، بادشاہ نامہ ، عمل صالح اور سکینۃ الاولیاء میں ان ملاقاتوں کا تذکرہ ملتا ہے ، بادشاہ نامے میں ۸ رجب ۱۰۴۴ھ میں جو شاہجہاں اور میاں میر کی ملاقات ہوئی ، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے صاحب بادشاہ نامہ لکھتا ہے :

صافی ضمیر ، میاں میر کہ جن کی تشریف آوری سے پہلے بھی یہ گھر مہبط انوار بن چکا تھا تشریف لائے ، اور بادشاہ کی گزارش پر آپ نے بہت سے دقائق ، حقائق اور غوامض و معارف کو اس دلکش طریقے پر بیان فرمایا جو انشراحِ صدر اور انبساطِ قلب کا موجب تھا ۔

شاہجہاں پر آپ کی عقیدت کا تاثر اس درجہ تھا کہ وہ آپ کی بزرگی اور علوئے مرتبت کے سامنے کسی دوسرے کو نہ مانتا تھا ، عمل صالح میں ہے کہ :

حضرت بادشاہ حقائق آگاہ آں مقتدائے اصحاب و عرفان

---

۱ - شاہجہاں : شہاب الدین محمد شاہ جہاں بن جہانگیر بن اکبر : یکم ربیع الاول ۱۰۰۰ھ میں لاہور میں پیدا ہوا ، اور ۳۷ سال کی عمر میں جہانگیر کے بعد ۷ جمادی الثانی ۱۰۳۷ھ کو آگرے میں تخت نشین ہوا ، اور ۷۶ سال کی عمر میں ۲۶ رجب ۱۰۷۶ھ میں وفات پائی ، (حواشی مقالات الشعراء ، مرتبہ سید حسام الدین راشدی ، ص ۳۲۳ و ۳۲۶) ۔

(میاں میر) کی صحبت کے والہ و شیدا تھے کہ اس سے زیادہ کسی عقیدت و شیفتگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا ، چناں چہ بارہا آپ کے محمودہ اطوار اور مبارک احوال کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے کہ اِس سر زمین کے مشائخ میں میں نے میاں میر جیسا کامل نہیں دیکھا ، اور اُن کے بعد شیخ المشائخ فضل اللہ ہیں ۔

شاہجہاں کو نصائح :

داراشکوہ نے سکینۃ الاولیاء میں لکھا ہے کہ شاہجہاں دو مرتبہ میاں میر کے گھر پر حاضر ہوئے ۔ ان مجالس میں میں خود بھی حاضر تھا ، آپ نے اُنھیں پند و نصائح فرمائے ، شاہجہاں آپ کے ارشاد اور شخصیت سے اِس قدر متاثر ہوئے کہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ ترک و تجرید میں میں نے میاں میر جیسا کوئی درویش نہیں دیکھا ۔

ان ہی میں سے ایک ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے دارا شکوہ لکھتا ہے کہ جب شاہجہاں میاں میر کے حجرے میں داخل ہوئے ، پہلی بات جو آپ نے شاہجہاں سے فرمائی ، وہ یہ تھی کہ عادل بادشاہ کو اپنی رعیت اور سلطنت کی خبر گیری کرنی چاہیے ، اور اور تمام قوتیں اپنی مملکت کے آباد کرنے میں صرف کرنی چاہیں ، کیوں کہ اگر رعیت آسودہ اور ملک آباد ہے ، تو فوج مطمئن اور خزانہ معمور ہوگا ۔[1]

---

۱ ۔ سکینۃ الاولیاء (اُردو ترجمہ) ، ص ۳۸ ۔

دارا شکوہ :

دارا شکوہ[1] بھی حضرت میاں میر کا عاشق تھا ، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ نے بھی اس کی روحانی تربیت اور ذوق و شوق کو آب و رنگ بخشا تھا ، جب دارا شکوہ کو بیعت کا خیال پیدا ہوا تو اس وقت میاں میر وفات پاچکے تھے ، لہذا

---

(۱) دارا شکوہ شاہجہاں کا سب سے بڑا لڑکا تھا ، جو ۲۱ صفر ۱۰۲۴ھ (۱۶۶۵ء) میں بانو بیگم المخاطب بہ ممتاز محل کے بطن سے اجمیر میں بمقام ساگر تال پیدا ہوا ، ابو طالب کلیم نے اس کی تاریخ ولادت گل اولین گلستان شاہی / ۱۰۲۴ھ سے نکالی ، اس نے شیخ میرک بن فصیح الدین ہروی اور دوسرے علماء سے تعلیم حاصل کی اس کا علمی مرتبہ بہت بلند تھا ، تصوف سے اس کو غیر معمولی دلچسپی ، اور صوفیہ سے غیر معمولی عقیدت تھی ، اس کی تصانیف جن کا اب تک پتا چل سکا ہے ، اور جو فارسی ادب اور تصوف کا بہترین سرمایہ سمجھی جاتی ہیں ، حسب ذیل ہیں۔

(۱) سفینۃ الاولیاء (۲) سکینۃ الاولیاء (۳) رسالہ حق نما (۴) حسنات العارفین یا شطحیات (۵) مجمع البحرین (۶) سر اکبر (۷) ترجمہ بھگوت گیتا (۸) بیاض دارا شکوہ (۹) دیوان دارا شکوہ (۱۰) دیباچہ مرقع (۱۱) مثنوی (۱۲) نادر النکات (۱۳) رسالہ معارف (۱۴) مکاتیب ۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۹۳ پر)

اس نے آپ کے خلیفہ مُلا محمد بدخشی[1] سے بیعت کی۔ اور حضرت میاں میر بھی اس سے بے حد محبت فرماتے تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۹۲)

دارا شکوہ ۲۱ ذی الحجہ ۱۰۶۹ھ کو اپنے بھائی عالمگیر کے حکم سے قتل کیا گیا۔ سیف خاں، نظر بیگ چیلہ اور بعض دوسرے لوگوں نے اسے قتل کیا، اور ہمایوں کے مقبرے کے تہہ خانے میں دفن کیا گیا۔ عمل صالح میں ہے کہ اسی لباس میں دفن کیا گیا جو قتل کے وقت اس کے جسم پر تھا، مقالات الشعرا بضمن قادری، ص ۵۰۴ — ۵۱۰)۔

(۱) مُلا شاہ محمد بدخشی: کا نام شاہ محمد، ان کے والد کا نام مُلا عبدی تھا، مُلا عبدی جوار ارکسا کے قاضی تھے، ارکسا روشاق کا ایک گاؤں ہے۔ مُلا شاہ محمد بدخشی ۱۰۲۳ھ (۲۴-۱۶۲۳ء) میں سلسلہ قادریہ میں حضرت میاں میر کے دستِ حق پرست پر بیعت ہوئے، میاں میر نے اپنی وفات سے چند سال پہلے مُلا بدخشی کو اپنی خلافت سے سرفراز کیا، تقریباً تیس سال تک آپ میاں میر کی خدمت میں حاضر رہ کر ریاضتیں اور مجاہدے کرتے رہے، لاہور کی گرمی سے مجبور ہو کر آپ نے کشمیر کو اپنا وطن بنایا، آپ جب تک حیات رہے ہر سال التزاماً موسم سرما میں اپنے مرشد کی خدمت میں لاہور حاضر ہوتے تھے، کشمیر میں دارا شکوہ اور جہاں آرا نے آپ کے لیے دامنِ کوہ میں ایک عالی شان خانقاہ تعمیر کرا دی تھی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۹۴ پر)

(۱) ایک دفعہ دارا شکوہ کا ملازم کسی کام سے حضرت میاں میر کی خدمت میں گیا ، آپ نے حسب عادت اس سے اس کا نام پوچھا ، اور دعا فرمائی ۔ رخصت ہوتے وقت اس نے عرض کیا کہ میں دارا شکوہ کا ملازم ہوں ، اگر وہ مجھ سے پوچھیں کہ حضور نے میرے متعلق کیا فرمایا تو میں کیا عرض کروں ؟ فرمایا اگر تم اس کے ملازم ہو تو بیٹھ جاؤ ، پھر یہ مصرعہ پڑھا :

اے گُل ! بتو خور سندم تو بوئے کسے داری !

اور اس پر نہایت توجہ اور عنایت فرمائی ۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۹۳)

۱۰۵۰ھ (۱۶۳۹ء) میں دارا شکوہ اور اس کی بہن آپ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے ۔

۳ ملا شاہ محمد بدخشی فارسی کے بلند پایہ شاعر بھی تھے ، غزلوں میں اپنا تخلص شاہ فرماتے تھے ، اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے دور حکومت میں حکم دیا کہ ملا بدخشی بجائے کشمیر کے لاہور میں قیام فرمائیں ، اس حکم کے بعد آپ لاہور میں مقیم ہوگئے ، لاہور میں آپ کے قیام کو ایک سال بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ ۱۰۷۰ھ (۱۶۵۹ء) میں آپ نے وفات پائی (رود کوثر ، ص ۳۸۵ - ۳۸۹ - فٹ نوٹ مقالات الشعراء ، ص ۵۰۳ - سکینۃ الاولیاء (اردو ترجمہ) ص ۳۷ -

(۱) سکینۃ الاولیاء (اردو ترجمہ) ص ۴۱ - ۴۲

اخلاق :

حضرت میاں میر حسنِ اخلاق کا پیکر مجسم تھے - دارا شکوہ نے سکینۃ الاولیاء میں آپ کے حسنِ اخلاق کی توصیف کرتے ہوئے لکھا کہ : آپ کا خُلق اس مرتبے کا تھا کہ جو شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا ، اگرچہ حضرت اسے تھوڑی ہی دیر اپنے پاس بٹھاتے تاہم اس طرح توجہ اور مہربانی فرماتے کہ وہ سمجھتا کہ جس قدر لطف و عنایت اس پر ہوئی ، کسی دوسرے پر نہیں ، یہ بات میں نے اکثر لوگوں سے سنی کہ جس پر شفقت فرماتے ، اس کا ہاتھ اپنے دستِ مبارک میں لے کر بات کرتے -

ابو جعفر حداد کہا کرتے تھے کہ اگر عقل مرد کی صورت میں ہوتی تو جنید کی صورت میں ہوتی ، اور اگر خُلق مرد کی صورت میں ہوتا تو حضرت میاں میر کی صورت میں ہوتا ، آپ جس پر بھی عنایت فرماتے اسے ''یار عزیز'' کہہ کر مخاطب کرتے ، سلک کی خوش حالی ، اور لوگوں کی خبرگیری کرنے کی تلقین کرتے ، اور مستحق لوگوں کے لیے صدقے کی نصیحت فرماتے ، مریدوں کو وہ دوست سمجھتے تھے ، لفظ مرید آپ کی زبان مبارک پر کبھی نہ آتا تھا ، فرمایا کرتے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانے میں پیری مریدی کا سلسلہ نہ تھا ، لیکن (ہمنشینی) و صحبت تھی ، جس کی پیروی ہم کرتے ہیں ، جو ہمارے ساتھ مل بیٹھتا ہے وہ ہمارے دوستوں میں ہے -[1]

---

۱ - سکینۃ الاولیا (اردو ترجمہ) ص ۴۱ — ۴۲ -

مسلک :

میاں میر ایک قدیم طرز کے صوفی تھے ، جو فنا فی اللہ کی منزل میں تھے ، ان کا تمام وقت عبادتوں اور ریاضتوں میں گزرتا تھا ، وہ وحدت الوجود کو منتہائے نظر بنائے ہوئے تھے ، عمل صالح میں ہے کہ آپ کو شیخ محی الدین ابن العربی کی کتاب ''فتوحات مکیہ'' کا اکثر حصہ حفظ یاد تھا ، اور مولانا جامی کی شرح فصوص الحکم بھی آپ کو پوری طرح حفظ تھی ، شہرت سے آپ کو نفرت تھی ، اور گوشۂ تنہائی کو آپ عزیز رکھتے تھے۔[1]

تعلیمات :

اپنی روحانی تعلیم وتربیت میں وہ شریعت کے اتباع پر سب سے زیادہ زور دیتے تھے ۔ مریدوں سے ارشاد فرمایا کرتے تھے : سلوک میں پہلا مرتبہ شریعت ہے ، طالب کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کے حفظ مراتب کی کوشش کرے ، جب وہ شریعت کے حقوق مکمل طور پر ادا کرنے لگے گا تو شریعت کے ادائے حقوق کی برکت سے دل میں طریقت کی خواہش خود بخود پیدا ہوگی ، اور جب طریقت کے حقوق کو بھی اچھی طرح ادا کرے گا تو اللہ تعالیٰ بشریت کا حجاب اس کی دل کی آنکھوں سے دور کر دے گا ۔ اور حقیقت کا مفہوم اس پر منکشف ہوگا ، جو روح سے متعلق ہے، اور طریقت ، باطن کی طہارت اور مرتبۂ حقیقت کا ادراک ہے ،

---

(۱) سکینۃ الاولیاء (آردو ترجمہ ، پروفیسر مقبول بیگ بدخشی) ، مطبوعہ پیکجز لمیٹڈ ۔ لاہور ۔ ص ۹۱ ۔

اور حقیقت ، مفہوم وجود کو فانی بنانا اور دل کو ما سوی اللہ سے خالی کرنا ہے ، جو درجۂ قرب تک واصل ہوتی ہے ، انسان نفس ، دل ، روح کا مجموعہ ہے ، ان میں سے ہر ایک کی اصلاح مقصود ہے ، نفس کی اصلاح شریعت ہے ، دل کی طریقت اور روح کی حقیقت سے ہوتی ہے ۔[۱]

ترکِ جاہ :

مریدین و معتقدین کو جاہ و مرتبے کے خیال کو ترک کرنے کی بے حد تلقین فرماتے تھے ، فرمایا کرتے تھے : دوستوں ! دل سے جاہ کی محبت نکال دینا بڑی بات ہے ۔

فقر و غنا :

حضرت میاں میر کے گھر کا فرش بوریے کا تھا ، فقر و غنا کا یہ عالم تھا کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں ، دنیا کی کسی چیز سے دل بستگی نہ تھی ، فقرا کو صاحبِ ثروت لوگوں سے بہتر سمجھتے تھے ۔[۲]

وفات :

حضرت میاں میر اٹھاسی سال کی عمر میں ۷ ربیع الاول ۱۰۴۵ھ (۱۶۳۵ء) کو بروز سہ شنبہ پیر کا دن گزرنے کے بعد واصل الی اللہ ہوئے ، سکینۃ الاولیاء میں ہے کہ آخر عمر میں آپ اسہال میں

---

(۱) ماخوذ از سکینۃ الاولیاء (اردو ترجمہ) ص ۶۶ ۔

(۲) سکینۃ الاولیاء اردو ترجمہ ۔ مترجم پروفیسر مقبول بیگ بدخشی

مبتلا ہوئے ، پانچ روز تک بیمار رہے ، بیماری کے دنوں میں آپ کے مریدین و خلفاء میں "ملا خواجہ بہاری" ، شیخ محمد لاہوری ، میاں حاجی محمد پنیانی اور نور محمد خادم نے تیمارداری اور خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، یہ حضرات رات دن آپ کی خدمت میں لگے رہتے ۔ دارا شکوہ کا بیان ہے کہ آپ کے خادم نور محمد نے مجھے بتایا کہ حضرت میاں میر کی وفات سے ایک دن پہلے وزیر خاں حاکم آپ کی عیادت و مزاج پرسی کے لیے آیا ، خادموں نے آپ کو اطلاع دی ، فرمایا اسے واپس کردو ، خادموں نے عرض کیا کہ وہ آپ کی عیادت کے لیے آیا ہے ، فرمایا اچھا آنے دو ، لیکن اس سے کہہ دو کہ وہ زیادہ دیر تک نہ بیٹھے ، وزیر خاں جب اندر آیا تو اس نے عرض کیا کہ میں آپ کے علاج کے لیے ایک طبیب حاذق کو ساتھ لایا ہوں ، اگر آپ کی اجازت ہو تو یہ آپ کا علاج کرے ، فرمایا میرے لیے حکیم مطلق کافی ہے پھر آپ نے وزیر خاں کو رخصت کردیا ۔

حاجی پراچہ کا بیان ہے کہ میں مرض الموت حضرت میاں میر کی خدمت میں موجود تھا ، وفات سے کچھ پہلے حضرت کو اجابت ہوئی ۔ فراغت کے بعد پھر بے چینی ہوئی اور چاہا کہ چارپائی سے نیچے آتریں میں نے حضرت کا ہاتھ تھاما کہ سہارا دوں ، حضرت نے ہاتھ کھینچ لیا ، اور کہا چھوڑ دو ، پھر خود ہی بے چینی کی حالت میں نیچے اترے اور کہا : الصلواۃ السلام علیک یا رسول اللہ ۔ اس کے بعد آپ کا سانس رکنے لگا ، میں نے آپ کو بستر پر لٹادیا ، اللہ اللہ آپ کے ورد زبان تھا ، مسکراتے تھے اور دونوں ہاتھ اٹھل

وجد کی طرح ہلاتے تھے ، یہاں تک کہ رحمت حق سے جا ملے ۔

میاں شیخ محمد لاہوری کا بیان ہے کہ میں حضرت میاں میر کی وفات کے وقت موجود تھا ، نزع کے عالم میں میں نے دیکھا کہ آہستہ آہستہ دہن مبارک ہل رہا ہے ، قریب گیا کہ سنوں آپ کیا فرما رہے ہیں ، میں نے دیکھا کہ سانس سینے میں رک گیا ہے ، اور اضطراب کی کیفیت ہے ، پھر آپ نے دو بار اللہ کہا ، اور سانس منقطع ہو گیا [1] ۔

جس دن وفات ہوئی ، سارے شہر میں کہرام مچ گیا ، حاکم شہر آپ کی وفات کی خبر سن کر اکابر ، علماء و فضلا ، اور شہریوں کے ساتھ آپ کے گھر آیا ، خادم تجہیز و تکفین کے انتظام میں مصروف ہو گئے ، پورے اعزاز و احترام کے ساتھ آپ کا جنازہ اٹھایا گیا ، جنازہ اس جگہ لایا گیا کہ جہاں آپ نے وصیت کی تھی کہ مجھے دفن کیا جائے ، کیوں کہ میرے یار میاں نتھا [2] ، حاجی سلیمان [3] ، شیخ ابو المکارم [4] ، حاجی مصطفیٰ کلال [5] ، چند اور دوسرے لوگ وہیں محو استراحت ہیں ۔

---

(۱) ماخوذ از سکینۃ الاولیا ۔ اردو ترجمہ ۔ بدخشانی ، ص ۱۲۳

(۲) میاں نتھا : حضرت میاں میر کے سر بر آوردہ مریدوں میں تھے ، سرہند کے رہنے والے تھے ، عالم جوانی میں میاں نتھا آپ کے حلقہ ارادات میں داخل ہوئے ، صاحب کشف و کرامات تھے ، میاں نتھا نے ۱۰۲۷ھ بروز پنج شنبہ وفات پائی ، حضرت میاں میر ، (بقیہ حاشیہ ص ۵۰۰ پر)

ملا فتح اللہ نے اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے حسب ذیل قطعۂ تاریخ وفات کہا :

میاں میر سر دفترِ عارفان
کہ خاکِ درش رشکِ اکسیرشد
سفر جانب شہر جاوید کرد
چو زیں محنت آباد دلگیر شد
خرد بہرِ سالِ وفاتش نوشت
بہ فردوسِ والا "میاں میر" شدا

۱۰۴۵ھ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۹۹ نمبر ۲)

میاں نتھا سے بے حد محبت رکھتے تھے ، جب آپ نے میاں نتھا کی وفات کی خبر سنی تو فرمایا ہماری وفات کے بعد ہمیں میاں نتھا کے پاس دفن کرنا (سکینۃ الاولیاء۔ اردو ترجمہ۔ مترجم پروفیسر مقبول بیگ بدخشی مطبوعہ ۔ پیکجز لمیٹڈ ۔ لاہور) ص ۱۵۹ تا ۱۶۶ -

(۳) حاجی سلیمان : بھی میاں میر کے جلیل القدر مریدوں میں تھے ، ان کی قبر حضرت میاں میر کے مزار کے قریب اور میاں نتھا کی قبر کے پاس ہے (سکینۃ الاولیاء ۔ اردو ترجمہ ، بدخشی) ص ۱۲۸ پر -

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۰۱ پر)

مزار کی تعمیر :

آپ کے مزار کی تعمیر کے لیے دارا شکوہ نے جو آپ کا نہایت معتقد تھا ، مسالہ جمع کیا تھا ، لیکن ابھی تعمیر کی نوبت نہ آئی تھی کہ دارا شکوہ اپنے بھائی کے حکم سے قتل کیا گیا ، کئی سال کے بعد عالمگیر آپ کے مزار پر حاضر ہوا اس نے اس عمارت کو مکمل کرایا [۲] ۔

خلفاء و مریدین :

حضرت میاں میر کے خلفاء و مریدین کی تعداد کثیر ہے ، ان میں سے جنھوں نے سلسلہ قادریہ کے فیوض و برکات کو عام کیا ، اُن میں حاجی نعمت اللہ سرہندی ۔ میاں نتھا ۔ حاجی مصطفیٰ سرہندی ، ملا حامد گوجر [۳] ، ملا روحی [۴] ، ملا خواجہ کلاں [۵] ،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۹۹)

(۴) شیخ ابوالمکارم : کی قبر بھی میاں نتھا کے مزار کے قریب ہے ، ان کا انتقال حضرت میاں میر سے پہلے ہوا (سکینۃ الاولیاء ۔ اُردو ترجمہ ، بدخشی) ص ۱۷۸ ۔

(۵) حاجی مصطفیٰ سرہندی : حضرت میاں میر کے خاص مریدوں میں تھے ، صاحب حال بزرگ تھے ، ان پر محویت کی کیفیت طاری رہتی تھی ، حاجی مصطفیٰ نے ۱۴ ماہ صفر بروز چہارشنبہ ۱۰۳۹ھ وفات پائی ان کی قبر میاں میر کے روضے کے قریب اور میاں نتھا کی قبر سے متصل واقع ہے (سکینۃ الاولیاء ۔ اُردو ترجمہ ، بدخشی) ص ۱۶۷

صالح کشمیری ۶، ملا عبد الغفور ۷، شیخ ابوالخیر، اسماعیل ہزارہ، قاضی عیسیٰ وغیرہ ہیں۔

لیکن آپ کے خلفاء میں جو آسمانِ ولایت پر آفتاب درخشاں بن کر طلوع ہوئے وہ ملا شاہ بدخشی ہیں، دارا شکوہ نے جو حضرت ملا شاہ بدخشی کا مرید ہے، سکینۃ الاولیاء میں لکھا ہے کہ آپ کا نام شاہ محمد ہے، لیکن حضرت میاں میر انہیں محمد شاہ کہا کرتے تھے، اور آپ کے مریدین حضرت اخوند کہہ کر خطاب کرتے تھے۔ ان کا لقب "لسان اللہ" تھا، خود ایک رباعی میں فرماتے ہیں:

آں کس کہ ز راہِ حق آگاہ است
ملا شاہ است و عارف ایں راہ است
از تاثیر زبانِ او معلوم است
کامروز ملقب بہ لسان اللہ است

---

(۱) سکینۃ الاولیاء (ترجمہ بدخشی)

(۲) تذکرہ صوفیائے پنجاب (تالیف اعجازالحق قدوسی، ص ۵۷۵

(۳) ملا حامد گوجر: حضرت میاں میر کے خاص مریدوں میں تھے، علوم ظاہری میں ممتاز عالم اور شہر کے معلمین میں تھے۔ ملا حامد گوجر نے حضرت میاں میر کی وفات سے پانچ ماہ اور ۱۹ دن پہلے ۱۷ رمضان ۱۰۴۴ھ کو وفات پائی (سکینۃ الالیاء، اردو ترجمہ۔ بدخشی) ص ۱۶۸

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۰۳ پر)

ملا شاہ بدخشی کی جلالت شان کا اندازہ اس سے کیجے کہ ایک دن حضرت میاں میر نے دعا فرمائی ، اہل مجلس نے پوچھا کہ یہ دعا کس کس کے حق میں ہے ۔ فرمایا ملا شاہ کے حق میں ، جس سے میرا طریقہ روشن ہوگا ۔"[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۰۱)

(۴) ملا روحی : کا نام ابراہیم تھا ، صاحب مقامات عالیہ تھے ، میوات ، ہرات اور نارنول کے لوگ آپ سے فیض یاب ہوئے ۔ ملا روحی نے ۱۰۲۵ھ میں وفات پائی ان کی قبر حاجی سلیمان کی قبر کے متصل ہے (سکینۃ الاولیاء ۔ اردو ترجمہ ۔ بدخشی) ص ۱۶۹ تا ۱۷۰

(۵) ملا خواجہ کلاں : لاہور کے گرد و نواح کے رہنے والے تھے ، انھوں نے حضرت میاں میر کی زندگی میں وفات پائی (سکینۃ الاولیاء ۔ اردو ترجمہ ۔ بدخشی) ص ۱۷۱ تا ۱۷۲

(۶) صالح کشمیری : کشمیر کے رہنے والے تھے، انھوں نے میاں میر کے بعد اپنے سلوک کی تکمیل ملا شاہ بدخشی سے کی ۔ حاجی صالح کشمیری نے ماہ جمادی الاول ۱۰۴۵ھ کو وفات پائی (سکینۃ الاولیاء ۔ اردو ترجمہ ، بدخشی) ص ۱۷۳ - ۱۷۴

(۷) ملا عبدالغفور : علوم ظاہری کے بھی عالم تھے ، شہر لاہور میں مدرس تھے، ان کی وفات حضرت میاں میر کی وفات سے پہلے ہوئی ان کی قبر کلا نور میں ہے (سکینۃ الاولیاء ۔ اردو ترجمہ، بدخشی) ص ۱۷۵ - ۱۷۶

---

(۱) تذکرہ صوفیائے پنجاب (تالیف اعجازالحق قدوسی) ص ۵۷۵

۲۸

پیر غلام حیدر علی شاہ

علامہ اقبال کی عقیدت :

حضرت پیر غلام حیدر علی شاہ ان بزرگوں میں جن کی خدمت میں علامہ اقبال عقیدت مندانہ حاضر ہوتے تھے ، ان سے دعا کراتے اور تصوف کے مسائل پوچھتے تھے ان کے وصال پر علامہ نے یہ تاریخی قطعہ لکھا تھا :

ہر کہ بر خاکِ مزار پیر حیدر شاہ رفت
تربتِ او را امینِ جلوہ ہائے طور گفت
ہاتف از گردوں رسید و خاک او را بوسہ داد
گفتمش سال وفات او بگو مغفور گفت

حالات :

پیر سید غلام حیدر علی شاہ ۳ صفر ۱۲۵۴ھ (۱۸۳۸ء) میں پیدا ہوئے ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت ان کی والدہ نے کی ، قران حکیم کی تعلیم خان محمد اعظم سے شروع کی ، جس کی تکمیل آپ کے چچا سید امام شاہ نے کرائی ۔ اردو اور فارسی کی درسی

کتابیں میاں عبداللہ چکروی سے پڑھیں ، فقہ کی کتابیں موضع نینوال میں قاضی محمد کامل سے پڑھیں ، مفتی غلام محی الدین جو علمی اعتبار سے اس نواح میں بلند پایہ رکھتے تھے استفادہ کیا ۔ اور فقہ کی مشہور کتاب کنز الدقائق پڑھی ، پھر خواجہ شمس الدین سیالوی سے سرقع اور کشکول کی تعلیم حاصل کی ، گو ظاہرا علوم کی تکمیل نہ کرسکے ، لیکن فطری سعادت اور اکابر کی صحبت نے آپ میں علم و عمل کے وہ انداز پیدا کیے جو بہت سے عالموں کے لیے قابلِ رشک تھے ۔

بیعت :

تعلیم کے بعد آپ شیخ کامل کی تلاش میں ہرن پور پہنچے ، اور وہاں کے ایک بزرگ سید غلام شاہ سے بیعت کی استدعا کی ، وہ آپ کو اپنے ساتھ لے کر حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی[1] کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ خواجہ شمس الدین سیالوی نے آپ کو اپنے دستِ حق پرست پر بیعت کیا ۔

خلافت :

بیعت ہونے کے بعد پیر غلام حیدر شاہ کا دستور تھا کہ ہر دسویں روز پابندی سے اپنے شیخ کی خدمت میں حاضر ہوتے ، جب

---

(۱) خواجہ شمس الدین سیالوی : حضرت سلیمان تونسوی کے محبوب ترین خلفا میں تھے وہ ۱۲۱۴ھ کو سیال میں پیدا ہوئے ، اور ۲۱ صفر ۱۳۰۰ھ میں آپ نے وفات پائی (تاریخ مشائخ چشت ، ص ۷۰۲ - ۷۰۵)

چھٹی مرتبہ آپ اپنے مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ کے مرشد نے آپ کو خلافت سے سرفراز فرمایا ، اور بیعت لینے کی اجازت دی ۔

شیخ کی شفقت :

حضرت شیخ سیالوی آپ پر بے حد شفقت فرماتے تھے ، اس شفقت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جب آپ سیال آتے تو حضرت شیخ سیالوی اُن کے استقبال کے لیے کچھ دور جاتے ، ایک دن پیر حیدر شاہ نے حضرت سیالوی کے ایک خادم شیخ عبد الجلیل کے توسط سے عرض کیا کہ حضور میری اس قدر تعظیم و تکریم فرماتے ہیں کہ جس سے میں بے حد شرمندہ ہوتا ہوں ، اور بجائے خود یہ بے ادبی بھی ہے کہ آپ میری تعظیم کے لیے تشریف لائیں ، خواجہ سیالوی نے فرمایا اُن سے کہہ دو کہ ہم اپنی مرضی کے مختار ہیں ، تم اس معاملے میں خاموش رہو ۔

اخلاق :

مجسمۂ اخلاق تھے ، نہایت رقیق القلب اور نرم دل تھے ، کبھی کسی پر خفا ہوتے تو صرف اس قدر فرماتے ، نیک بختا ! تونے یہ کیا کیا ، پھر اُسے آزردہ نہ ہونے دیتے فرمایا کرتے تھے :

مباش در پئے آزار ہر چہ خواہی کن
کہ در طریقتِ ما غیر ازیں گناہے نیست

ایک شخص مرزا خاں نامی آپ کا سخت مخالف تھا ، جب اُس کی شرارتیں حد سے زیادہ بڑھیں تو لوگوں نے آپ سے بیان کیا ، آپ نے فرمایا کہ دعا کرو کہ خدائے تعالیٰ اس پر رحم فرمائے ۔

بےحد متبع شریعت تھے ، ان کے تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ وہ فقہاء کی طرح محتاط اور شریعت پر عامل تھے ۔

وفات :

۶ جمادی الثانی ۱۳۲۶ھ (۱۹۰۸ء) میں پیر غلام حیدر شاہ نے وصال فرمایا ۔

(۱) پیر غلام حیدر شاہ کے یہ حالات تاریخ مشائخ چشت ، ص ۷۰۸ء ۱۲ھ سے ماخوذ ہیں ۔

۲۸

حضرت سید بابا تاج الدین ناگپوری

علامہ اقبال کا تاثر :

آخری دور کے بزرگوں میں جن بزرگ سے علامہ اقبال کو عقیدت تھی وہ تاج الاولیا حضرت بابا تاج الدین ناگپوری ہیں ۔ اس عقیدت کا پتا ہمیں اُن خطوط سے چلتا ہے جو '' شاد و اقبال '' کے نام سے ڈاکٹر محی الدین زور مرحوم نے مرتب کیے تھے ۔ اس میں علامہ اقبال اور مہاراجا سرکشن پرشاد وزیر اعظم حیدرآباد دکن کے وہ خطوط ہیں ، جو ایک نے دوسرے کے نام لکھے ہیں ۔ افسوس ہے کہ ان مکاتیب کا مجموعہ ہمیں دستیاب نہیں ہو سکا ۔

لیکن اقبال اکیڈمی ۔ کراچی کے قلمی ذخیرے سے ان خطوط کے چند اقباسات درج کرتے ہیں ، جن سے بابا تاج الدین سے علامہ اقبال کی دلی عقیدت کا پتا چلتا ہے ۔

علامہ اقبال کو مردانِ حق آگاہ کی تلاش رہتی تھی ، وہ جہاں کہیں بھی کسی اہلِ دل کا نام سنتے اُس کی ملاقات کے لیے بےچین ہوتے ، حضرت بابا تاج الدین ناگپوری کے عرفان و فیوض کا تذکرہ سن کر ۱۱ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو مہاراجا سرکشن پرشاد کو

ان بزرگ سے اپنے بے پایاں اشتیاقِ ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک خط میں لکھا :

ناگپور میں ایک بزرگ مولانا تاج الدین نام ہیں - کیا سرکار نے کبھی اُن کا نام سنا یا اُن کی زیارت کی؟ حکیم اجمل خاں صاحب دہلوی سے ان کی بڑی تعریف سنی ہے اور لاہور کے ایک اور دوست بھی اُن کی تعریف میں رطب اللسان ہیں - اُن کی خدمت میں حاضر ہونے کا قصد ہے - دیکھیے کب لاہور کی زنجیروں سے خلاصی ملتی ہے - چشتی سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں ، چوبیس گھنٹے میں بیشتر حصہ مجذوبانہ حالت میں رہتے ہیں - مگر سنا ہے کہ رات کے دو بجے کے بعد سے صبح تک اُن کے فیضان کا دروازہ کھل جاتا ہے - حیدر آباد میں کوئی مولوی یا منشی محمد اسمٰعیل صاحب ان کے پیر بھائی ہیں - شاید سرکار کو معلوم ہو - غرض کہ جن ذرائع سے معلوم ہوا آدمی قابلِ زیارت ہیں[1] -

۲۷ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو پھر علامہ اقبال نے ایک خط مہا راجا سر کشن پرشاد وزیر اعظم حکومت حیدرآباد دکن کو لکھتے ہوئے حضرت بابا تاج الدین کے متعلق اپنی عقیدت کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا -

(۱) ذخیرۂ اقبال اکیڈیمی قلمی - صحیفہ اقبال نمبر حصہ اول ، ص ۱۸۲ - ۱۸۴ - ۱۸۵

سرکار و الاتبار تسلیم

نوازش نامہ مع ”سفر نامہ ناگپور“ ملا، جس کے لیئے سراپا سپاس ہوں۔ میں نے اس چھوٹی سی کتاب[1] کو بڑی مسرت سے پڑھا اور سرکار کی عقیدت سے دل کو ایک قسم کی روحانی بالیدگی ہوئی۔ میرا قصد بھی اُن کی خدمت میں حاضر ہونے کا ہے۔ بعض وجوہ سے تجدید بیعت کی ضرورت پیش آئی ہے۔ سنتا ہوں کہ وہ مجذوب ہیں۔ مگر آج کل زمانہ بھی مجاذیب کا ہے۔ بہرحال اگر مقدر میں ہے تو انشاء اللہ ان سے مشکل کا حل ہوگا۔

اب ہم جناب سید عبدالواحد صاحب معینی نائب صدر اقبال اکیڈیمی کے اس مضمون سے استفادہ کرتے ہیں جو حضرت بابا ذہین شاہ تاجی کی تصنیف ”تاج الاولیاء“ میں بطور ضمیمے کے شائع ہوا ہے۔

سید عبدالواحد صاحب معینی اُن بزرگوں میں ہیں جنھوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ مطالعۂ اقبال پر صرف کیا ہے، اور علامہ اقبال پر کئی کتابیں تحقیقی رنگ میں لکھی ہیں، برصغیر پاک و ہند میں وہ اس موضوع پر اپنی غیر معمولی محنت و کاوش کی وجہ سے ماہرین اقبالیات میں شمار ہوتے ہیں، اور علمی حلقوں میں اُن کی کتابوں کو نہایت مقبولیت حاصل ہے۔

---

(۱) اس سفر نامے کا دوسرا نام ”آنکھ والا آنکھ والے کی تلاش میں“ ہے اور اس میں بابا تاج الدین کا ذکر نہایت عقیدت سے کیا گیا ہے، اس کتاب کا اسلوب بیان دلچسپ ہے (صحیفہ۔ اقبال نمبر حصہ اول، ص ۱۸۵

سید عبد الواحد صاحب معینی اپنے مضمون " بارگاہ تاج الاولیا میں علامہ اقبال کی عقیدت " کے عنوان سے رقم طراز ہیں کہ

حضور تاج الاولیا سید محمد بابا تاج الدین رحمۃ اللہ علیہ سے کس قدر عقیدت تھی ، اس کا اندازہ ان خطوط سے ہوتا ہے ، جو انہوں نے مہاراجا سرکشن پرشاد یمین السلطنت حیدرآباد دکن کو لکھے ہیں ۔

آگے چل کر وہ تحریر فرماتے ہیں کہ مہاراجا سرکشن پرشاد جب اپنے منصب سے علیحدہ ہوگئے... تو آن کی درخواستِ (دعا) دربار تاج الاولیاء میں گزاری ، اور اس کے بعد علامہ اقبال نے ۱۱ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو مہاراجا کو لکھا کہ :

خاکسار نے جو پیغام مولانا شاہ تاج الدین کی خدمت میں بھیجا تھا ۔ اس کا جواب سرکار والا کی خدمت میں پہلے پہنچے گا ۔

۲۶ اکتوبر ۱۹۲۲ء کے ایک خط میں علامہ پھر مہاراجا کو لکھتے ہیں :

رات پھر ایک پیغام حضرت تاج الدین کی خدمت بابرکت میں بھیجا گیا ۔

۱۱ نومبر ۱۹۲۲ء کو علامہ نے ایک اور خط میں مہاراجا سرکشن پرشاد کو لکھا کہ :

بابا تاج الدین کے پیغام سے میری مراد معشوقِ کامرانی کا خیال ہے ، جب سرکار کو یہ پیغام موصول ہو تو

دربار تاج میں تشریف لے جایئے ، فی الحال سرکار والا
کا تاسل بالکل بجا ہے ۔

خطوط مندرجہ بالا کے اقتباسات حضرت بابا تاج الدین ؒ سے علامہ اقبال کی عقیدت کے آئینہ دار ہیں ۔ حضرت بابا ذہین شاہ تاجی نے نہایت عقیدت سے اپنے مرشد کے مرشد حضرت بابا تاج الدین ناگپوری کا ایک مفصل تذکرہ تاج الاولیا کے نام سے لکھا ہے ہم نے حضرت بابا ذہین شاہ تاجی کی اس گراں بہا تصنیف سے استفادہ کیا ہے ۔

حالات :

حضرت سید محمد بابا تاج الدین ۱۲۶۸ھ (۵۲—۱۸۵۱ء) میں پیدا ہوئے ، ''چراغ دین'' سے آپ کی تاریخ ولادت نکلتی ہے ۔ آپ کا سلسلہ نسب حسنی و حسینی ہے خود حضرت بابا صاحب کا بیان ہے کہ میں امام حسن عسکری کا پوتا ہوں ۔ آپ کے جد اعلیٰ نے مدراس میں آکر سکونت اختیار کی ، آپ کے والد محترم جو فوج میں ملازم تھے جن کا اسم گرامی بدرالدین تھا ، اسی پلٹن کے ساتھ تبادلہ ہو کر کامٹی (سی ۔ پی) آئے آپ شکم مادر ہی میں تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا ۔ اور یہیں ۔ ۱۲۶۸ھ میں آپ کی ولادت باسعادت ہوئی ۔

اس تذکرے میں آپ کی تعلیم کے متعلق کوئی تفصیل نہیں ملتی ، صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ آپ مکتب میں پڑھنے کے لیے بٹھائے گئے ، آپ نے اردو ، انگریزی ، عربی اور فارسی کی بھی تکمیل فرمائی ۔

ایام جوانی میں پلٹن میں تین سال تک ملازمت کی ، دوران ملازمت ، ناگپور کے قریب کامٹی ملٹری کیمپ (میگزین) میں

اسلحہ کے ذخیرے پر پہرہ دینے کے لیے متعین تھے ۔ پھر ترکِ ملازمت کر کے سلوک باطن کی طرف متوجہ ہوئے ، اور ریاضتوں اور مجاہدوں کے بعد آپ کی شہرت بہت جلد اکنافِ عالم میں پھیل گئی - آپ کم گو اور کم آمیز تھے ، کم کھاتے اور کم سوتے تھے ، تلاوت قرآن مجید آپ کا محبوب مشغلہ تھا عبادت ، ریاضت اور مجاہدہ آپ کی فطرت ثانیہ بن چکا تھا ، روحانی سرشاریوں میں جسمانی تقاضوں کو بھلادیا تھا ، رفتہ رفتہ آپ کا جسم بھی روحانی انوار کی جلوہ گاہ بن گیا ، اور آپ مرکز جذب و کشش ہوگئے -

سلسلہ طریقت :

حضرت بابا ذہین شاہ تاجی نے لکھا ہے کہ بابا کی نسبت ابتداءً قادری ہے ، حضرت عبد اللہ شاہ قادری جن کا مزار کاشی میں ہے ، اور جو ایک صاحب باطن بزرگ تھے ، اوائل عمر میں بابا نے ان سے استفادہ کیا تھا - پھر انھوں نے لکھا کہ حضرت بابا صاحب اویسیہ نسبت بھی رکھتے تھے ، سلسلۂ چشتیہ صابریہ میں آپ کی نسبت حضرت داؤد مکی قطب جہاں سے ہے جن کا مزار پُر انوار ساگر (سی - پی) میں ہے ، حضرت داؤد مکی سلسلۂ چشتیہ کے مشہور بزرگ حضرت شمس الدین ترک پانی پتی کے مرید و خلیفہ ہیں ، حضرت داؤد مکی کے مزار پر حضرت بابا صاحب نے بہت سی ریاضتیں اور مجاہدے کیے تھے -

عالم جذب و سرمستی :

حضرت بابا تاج الدین پر عالم جذب و سرمستی کی کیفیت طاری رہتی تھی ۔ اس جذب و سرمستی کی کیفیت کی بنا پر ابتداءً

رمز ناشناس لوگ آپ کو چھیڑتے اور تنگ کرتے تھے، لیکن جوں جوں حقیقت سامنے آتی گئی، مخلوق خدا اور عوام کو اپنی غلطی محسوس ہونے لگی یہاں تک کہ آپ مرکزِ عقیدتِ خلائق بنے۔ آخر وہ وقت بھی آیا، جب آپ کی خدمت میں ہزاروں عقیدت مند حاضر ہوتے تھے، اور اکتسابِ فیض کر کے جاتے تھے۔

راجا رگھوجی راؤ کی عقیدت

اور شکر درے میں قیام :

اسی زمانے میں شہر ناگپور کا مشہور و معروف گونڈ راجا رگھوجی راؤ گھونسلہ جس کو حکومتِ برطانیہ نے سالانہ نقد وظیفہ کے علاوہ شکر درہ، واکی وغیرہ کئی گاؤں جاگیر میں دیے تھے، آپ کی بعض کرامات دیکھ کر آپ کا غیر معمولی معتقد ہو گیا، اور وہ نہایت عقیدت و احترام سے آپ کو اپنے گاؤں شکر درہ میں عقیدت مندوں کے ایک جلوس کے ساتھ لے کر آیا۔ پھر آپ شکر درہ میں مستقل طور پر مقیم ہو گئے، اور ایک غیر مسلم کا یہ گاؤں حضرت بابا تاج الدین کی وجہ سے ایمان و عرفان، رشد و ہدایت کی شیرینی کا ایک مرکز بنا۔

کرامات :

تاج الاولیا میں آپ کی بہت سے کرامات کا تذکرہ کیا گیا ہے، جنھیں تفصیل سے اس کتاب میں دیکھا جاسکتا ہے۔

تربیت و تزکیۂ نفس :

بابا صاحب اپنے مریدین و معتقدین کی تربیت اور تزکیۂ نفس کا بڑا اہتمام کرتے تھے، آپ کا ارشاد ہے کہ لوگ اصلاحِ اعمال

کا تو اہتمام کرتے ہیں ۔ لیکن اصلاحِ نفس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے ۔ نفس کی جڑ کامل تلوار کے بغیر نہیں کٹتی ، فرمایا کرتے تھے کہ برائی ہو یا بھلائی ہزاروں پردوں میں چھپ کر کی جائے تو بھی نہیں چھپتی -

تربیت اور عام معاملات میں سب مریدین و معتقدین کے ساتھ یکساں سلوک فرماتے تھے ، آپ کے فیوض و برکات کی بارش ہر خاص و عام پر یکساں برستی تھی -

وفات :

حضرت بابا تاج الدین نے ۲۶ محرم ۱۳۴۴ھ - مطابق ۱۷ اگست ۱۹۲۵ء بروز دو شنبہ بوقت مغرب شکر درہ میں وصال فرمایا ، رگھو راؤ راجا آپ کو شکر درے میں دفنانا چاہتا تھا ، مگر نواب نیاز الدین خاں نے بیربٹ (تاج آباد) میں آپ کی تدفین کے لیے ایک پلاٹ کی پیش کش کی ، اور اعلان کیا کہ وہ عنقریب یہ پورا موضع آپ کی درگاہ کے لیے وقف کردیں گے - چنانچہ مریدین و معتقدین کی اتفاق رائے سے آپ کو موضع بیربٹ (تاج آباد) میں دفن کیا گیا ۔ مولوی نجم الدین کابلی ، محمد فرید خاں فضا ، اور حسن نامی ایک شخص نے غسل دیا - نماز جنازہ مولوی محمود علی ندوی نے پڑھائی ، مولوی نجم الدین اور حکیم سید ظفر حسین نے جسد مبارک کو لحد میں آتارا ، جنازے میں ہزاروں انسانوں نے شرکت کی سعادت حاصل کی - ملک کے اخبارات و جرائد نے اپنے اخباروں اور رسالوں میں آپ کی وفات حسرت آیات پر تعزیتی نوٹ لکھے -

۴۹

حضرت شاہ سلیمان پھلوارویؒ

حضرت شاہ سلیمان پھلواروی علیہ الرحمہ ایک بلند پایہ عالم اور عظیم المرتبت صوفی تھے ، اسرار خودی کے چھپنے کے بعد ملک میں جو ہنگامہ ہوا تو حضرت خواجہ حسن نظامی نے مسئلہ" وحدت الوجود کے متعلق علامہ اقبال کے خیالات سے شدید اختلافات کرتے ہوئے ، اس سلسلے میں علامہ اقبال اور حضرت شاہ سلیمان پھلواری کو خطوط لکھے ، شاہ سلیمان پھلواروی نے اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار ایک خط میں فرمایا جو رسالہ خطیب میں چھپا اس خط کے شائع ہونے کے بعد علامہ اقبال نے حضرت خواجہ حسن نظامی کو مشورہ دیا کہ وہ اس سلسلے میں حضرت شاہ سلیمان پھلواری سے رجوع کریں ، چناں چہ یہ اختلاف جو خواجہ صاحب اور علامہ کے درمیان تھا ، حضرت شاہ سلیمان پھلواروی اور حضرت اکبر الہ آبادی کی مداخلت سے رفع ہو گیا ۔

ایک اور غلط فہمی کا ازالہ :

قبل اس کے کہ ہم شاہ سلیمان پھلواروی کے حالات زندگی قلم بند کریں ، ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے ،

جو علامہ اقبال علیہ الرحمہ کے متعلق ایک طویل عرصے سے چلی آتی ہے ، وہ یہ کہ علامہ اقبال شیخ ابن عربی[7] کے مخالف تھے ، حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال کو بعض مسائل میں فکر و نظر کا اختلاف بلاشبہ شیخ محی الدین ابن عربی سے تھا ۔ لیکن جہاں تک کہ اُن کی عظمت و محبت کا تعلق ہے ، علامہ اقبال نے اس کا اس کا اعتراف اپنے متعدد خطوط میں کیا ہے ، حضرت سلیمان پھلواروی کو اپنے ایک خط میں حضرت شیخ محی الدین ابن عربی سے اپنی محبت و اختلاف کو واضح کرتے ہوئے لکھا کہ :

> شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت کوئی بدظنی نہیں ، بلکہ مجھے اُن سے محبت ہے میرے والد کو فتوحات اور فصوص سے کمال توغل رہا ہے ، اور چار برس کی عمر سے میرے کانوں میں ان کا نام اور ان کی تعلیم پڑنی شروع ہوئی ، برسوں تک ان دونوں کتابوں کا درس ہمارے گھر میں رہا ، گو بچپن کے دنوں میں مجھے ان مسائل کی سمجھ نہ تھی ۔ تاہم محفلِ درس میں ہر روز شریک ہوتا ، بعد میں جب عربی سیکھی تو کچھ کچھ خود پڑھنے لگا ، اور جوں جوں علم اور تجربہ بڑھتا گیا ، میرا شوق اور واقفیت زیادہ ہوتی گئی ۔ اس وقت میرا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت شیخ کی تعلیمات قرآن کے مطابق نہیں ہیں اور نہ کسی تاویل و تشریح سے اس کے مطابق ہوسکتی ہیں ، لیکن یہ بالکل ممکن ہے کہ میں نے شیخ کا

مفہوم غلط سمجھا ہو ۔ کئی سالوں تک میرا یہی خیال
رہا ہے کہ میں غلطی پر ہوں ، گو اب میں سمجھتا
ہوں کہ میں ایک قطعی نتیجے تک پہنچ گیا ہوں ، لیکن
اس وقت بھی مجھے اپنے خیال کے لیے کوئی ضد نہیں
اس واسطے بذریعہ عریضہ ہذا آپ کی خدمت میں
ملتمس ہوں کہ از راہِ عنایت و مکرمت چند اشارات
تسطیر فرمادیں ۔ میں ان اشارات کی روشنی میں فصوص
اور فتوحات کو پھر دیکھوں گا اور اپنے علم و رائے میں
مناسب ترمیم کرلوں گا ۔[1]

علامہ اقبال کے اس خط کے اقتباس سے محبت اور اختلاف کے دونوں پہلو متوازن صورت میں ہمارے سامنے آجاتے ہیں ۔

نفسِ تصوف کے متعلق علامہ کی رائے :

۹ مارچ ۱۹۱۶ء کو مولانا سلیمان پھلواروی کو علامہ نے ایک خط نفسِ تصوف پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا کہ :

حقیقی اسلامی تصوف کا میں کیوں کر مخالف ہوسکتا ہوں
کہ میں خود سلسلۂ عالیہ قادریہ سے تعلق رکھتا ہوں،
میں نے تصوف کثرات سے دیکھا ہے ۔ بعض لوگوں نے
ضرور غیر اسلامی عناصر اس میں داخل کردیے ہیں ؛
جو شخص غیر اسلامی عناصر کے خلاف صدائے احتجاج
بلند کرتا ہے ، وہ تصوف کا خیر خواہ ہے نہ کہ مخالف ۔[2]

---

(۱) انوار اقبال (بشیر احمد ڈار) ص ۱۷۸ تا ۱۷۹
(۲) ایضاً ، ص ۱۸۱

اس خط سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ علامہ اقبال ، نہ صرف تصوف اسلامی کے قائل تھے ، بلکہ خود سلسلہ قادریہ میں مرید تھے ، وہ شیخ محی الدین ابن عربی سے خلوص نیت کے ساتھ بعض مسائل تصوف خصوصاً مسئلہ وحدۃ الوجود میں اختلاف رکھتے تھے لیکن ان کی عظمت بزرگانہ کے قائل تھے ، وہ شیخ ابن عربی کی تعلیمات میں ایک متجسس کی حیثیت رکھتے تھے تاکہ شیخ ابن عربی کی تعلیمات کا مفہوم ان پر کھل جائے ، چنانچہ وہ اس باب اپنی رائے کی غلطی کے امکان کو بھی نظر انداز نہیں کرتے ، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم حضرت شیخ محی الدین ابن عربی اور مسئلہ وحدۃالوجود پر بھی کچھ روشنی ڈالتے چلیں -

شیخ محی الدین ابن عربی[رح] اور وحدت الوجود :

بارہویں صدی عیسوی کے آخر میں جو آسمان تصوف پر آفتاب بن کر درخشاں ہوئے ، وہ حضرت شیخ محی الدین ابن عربی ہیں ، انھوں نے تحریک تصوف کو نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ وہ سب کچھ دیا ، جس کی اس تحریک کو ضرورت تھی ، اکابر صوفیہ ان کو اپنا امام تسلیم کرتے ہیں ، ان کی دو تصانیف فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ سے تحریک تصوف پر بڑے گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں -

انھوں ہی نے منصور کے نارہ' اناالحق کو پہلی مرتبہ فلسفہ' وحدت الوجود کی شکل بخشی ان کے نظریہ' وحدت الوجود کو مقبول بنانے میں مختلف دور کے صوفیہ اور شعراء نے نہایت اہم کردار ادا کیا ہے -

وحدت الوجود کا ماحصل یہ ہے کہ خدا کے سوا کائنات میں کوئی چیز موجود نہیں ، یا یہ کہ کائنات میں جو کچھ موجود ہے سب خدا ہی ہے ۔ لیکن بخلاف اس کے اہل ظاہر کے نزدیک خدا کائنات سے بالکل الگ اور جداگانہ ہستی ہے ۔

شیخ اکبر کے نظریہ وحدت الوجود نے بڑے بڑے صوفیہ کو متاثر کیا ۔ اور یہ نظریہ تصوف کی روح بن گیا ، یہاں تک علامہ اقبال کے مرشد معنوی مولانا روم بھی وحدت الوجود کے قائل و معترف نظر آتے ہیں ۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنی کتاب "تاریخ مشائخ چشت" میں وحدت الوجود کے عملی زندگی پر خوشگوار اثرات کو مرتب ہونے کے ضمن میں لکھا کہ :

اس پر اعتقاد رکھنے والے کا مطمح نظر بلند ، ہمدردیاں وسیع اور مقاصد اعلیٰ ہوتے ہیں، وہ عملاً "الخلق عیال اللہ" مخلوق اللہ کا کنبہ ہے) کا قائل ہوتا ہے ۔ وحدت الوجود پر ایمان لانے کے بعد انسان میں تنگ نظری اور تعصب کا وجود ہی نہیں رہتا ۔ ہمارے مشائخ نے اسی نظریے کے ذریعے دوسری قوموں کے مزاج کو پہچانا ، ان کے مذہبی اور سماجی حالات کو پرکھا ۔ پھر اسلام کے زریں اصولوں کو ان تک پہنچانے کی کوشش کی ... پھر آگے چل کر وہ لکھتے ہیں ۔ کہ وحدت الوجود کو عملی زندگی میں ایک اعلیٰ عنصر کی حیثیت سے استعمال کرنے کے لیے مجددانہ بالغ نظری اور مذہبی شعور کی ضرورت ہے ، ورنہ اس کی گمراہیاں

کبھی ''دین النہی'' کی شکل اختیار کرتی ہیں ، اور کبھی فتنہ' نمود وانمود'' کی ۔[1]

شاہ کلیم اللہ دہلوی[2] نے ایک موقع پر وحدت الوجود کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا :

(ترجمہ)

مسئلہ' وحدت الوجود پیش ہر آشنا و بیگانہ نخواہید بر زبان اورد ۔

مسئلہ وحدت الوجود کو ہر آشنا اور بیگانہ کے سامنے بیان نہیں کرنا چاہیے ۔

متاخر دور کے صوفیہ میں حضرت شاہ نور محمد مہاروی[3] کا ارشاد ہے :

براسم ماضیہ کہ حوادث واقع می شدند محض برائے اظہار وحدت وجود ۔

(ترجمہ)

پہلی امتوں پر جو حوادث واقع ہوئے ہیں وہ صرف وحدت وجود کے ظاہر کرنے کی بنا پر تھے ۔

---

(۱) تاریخ مشائخ چشت ، ص ۱۱۳ - ۱۱۴ ۔

(۲) شاہ کلیم اللہ دہلوی : بن حاجی نوراللہ ۲۴ جمادی الثانی ۱۰۶۰ھ (۱۶۵۰ء) ، اساتذہ : شیخ برہان الدین معروف بہ شیخ بہلول ، ولادت :شیخ ابوالرضا الہندی ، مرشد : حضرت شیخ یحیٰی مدنی، وفات : بعمر ۷۸ یا ۷۹ سال بمرض نقرس اور وجع المفاصل ، ۲۴ ربیع الاول ۱۱۴۲ھ (۱۷ اکتوبر ۱۷۳۹ء) ، اپنی مسکونہ حویلی جو قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان تھی مدفون ہوئے ، (مکتوبات کلیمی، ص ۹۳) تکملہ سیرالاولیاء ص ۵۸ خزینہ' الاصفیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۲۲)

علامہ اقبال اور ابن عربی :

علامہ اقبال اُن لوگوں میں ہیں ، جنھوں نے شیخ ابن عربی کے فلسفۂ وحدت الوجود کی سخت مخالفت کی ، انھوں نے اِ مسئلے کا ماخذ افلاطون کے فلسفے تصورات کو قرار دیا ، جس کو صوفیہ اعیانِ ثابتہ سے تعبیر کرتے ہیں ۔ وہ وحدت الوجود کے فلسفے کو فلسفۂ افلاطونی سے تعبیر کرتے ہیں ۔ اور کوہستان وجود میں اس فلسفے کو سَم قرار دیتے ہیں ، اُن کا خیال ہے کہ اِس فلسفے نے قوم کو ایک ایسا نشہ پلایا ہے کہ جس نے قوم کے افراد کو خودی سے نابلد کر کے ذوقِ عمل سے محروم کر دیا ہے ۔ اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ صوفیوں نے اس کے فلسفے کو تسلیم کر کے اِس فلسفے میں اپنے آپ کو اس طرح جذب کیا ہے کہ وہ اسلامی نظریۂ حیات کے مطابق نظر آنے لگا ۔ علامہ نے اسرار خودی میں تمثیلاً شیر و گوسفند کی حکایت سے ان کی مراد افلاطون ہے ۔ لکھ کر اِس بات کو واضح کیا ہے کہ کس طرح گوسفند نے جس سے اُن کی مراد افلاطون ہے شیر کو نفی خودی کی تعلیم دی ہے ۔ فرماتے ہیں :

راہبِ دیرینہ افلاطون حکیم
از گروہِ گوسفندانِ قدیم

(بقیہ حاشیہ نمبر ۳ صفحہ ۵۲۱)

(۳) شاہ محمد سہاروی : ولادت : ۱۴ رمضان ۱۱۴۲ھ (۱۷۳۰ء) بمقام چوڑالہ ، اساتذہ : حافظ محمد مسعود ، حافظ برخوردار جی ، مرشد : شاہ فخر شاہ فخر صاحب ، وفات : ۳ ذی الحجہ ۱۲۰۵ھ مزار : تاج سرور ۔ (مناقب المحبوبین) ۔

رخشِ او در ظلمتِ معقول گم
در کہستانِ وجود افگندہ سم

آں چناں افسونِ نا محسوس خورد
اعتبار از دست و چشم و گوش برد

گفت سرّ زندگی در مُردن است
شمع را صد جلوہ از افسردن است

بر تخیلہائے ما فرماں رواست
جامِ او خواب آور و گیتی رباست

گوسفندے در لباسِ آدم است
حکمِ او بر جانِ صوفی محکم است

فکرِ افلاطوں زیاں را سود گفت
حکمتِ او بود را نا بود گفت

منکرِ ہنگامۂ موجود گشت
خالقِ اعیانِ نا مشہود گشت

آہوش بے بہرہ از لطفِ خرام
لذتِ رفتار بر کبکش حرام

قومہا از سکرِ او مسموم گشت
خفت و از ذوقِ عمل محروم گشت

علامہ ، حضرت مجدد الف ثانی کے نظریے ہمہ از اوست سے متاثر ہیں ، اُن کے خیال میں ملت اسلامیہ میں فلسفہ ''ہمہ اوست'' کے عام ہونے کی وجہ سے قوتِ عمل سے محرومی ، ترکِ جدوجہد ، ناتوانی ، کاہلی ، سُستی مسلمانوں میں پیدا ہوئی ، یہاں تک کہ انھوں نے اپنی خودی اور وجود کو فراموش کردیا ، انھوں نے اپنی فکری کاوشوں کے بعد خودی کے فلسفے کو قرآنی آیت :

وللہ العزۃ ولرسولہ وللمومنین ولکن المنافقین لایعلمون
عزت اللہ ۔ اور اُس کے رسول اور مومنین کے لیے ہے ۔
لیکن منافق اس (بات کو) نہیں جانتے ۔
اور حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جس میں
ارشاد فرمایا گیا ۔
(ترجمہ)

من عرف نفسہ فقد عرف ربہ (جس نے اپنی ذات کو پہچانا اُس نے اپنے رب کو پہچانا) سے اخذ کیا ہے ، انھوں اِس حدیث کے مطابق اپنے فلسفے کی بنیاد خودی پر رکھی ۔ اور اپنے نفس کے عرفان کو خدا کی معرفت کا ذریعہ ٹھہرایا ، چناں چہ اسرار خودی میں فرماتے ہیں :

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است
ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است

خویشتن را چوں خودی بیدار کرد
آشکارا عالمِ پندار کرد

صد جہان پوشیدہ اندر ذاتِ او
غیرِ او پیدا منت از اثباتِ او

پیامِ مشرق میں کہتے ہیں کہ :

ز من گو صوفیانِ با صفا را
خدا جویان و معنی آشنا را

غلام ہمتِ آں خود پرستم
کہ با نورِ خودی بیند خدا را

زبور عجم میں فرماتے ہیں :

از ہمہ کس کنارہ گیر ، صحبتِ آشنا طلب
ہم ز خدا خودی طلب ، ہم ز خودی خدا طلب

بالِ جبریل میں فرماتے ہیں :

خودی میں گم ہے خدائی تلاش کر غافل
یہی ہے تیرے لیے اب صلاحِ کار کی راہ

تصوف میں نظریہ" خودی علامہ اقبال کا وہ فلسفہ تھا کہ جس نے تصوف کی دنیا کو ایک نئی راہ دکھائی ، انھوں نے خودی کا فلسفہ دے کر ذوقِ عمل کو بیدار کیا اور خودی کے رُخ سے نقاب اُٹھا کر اس راز کو فاش کیا ہے کہ خدائے تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات پیدا کیا ہے ، اور دنیا میں آسے اپنا خلیفہ مقرر کیا ہے، اس لیے انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنی خودی کو پہچانے ، اور اشیا کے خواص پر غور کر کے اُن کو مسخر بنائے ، وہ خودی کو بحرِ وحدت میں فنا کر کے حیات جاودانی کا راستہ نہیں ڈھونڈتے بلکہ خودی کے شعور کو بیدار کر کے حیات جاودانی کی راہ دکھاتے ہیں ۔ فرماتے ہیں :

مسافر جاوداں زی ، جاوداں میر
جہانی را کہ پیش آید فرا گیر
بہ بحرش گم شدن انجام ما نیست
اگر او را تو در گیری فنا نیست

وہ انسانوں کو خودی سے آراستہ کر کے کائنات کی تسخیر کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ذہن انسانی میں فکر و عمل اور محنت کی عظمت کی نئی شمع روشن کرتے ہوئے کہتے ہیں ا

اے کہ از تاثیرِ افیوں خفتہ ای
عالمِ اسباب را دوں گفتہ ای

خیز و وا کن دیدۂ مخمور را
دون مخوان این عالم مجبور را
غایتش توسیع ذاتِ مسلم است
امتحانِ ممکناتِ مسلم است
می زند شمشیرِ دوران بر تنت
تا بہ بینی ہست خون اندر تنت
سینہ را از سنگ زورے ریش کن
امتحانِ استخوانِ خویش کن
حق جہان را قسمتِ نیکان شمرد
جلوہ اش با دیدۂ مومن سپرد
تا ز تسخیرِ قوائے این نظام
ذو فنونیہائے تو گردد تمام
دست رنگیں کن زخونِ کوہسار
جوئے آب گوہر از دریا برآر
تابش از خورشید عالم تاب گیر
برق طاق افروز از سیلاب گیر
ثابت و سیّارۂ گردون وطن
آن خداوندانِ اقوامِ کہن
این ہمہ اے خواجہ آغوشِ تو اند
پیش خیز و حلقہ در گوشِ تو اند
جستجو را محکم از تدبیر کن
انفس و آفاق را تسخیر کن

چشم خود بکشا و در اشیا نگر
نشه زیرِ پردہ صہبا نگر

تا نصیب حکمتِ اشیا برد
نا تواں باج از توانا یاں خورد[1]

وہ فلسفہ خودی میں اپنے آپ کو مولانا روم کا فیض یافتہ قرار دیتے ہیں ، اس حقیقت سے انکار نہیں کہ مولانا روم اگرچہ مسلک وحدۃ الوجود کے قائل تھے ، لیکن ان کے ہاں فلسفہ خودی کی بھی جھلکیاں ملتی ہیں مگر علامہ نے فلسفہ خودی کو اپنے فکر کا موضوعِ خاص بنا کر ایک ایسا رنگ و آہنگ بخشا ہے کہ اگر انہیں فلسفہ خودی کا مؤسس کہا جائے تو بے جانہ ہوگا ۔

اس کے باوجود کہ علامہ ، شیخ ابن عربی کے فلسفہ وحدت الوجود سے سخت اختلاف رکھتے تھے مگر ان کی صوفیانہ عظمت کے قائل تھے ، تلمیحات اقبال میں سید عابد علی مرحوم نے لکھا کہ :

علامہ نے ایران کے ما بعد الطبعیات اور اپنے خطبات میں ابن العربی سے استفادہ بھی کیا ہے ، اور ان کی تردید بھی کی ہے ۔[2]

اب ہم حضرت شیخ محی الدین ابن عربیؒ حالاتِ زندگی اجمالاً پیش کرتے ہیں تاکہ ان کی زندگی کے مختلف پہلو قارئین کے سامنے آسکیں ۔

حالات حضرت شیخ ابن عربی :

حضرت شیخ محی الدین ابن عربی ۵۶۱ھ (۱۱۶۵ء) میں

---

۱ - رموز بے خودی ، ص ۱۶۵ - ۱۶۶
۲ - تلمیحات اقبال ، ص ۱۵۱

اسپین کے مشہور شہر مرسیہ میں پیدا ہوئے ، ۸ سال کی عمر میں مرسیہ سے لسبن آئے ۔ لسبن میں قرآن و حدیث کی تعلیم حاصل کی ۔ اس کے بعد اشبیلیہ تشریف لے گئے ۔ اور وہاں کے مشاہیر کی صحبت سے مستفیض ہوئے ، ناسساعد حالات نے ان کو اشبیلیہ ٹھہرنے نہ دیا ۔[1]

دائرہ معارف اسلامیہ جلد اول میں ہے کہ ان کا نام شیخ ابوبکر محی الدین بن علی تھا ، وہ ۱۷ رمضان ۵۶۰ھ میں پیدا ہوئے ۔ ۵۶۸ھ میں اشبیلیہ چلے آئے ۔ ۵۹۸ھ میں وہ بلادِ مشرق کی طرف روانہ ہوگئے ۔ بالآخر انھوں نے دمشق میں سکونت اختیار کرلی ۔ ابن عربی کے متعلق شدید اختلاف ہے ، بعض لوگوں کے نزدیک وہ ولی کامل تھے ۔ اور علم باطنی میں سند تھے ، آن کے بہت سے مدّاح جلیل القدر علماء بھی تھے ۔ مثلاً مجدد الدین فیروز آبادی ، الجلال سیوطی ۔ عبدالرزاق کاشانی ، متاخرین میں عبدالوہاب شعرانی ۔ ممتاز مخالفین میں رضی الدین الخیاط الذہبی ، ابن تیمیہ ، ابن ایاس ، علی القادری ، اور جمال الدین محمد نور الدین صاحب کشف الغمہ ہیں ۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو آن کا شدید مخالف ہے اسی طرح آن کی کتابیں بعضوں کے نزدیک بڑی وقعت سے دیکھی جاتی ہیں ، اور بعض آن کی مذمت کرتے ہیں ۔[2]

خلافت :

نفحات الانس میں ہے کہ تصوف میں ان کے خرقے کی نسبت

---

۱ ۔ تاریخ مشائخ چشت ، ص ۱۱۱

۲ ۔ دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱ : ص ۶۰۵ تا ۶۱۲

ایک ''واسطے'' سے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ سے جا ملتی ہے ۔ خود حضرت شیخ اکبر کا بیان ہے کہ میں نے خرقۂ خلافت ابوالحسن علی بن عبداللہ بن جامع کے ہاتھ سے موصل کے باہر اُن کے باغ مقلی میں ۶۰۱ھ (۱۲۰۴ء) میں پہنا تھا ۔[1]

شیخ ابن عربی اسپین کے ہر گوشے میں پہنچے ، اور وہاں کے کا بغور مطالعہ کیا ، قرطبہ میں ابن رشد سے ملاقات کی ۔ ۵۹۸ھ (۱۲۰۱ء) میں شیخ اکبر نے مشرق کی طرف رخ کیا ، مصر ، حجاز ، بغداد ، ایشیائے کوچک کی سیاحت کی ، لیکن اُن کے نظریات میں ایک ایسی جدت و ندرت تھی کہ کہیں بھی انھیں لوگوں نے چین سے بیٹھنے نہ دیا ۔[2]

شیخ شہاب الدین سہروردی سے ملاقات :

سلسلۂ سہروردیہ کے مشہور بزرگ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی جو شیخ اکبر کے ہمعصر ہیں ، ان دونوں کی ملاقات مکۂ معظمہ میں ہوئی ، دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ، اور بغیر کسی گفتگو کے ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے ۔ بعد میں کسی نے شیخ اکبر سے ، شیخ شہاب الدین سہروردی کے متعلق پوچھا تو فرمایا کہ : وہ ایک مرد ہے جو سراپا متّبعِ سنت ہے ۔ اسی قسم کا سوال جب شیخ اکبر کے متعلق حضرت شہاب الدین سہروردی سے کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ : وہ حقائق کے سمندر ہیں ۔[3]

---

۱ ۔ نفحات الانس (اُردو ترجمہ) ص ۵۸۳ ۔
۲ ۔ تاریخ مشائخ چشت ، ص ۱۱۱ ۔
۳ ۔ نفحات الانس (اُردو ترجمہ) ص ۵۸۱ ۔

شیخ علاء الدولہ سمنانی جو شیخ اکبر کے فلسفہ" وحدت الوجود" کے سخت مخالفین میں تھے، جن کا تذکرہ علامہ اقبال نے بھی اپنے ایک خط میں کیا ہے، جو ہم منصور کے حالات ضمن میں ذیلی حواشی میں نقل کر آئے ہیں ۔ لیکن باوجود اس مخالفت کے حضرت شیخ علاء الدولہ سمنانی شیخ اکبر کے بزرگی اور کمال کے مدّاح و معترف تھے ۔ انھوں نے شیخ اکبر کی کتاب فتوحات کے حاشیے پر ایک جگہ لکھا :

ایّھا الصدیق و ایّھا المقرب و ایّھا الولی و ایّھا المعارف الحقانی

(اے صدیق ، اے مقرب ، اے ولی ۔ اے عارفِ حقانی[۳]) :

وفات :

حضرت شیخ اکبر بروز جمعرات ۲۲ ربیع الآخر ۶۳۸ھ (۱۲۴۰ء) میں واصل الی اللہ ہوئے ، اور دمشق کے باہر کوہ قاسیون و حالیا میں جو موضع صالحیہ سے مشہور ہے مدفون ہوئے ۔[۱]

تصانیف :

شیخ اکبر کثیر التصانیف بزرگ تھے ، مولانا جامی نے نفحات الانس میں آن کی تصانیف کی تعداد پانسو سے زائد بتائی ہے ، شیخ اکبر نے بعض دوستوں کی فرمائش پر اپنے ایک رسالے میں اپنی تصانیف کی فہرست میں دو سو پچاس سے زیادہ کتابوں کے نام تحریر کیے ہیں، جن میں سے اکثر تصوف پر ہیں[۲]، پروفیسر خلیق احمد نظامی

---

(۱) نفحات الانس (اردو ترجمہ) ، ص ۵۹۲ ، نفحات الانس میں شیخ اکبر کی ولادت کی تاریخ ۱۷ رمضان ۵۶۰ھ (۱۱۶۵ء) مندرج ہے ۔

(۲) نفحات الانس (اردو ترجمہ) ص ۵۸۰-۵۸۱ ۔

نے اپنی کتاب تاریخ مشائخ چشت میں لکھا کہ : بر کلمان نے ان کی ڈیڑھ سو ایسی تصانیف کی فہرست دی ہے ، جو اب بھی دستیاب ہوتی ہیں[۲] ۔ لیکن شیخ اکبر کی جن کتابوں کو غیرمعمولی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی ، اور جن کو آج بھی صوفیائے کرام حرزِ جاں بنائے ہوئے ہیں ، اور جنھیں اُن کے نظریات و فکر کا آئینہ دار کہنا چاہیے ، وہ فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ ہیں ۔

فتوحات کے متعلق شیخ اکبر کا اظہار خیال :

نفحات الانس میں حضرت شیخ اکبر نے اپنی تصانیف پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کتابوں کی تصنیف میں میرا ارادہ دوسرے مصنفین کی طرح نہیں تھا ، بلکہ بعض تصانیف میں نے اس لیے کیں کہ خواب یا مکاشفے میں مجھے خدائے تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوتا تھا ۔

فتوحاتِ مکیہ کے متعلق فرماتے ہیں کہ جو حقائق و معارف قاری کے لیے بطور امانت درج کیے ہیں ، وہ اکثر خانہ کعبہ کے طواف کرنے کے وقت یا حرم شریف میں بحالت مراقبہ خدائے تعالیٰ نے مجھ پر کھولے ہیں ۔

فتوحاتِ مکیہ میں ایک اور جگہ تحریر فرمایا کہ : ہم پر اس کتاب کی تکمیل کے لیے خدائے تعالیٰ کا تاکیدی حکم وارد ہوا ، اس وجہ سے ہم اس کتاب کی تصنیف میں مشغول ہو گئے ۔

---

۱ ۔ تاریخ مشائخ چشت ص ۱۱۱ بحوالہ محی الدین ابن عربی از عفیفی ۔

اور دوسرے امور کے انجام دینے سے رک گئے ۔[1]

دائرہ معارف اسلامی میں ہے کہ یہ کتاب انھوں نے ۶۲۹ھ میں مکہ معظمہ میں تصنیف کی تھی ۔[2]

ہم نے شیخ محی الدین ابن عربی کے فلسفۂ وحدۃ الوجود ، آن کی زندگی ، اور حضرت مجدد الف ثانی کے فلسفۂ وحدۃ الشہود کے متعلق علامہ اقبال کی رائے کو گزشتہ اوراق میں مع تفصیل سے پیش کر دیا ہے ۔ ان دونوں میں سے ایک تصوف کا آفتاب ہے تو دوسرا اسلامی فکر و نظر ، شعر و ادب کا ماہتاب دونوں کے پاس دلائل و براہین ہیں ، دونوں خلوصِ نیت کے ساتھ اپنی اپنی راہ پر گامزن ہیں ، دونوں اپنے اپنے فلسفے میں حق کے متلاشی ہیں ، دونوں کا مقصد ایک اور جادے مختلف ہیں ۔

اس کے بعد ہم مولانا شاہ سلیمان پھلواری کے حالات زندگی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ۔

علامہ کا مولانا شاہ سلیمان کے متعلق تاثر :

علّامہ نے ایک خط میں جو ۹ مارچ ۱۹۱۶ء کو مولانا شاہ سلیمان علیہ الرحمہ کی خدمت میں بھیجا ، اس میں مولانا کے متعلق اپنے جذبات و تاثرات کو سموتے ہوئے لکھا کہ:

آپ کو اللہ تعالیٰ نے کمال روحانی کے ساتھ علم و فضل سے آراستہ کیا ہے ۔

---

(۱) تاریخ مشائخ چشت ، ص ۱۱۱-۱۱۲ بحوالہ فتوحات مکیہ ، ج ۱ ، ۹۸-۱۰۱ ۔

(۲) دائرہ معارف ، جلد : ۱ ، ص ۶۰۵ تا ۶۱۲ ۔

پھر اسی خط کے آخر میں لکھا :

آپ کے مکتوبات نہایت دلچسپ ہیں، اور حفاظت سے رکھنے کے قابل ، نہ کہ ردی کی ٹوکری میں ڈالنے کے قابل میں نے خود آن کو پڑھا ہے ، اور بیوی کو پڑھنے کے لیے دیا ہے ، یہ اعتراف ضرور کرتا ہوں کہ بعض بعض مقامات سے مجھے اختلاف ہے ، اور یہ سب مقامات مسئلہ وحدۃ الوجود سے تعلق رکھتے ہیں جب آپ اپنے مضمون میں زیادہ تشریح سے کام لیں گے تو ممکن ہے مجھے اختلاف نہ رہے[1]

حالات :

پاک و ہند کے نامور عالم و صوفی واعظ و خطیب مولانا شاہ سلیمان پھلواروی ، صوبہ بہار کے مشہور ضلع عظیم آباد پٹنہ کے ایک مردم خیز قصبے پھلواری میں ۱۲۷۶ھ (۶۰ - ۱۸۶۹ء) میں پیدا ہوئے -

اس وقت ہندوستان کی علمی دنیا جن چراغوں سے تابناک تھی، ان میں فرنگی محل لکھنؤ میں مولانا عبدالحی ، سہارنپور میں مولانا احمد علی اور دلی میں سید نذیر حسین محدث دہلوی علم کے وہ بحر ذخار تھے کہ تشنگان علم ان چشموں سے فیض یاب ہوتے تھے -

مولانا شاہ سلیمان پھلواروی علوم کے ان تینوں سرچشموں سے مستفیض ہوئے ، وہ پہلے فرنگی محل آئے ، یہاں سے فارغ ہو کر

---

(۱) انوار اقبال ۱۸۰ - ۱۸۲

سہارنپور اور دلی گئے ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰ء) میں ان تینوں درسگاہوں میں علوم ظاہر کی تکمیل کی -

لکھنؤ کے دوران قیام میں انھوں نے علومِ درسیہ کی تکمیل کے بعد طب کی بھی تکمیل کی ، اوز طبیب کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا ، اور شروع میں حکیم محمد سلیمان کے نام سے مشہور ہوئے - ...

شاعری سے ذوق رکھتے تھے ، اور لکھنؤ کے مشاعروں میں پڑھتے بھی تھے اپنے پیشے کے لحاظ سے اپنا تخلص ''حاذق'' رکھا تھا، مشہور عالم شاعر شوق نیموی کے ہمدرس تھے -

ملت کی تباہ حالی سے متاثر ہوکر چند بزرگوں نے مل کر ندوۃ العلماء کے نام سے پہلے کانپور میں پھر لکھنؤ میں ایک انجمن کی بنیاد ڈالی مولانا سید محمد علی ، علامہ شبلی ، مولانا عبدالحق حقانی ، سید ظہور الاسلام فتح پوری ، مولانا ابراہیم صاحب آروی ، اور مولانا شاہ سلیمان پھلواروی اس انجمن کے ممتاز اراکین میں تھے، اسی کے پلیٹ فارم سے مولانا کی خطیبانہ تقریروں کا شہرہ عام ہوا - دارالعلوم ندوہ کی بنیاد حضرت شاہ سلیمان پھلواروی کی تحریک و تجویز کا نتیجہ ہے -

مولانا کی خدمات :

رفتہ رفتہ مولانا کی خطیبانہ شہرت سے ہندوستان گونج اٹھا ، سرسید نے مولانا کی وہ تقریر جو انھوں نے ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس میں کی تھی، اپنے اخبار میں ''شاہ سلیمان کا نیچریانہ وعظ'' کی سرخی سے چھاپی -

مولانا شاہ سلیمان نے صوفیانہ ماحول میں آنکھیں کھولیں ، وہ صوفیہ کی گودوں میں پلے اور بڑھے ، اور خود بھی علم و فضل کے ساتھ ایک باعمل صوفی اور درویش تھے ، تصوف کا رنگ اُن پر سب سے زیادہ غالب تھا ، وہ سلسلۂ قادریہ اور چشتیہ کے مرید و خلیفہ تھے ۔ انھوں اپنے خاندان سے بھی فیوض باطنی حاصل کیے تھے ۔ اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی علیہ الرحمہ سے بھی نسبت رکھتے تھے ، ان کے مریدوں اور عقیدت مندوں کی تعداد کثیر تھی ، جو پنجاب ، مدراس ، شمالی بہار اور صوبۂ متحدہ میں پھیلے ہوئے تھے ۔

مولانا کے مواعظ و ارشادات اثر و تاثیر کا ایک گنجینہ ہوتے تھے ، نہایت خوش الحان تھے ، مثنوی مولانا روم اس خاص انداز سے پڑھتے کہ سننے والے جھوم جھوم جاتے تھے ۔

طباعی اور ذہانت میں اپنا جواب نہ رکھتے ، علامہ سلیمان ندوی علیہ الرحمہ کا بیان ہے کہ ۱۹۱۵ء میں ندوہ کے ایک جلسے چار سلیمان اتفاق سے جمع ہوگئے تھے : قاضی محمد سلیمان منصور پوری مصنفِ رحمۃ اللعالمین ، مولانا سلیمان اشرف (استاد دینیات مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ) مونا شاہ سلیمان پھلواروی اور میں ، اس موقع پر مولانا شاہ سلیمان پھلواروی نے برجستہ فرمایا کہ آج کل کئی کئی سلیمان پیدا ہوگئے ہیں ، لیکن ان میں سلیمان بن داؤد میں ہوں۔ع

پریاں نئی نئی ہیں سلیماں نئے نئے

حضرت شاہ سلیمان پھلواروی کے والد ماجد کا نام داؤد تھا ، اور اسی لیے ان کی مہر میں " و ورث سلیمان داؤد " کندہ تھا ،

یہ سن کر مجمع بے اختیار ہنس پڑا پھر فرمایا پہلے سلیمان فرد تھا ، اب رباعی ہے ۔ چار چار سلیمان یک جا ہیں ۔

افسوس ہے کہ آج علم و عمل کے یہ چاروں آفتاب غروب ہوچکے ۔ اب نہ رباعی ہے ، نہ قطعہ اور نہ فرد ۔ واللہ ھو الباقی ،

حضرت شاہ صاحب کے تقریروں میں دل آویز نکتے بڑی گرمی محفل پیدا کردیتے تھے ، رنگوں میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں جب کہ بعض مولویوں نے کانفرنس والوں پر کفر کا فتویٰ لگادیا تھا ، نواب محسن الملک (جن کا نام مہدی علی تھا) وہ بھی حضرت شاہ صاحب کے ساتھ تھے ۔ جلسے میں تقریر کرتے ہوئے حضرت شاہ صاحب نے فرمایا : یہاں کے بعض مولویوں نے اہل کانفرنس پر کفر کا فتویٰ لگایا ہے ، جس میں شاید میں بھی داخل ہوں ، مگر غور تو کیجے کہ نواب محسن الملک تو مہدی ہیں (نام مہدی علی تھا) ان کو کون مسلمان دجال کہے گا ، اور مجھ پر تو کفر کا فتویٰ لگ ہی نہیں سکتا کہ خود اللہ تعالیٰ کی شہادت ہے : وما کفر سلیمان ولٰکن الشیٰطین کفروا (سلیمان علیہ السلام نے کفر نہیں کیا بلکہ شیطانوں نے کفر کیا[1]

اُن کے صاحب علم و فضل پوتے محب محترم مولانا حسن مثنیٰ ندوی نے سہ ماہی العلم کراچی جنوری ۱۹۵۲ء میں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی کے مجلے میں حضرت شاہ سلیمان پھلواروی کے حالات زندگی قلم بند کرتے ہوئے لکھا کہ :

حضرت مولانا شاہ سلیمان پھلواروی اپنے عہد میں ایک امتیازی

(۱) یاد رفتگاں (علامہ سید سلیمان ندوی) ص ۱۷۹ تا ۱۸۲

حیثیت اور غیر معمولی جامعیت کے قدسی نفس بزرگ شریعت وطریقت
کے امام اور اسلامی سیاست کے مقتدر رہنما ، سحرالبیان خطیب اور
بذلہ سنج ادیب تھے ، ان کی ساری زندگی قوم و ملت کی تعمیر میں
صرف ہوئی ، اور پچاس ساٹھ سال تک اس برصغیر کا گوشہ گوشہ
ان کے دل گداز پند و نصائح سے گونجتا رہا

یہ حکیم شاہ محمد محبوب عالم کے پوتے تھے ۔ جن کا مقصد
حیات ہی اعلاءِ کلمۃ اللہ تھا اور حکیم مولانا شاہ محمد داؤد آن کے
والد محترم تھے ، جو فیض آباد شہر کے طبیب تھے - ۱۸۵۷ء کی
جنگ آزادی کے زمانے میں جب کہ فرنگی استبداد شمع حق کے
پروانوں کو کچل رہا تھا ، مولانا حکیم شاہ محمد داؤد بھی رو پوش
ہوتے ہوئے پھلواری پہنچے ، یہیں ۱۲ محرم سنہ ھ کو شاہ سلیمان
پھلواروی کی ولادت باسعادت ہوئی ۔

انہوں نے جن اہم علمی مرکزوں میں تعلیم پائی ، ان کا
تذکرہ ہم پہلے کرچکے ہیں ۔ علوم ظاہری سے فراغت حاصل کرنے
کے بعد ، وہ علم طریقت کی طرف متوجہ ہوئے ۔ مولانا حسن مثنیٰ
ندوی نے لکھا کہ پہلے وہ اپنے خسر اور پیر و مرشد مصباح الطالبین
حضرت مولانا شاہ علی حبیب نصر پھلواروی سے ۔ پھر شیخ زمانہ
حضرت مولانا شاہ فضل رحمان گنج مراد آبادی سے ، اور بعد میں
قطب عالم حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے جب کہ ۱۳۰۴ھ میں
حج کے لیے گئے تو اجازت و خلافت سے سرفراز ہوئے ، اجازت
و خلافت حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادی سے بھی
حاصل تھی ۔

حضرت شاہ سلیمان نے جو علمی ملی اور سیاسی خدمات انجام دیں ؛ ان کی تفصیل دیتے ہوئے ان کے دانشور پوتے مولانا حسن مثنیٰ نے لکھا کہ : جب حج سے واپس آئے تو ایک ولولہ تازہ ساتھ لے کر آئے ، حضرت قبلہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے آن سے فرمایا کہ تذکیہ (وعظ و نصیحت) کیا کرو۔ چنانچہ مرشد کے اس حکم کی تعمیل میں انھوں نے اللہ کا نام لے کر پوری توانائیوں کے ساتھ وعظ و نصیحت کا باقاعدہ سلسلہ شروع کیا ، وہ اپنی بے مثال خطابت اور روح پرور وعظ گوئی کے اعتبار سے سارے برصغیر ہند میں یگانہ عصر تھے اسی تذکیر سے انھوں نے مجلس اندوہ العلماء کی بنیاد رکھی ۔ اسی تحریک نے علماء و مشائخ کو آن کی خلوتوں سے از سر نو نکال نکال کر خدمتِ قوم و ملت کی جلوتوں میں پہنچا دیا ، ہر طرف سے تعلیم تعلیم! تعمیر تعمیر کی آواز آنے لگی ۔

شاہ صاحب نے فقہ اسلامی کی تدوین جدید کی ضرورت کی طرف بھی توجہ دلائی ۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سر سید کی وہ تعلیمی تحریک تھی ، جو ۱۸۸۶ء میں قائم ہوئی تھی ، اس کانفرنس کی مقبولیت کا ایک بڑا ذریعہ مولانا کے مواعظ ہی ہوا کرتے تھے کوئی وفد خواہ ندوہ کا ہو ، یا کانفرنس اور گڑھ کا ایسا نہ ہوتا تھا کہ جس میں شاہ صاحب کی شرکت لازمی نہ سمجھی جاتی ہو ۔

حضرت شاہ صاحب عالم و صوفی اور رہنمائے ملت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ماہر تعلیم بھی تھے وہ کلکتہ یونی ورسٹی سینٹ کے رکن تھے ۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ کی مدرسہ کمیٹی اور نصاب کمیٹی

کے بھی رکن ، ڈھاکہ یونی ورسٹی قائم کرنے کی جدوجہد میں نواب سلیم اللہ کے معین و مددگار رہے -

اس دور کی اسلامی سیاست میں انھوں نے نمایاں حصہ لیا ، ان کی سیاسی زندگی کا عظیم مقصد وجودِ ملی کی حفاظت و بقا اور اسلام کی سربلندی کے لیے جدوجہد تھا آل انڈیا مسلم لیگ قائم ہوئی تو وہ اس کے ساتھ تھے ، خلافت کی تحریک چلی تو انھوں نے اس تحریک میں نمایاں خدمات انجام، جمعیۃ العلماء سب سے پہلے صوبہ بہار میں ان ہی کی صدارت میں قائم ہوئی - خلافت کمیٹی نے جب ترک موالات کا فیصلہ کیا تو شاہ صاحب نے ترکِ موالات کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا -

حضرت شاہ صاحب نے صوفیہ اور مشائخ زادوں کی اصلاح کی فکر کی طرف بھی توجہ کی ، وہ ان کو رسومات واہیہ سے نکال کر قوم و ملت کے لیے مفید سے مفید تر بنانا چاہتے تھے -

علامہ اقبال نے ۱۹۱٦ء میں جب تصوفِ اسلامیہ کی تاریخ لکھنی شروع کی اور قدیم و جدید محققین کی کتابیں پڑھیں ، شکوک و شبہات کا ایک انبار ان کے ذہن و فکر میں جمع ہوگیا ، اور وحدۃ الوجود کے بارے میں تفصیلی اور حقیقی معلومات درکار ہوئیں، تو انھوں نے بھی شاہ صاحب سے خط و کتابت کی ، اور اپنی مثنوی پر رائے مانگی -

مختصر یہ کہ حضرت شاہ صاحب کی ذات گرامی بجائے خود ایک ادارۂ طریقت اور درسگاہِ تصوف تھی ، نصف سے زیادہ

عرصے تک آنھوں نے خدمت و تعمیر ملت میں ہمہ تن مصروف و منہمک رہ کر عملاً اس کو ثابت کردیا کہ :

بزرگی بہ از خدمتِ خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و خلق نیست

۲۷ صفر ۱۳۵۴ھ (۳۱ مئی ۱۹۳۵ء) کو جمعہ کے دن صبح کی نماز کے وقت حضرت شاہ سلیمان پھلواروی واصل الی اللہ ہوئے[۱] -

(۱) ہم العلم جنوری ۱۹۵۲ء ص ۸۸ تا ۹۹ ان معلومات میں محب محترم جناب سید الطاف علی صاحب بریلوی سکریٹری آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی کے شکر گزار ہیں ، جنھوں نے ہماری رہبری کی ، اور مولانا حسن مثنیٰ ندوی کے اس علمانہ مضمون کی طرف توجہ مبذول کرائی - (مؤلف)

۳۰

حضرت سید پیر مہر علی شاہ گولڑوی رح

علامہ اقبال کی عقیدت :

علامہ اقبال حضرت سید پیر مہر مہر علی شاہ گولڑوی کے تبحر علمی اور بصیرت روحانی کے بے حد مداح و معترف تھے - ایک خط میں جو حضرت سید پیر مہر علی شاہ کے نام علامہ نے تحریر کیا ہے جسے ہم آیندہ اوراق مکمل نقل کریں گے ، اس خط سے اس گہری عقیدت کا پتا چلتا ہے جو علامہ کو آپ سے تھی-

حالات :

حضرت پیر سید مہر علی شاہ کے والد محترم کا نام سید نذرالدین شاہ تھا ، آپ کا سلسلہ نسب چوبیسویں پشت میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رح سے جا ملتا ہے -

سلسلۂ نسب :

مہر علی شاہ ، بن سید نذر الدین ، بن سید پیر غلام شاہ بن سید روشن دین ، بن سید عبدالرحمٰن ، بن سید عنایت اللہ ، سید عنایت علی ، بن سید فتح اللہ ، بن سید

اسد اللہ ، بن سید فخر الدین ، بن سید احسان ، بن سید درگاہی ، بن سید جمال علی ، بن سید محمد جمال ، بن سید ابی محمد ، بن میراں سید محمد کلاں ، بن میراں شاہ قادر — بن السید ابی الحسنات ، بن سید التاج ، بن سید بہاء الدین ، بن سید جلال الدین ، بن سید داؤد ، بن سید علی ، بن سید ابی صالح نصر ، بن سید عبدالرزاق ، بن شیخ سید عبدالقادر جیلانی بغدادی الحسنی آباً و الحسینی اُماً[۱] ۔

آپ کے اجداد میں حضرت شاہ قمیض (یا کمبض) ہندوستان تشریف لائے ، اور حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ سے ملاقات کی ، اور ساڈہورے میں مقیم ہوگئے ، اور وہیں وفات پائی ، حضرت شاہ قمبض کے دو صاحبزادے تھے ، وہ گولڑہ تشریف لے آئے ، ان میں سے ایک نے شادی نہ کی ، دوسرے صاحبزادے کا سلسلہ اب تک چلا آرہا ہے ، حضرت خواجہ مہر علی شاہ ان ہی کی اولاد میں ہیں ، حضرت سید پیر مہر علی شاہ یکم رمضان ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۹ء) میں پیدا ہوئے[۱] ۔

بیعت :

پیر سید مہر علی شاہ نے خواجہ شمس الدین سیالوی[۲] کے دست حق پرست پر بیعت ہوکر خلافت حاصل کی ۔

---

۱ ۔ انوار الاصفیاء (ناشر شیخ غلام علی ۔ لاہور) ، ص ۶۰۳ ۔

۲ ۔ خواجہ شمس الدین سیالوی : حضرت سلیمان تونسوی کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۴۳ پر)

سفر حجاز :

اس کے بعد آپ حجاز چلے گئے ، مکہ معظمہ میں ایک دن حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کی خدمت میں حاضر ہوئے دوران ملاقات حاجی صاحب نے آپ کو ہندوستان جانے کا مشورہ دیتے ہوئے فرمایا

در ہندوستان عنقریب یک فتنہ ظہور کند ، در ملک خود

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

جلیل القدر خلفاء میں تھے - یہ ۱۲۱۰ھ کو سیال میں پیدا ہوئے تعلیم و تربیت اپنے ماموں میاں احمد الدین اور مکھڈ میں مولوی علی محمد کے ساتھ حضرت شاہ سلیمان تونسوی کی خدمت میں حاضر ہوکر ان سے بعیت کی اور خرقہ خلافت سے سرفراز ہوئے ، خواجہ سیالوی نے ۲۱ صفر ۱۳۰۰ھ (۱۸۸۲ء) میں وفات پائی - (تذکرہ صوفیائے پنجاب - تالیف اعجاز الحق قدوسی ص ۳۵۷ — ۳۶۰ بحوالہ تاریخ مشائخ چشت) -

۲ - حاجی امداد اللہ : بن حاجی محمد امین ، اپنے ننہالی قصبے نانوتہ ضلع سہارنپور میں ۲۶ صفر ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۵ء) کو پیدا ہوئے ، ان کا آبائی وطن قصبہ تھانہ بھون تھا ، حاجی صاحب نے پہلے مولوی نصیر الدین دہلوی کے ہاتھ پر بیعت کی ، اس کے بعد مشہور بزرگ میاں جی نور محمد جھنجھانوی کے ہاتھ پر بیعت ہوئے ، ۱۲۷۶ھ (۱۸۵۹ء) مکہ معظمہ ہجرت کر گئے ، اور جمادی الاخریٰ ۱۳۱۷ھ (۱۸۹۹ء) میں وہیں وفات پائی - (فٹ نوٹ تذکرہ علمائے ہند ، ص ۱۲۳) -

واپس بروید ۔ و اگر بالفرض شما در ہند خاموش نشستہ باشید ۔ تاہم آں فتنہ ترقی نکند ، و در ملک آرام ظاہر شود ۔

(ترجمہ)

ہندوستان میں عنقریب ایک فتنہ ظاہر ہوگا تمھیں چاہیے کہ اپنے ملک واپس چلے جاؤ اور اگر تم بالفرض ہندوستان میں خاموش بھی رہو گے تو وہ فتنہ ترقی نہ کرے گا ، اور ملک میں سکون رہے گا ۔

چنانچہ آپ حضرت حاجی صاحب کے ارشاد پر ہندوستان واپس آئے ، اور یہاں آنے کے بعد رشد و ہدایت اور علمی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے ۔

اپنے تبحر علمی کی بدولت حضرت پیر سید مہر علی شاہ صاحب پنجاب کے ممتاز علماء اور جلیل القدر صوفیہ میں شمار ہوتے تھے ، آپ کی وسعت نظر اور تبحر علمی اور وسعت معلومات کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ علّامہ اقبال جیسے یگانہ روزگار اسلامی مفکر و شاعر مشکل علمی مسائل میں آپ سے استفادہ کرتے تھے۔ شیخ محی الدین ابن عربی نظریہ ''وحدت الوجود'' پر اس قدر عبور حاصل تھا کہ جس کی نظیر اس صدی میں نہیں ملتی ، ابن العربی کی مشہور اور مشکل کتاب فصوص الحکم کا باقاعدہ درس دیتے تھے ۔ علامہ اقبال آن کے تبحر علمی سے بے حد متاثر تھے ۔

علامہ اقبال کا استفادہ :

ایک خط میں علامہ اقبال حضرت پیر مہر علی شاہ کو لکھتے ہیں :

لاہور : ۸ اگست ۱۹۳۳ -

مخدوم و مکرم حضرت قبلہ ۔ السلام علیکم

اگرچہ زیارت اور استفادے کا شوق ایک مدت سے ہے - تاہم اس سے پہلے شرف نیاز حاصل نہیں ہوا ۔ اب اس محرومی کی تلافی اس عریضے سے کرتا ہوں ، گو مجھے اندیشہ ہے کہ اس خط کا جواب لکھنے یا لکھوانے میں جناب کو زحمت ہوگی ، بہر حال جناب کی وسعتِ اخلاق پر بھروسہ کرتے ہوئے یہ چند سطور لکھنے کی جرأت کرتا ہوں ، کہ اس وقت ہندوستان بھر میں کوئی اور دروازہ نہیں جو پیش نظر مقصد کے لئے کھٹکھٹایا جائے ۔۔

میں نے گزشتہ سال انگلستان میں حضرت مجدد الف ثانی پر ایک تقریر کی تھی ، جو وہاں کے ادا شناس لوگوں میں بہت مقبول ہوئی ، اب پھر آدھر جانے کا قصد ہے ، اور اس سفر میں حضرت محی الدین ابن عربی پر کچھ کہنے کا ارادہ ہے ، نظر بایں حال چند امور دریافت طلب ہیں ، جناب کے اخلاق کریمانہ سے بعید نہ ہوگا ، اگر ان سوالات کا جواب شافی مرحمت فرمایا جائے ۔۔

(۱) اول یہ کہ حضرت شیخ اکبر نے "تعلیم حقیقت زماں" کے متعلق کیا کہا ہے ، اور ائمہ متکلمین سے کہاں تک مختلف ہے -

(۲) یہ تعلیم شیخ اکبر کی کون کون سی کتب میں پائی جاتی ہے ، اور کہاں کہاں ، اس سوال کا مقصود یہ ہے کہ سوال اول کے جواب کی روشنی میں خود بھی ان مقامات کا مطالعہ کر سکوں ۔

(۳) حضرات صوفیہ میں اگر کسی بزرگ نے بھی حقیقت زمان پر بحث کی ہو تو ان بزرگ کے ارشادات کے نشان بھی مطلوب ہیں ۔ مولوی سید انور شاہ[1] مرحوم و مغفور نے مجھے عراقی کا ایک رسالہ مرحمت فرمایا تھا ، اس کا نام تھا ''درایۃ الزمان'' جناب کو اس کا علم ضرور ہوگا ۔ میں نے یہ رسالہ دیکھا ہے ، مگر چونکہ یہ رسالہ بہت مختصر ہے ، اس لیے مزید روشنی کی ضرورت ہے ۔

میں نے سنا ہے جناب نے درس و تدریس کا سلسلہ ترک فرمادیا ہے ، اس لیے مجھے یہ عریضہ لکھنے میں تامل تھا ، لیکن چونکہ مقصود خدمتِ اسلام ہے ، مجھے یقین ہے کہ اس تصدیعہ کے لئے جناب معاف فرمائیں گے ، اور جواب باصواب سے ممنون فرمائیں گے۔[1]

مخلص

محمد اقبال

---

۱ ۔ مولانا سید انور شاہ : جانشین حضرت مولانا شیخ الہند ، وسعتِ نظر ، قوتِ حافظہ ، اور کثرتِ حفظ میں اپنی مثال نہ رکھتے تھے ، علوم ادب میں بلند پایہ ، معقولات میں ماہر اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۴۷ پر)

حضرت پیر سید مہر علی شاہ کو حضرت شاہ ولی اللہ[2] سے بے حد عقیدت تھی ، ایک جگہ وہ حضرت شاہ ولی اللہ سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں

کمالات شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی مرحوم بحد غایت کمال رسیدہ اند ، در علم ظاہر و باطن نظیر خود گزاشتہ اند

(ترجمہ)

شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی مرحوم کمال کی اس انتہا کو پہنچے ہوئے ہیں کہ علم ظاہر و باطن میں وہ اپنی نظیر آپ ہی تھے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

زہد و تقویٰ میں کامل تھے ، معلومات کے ایک بحر بے پایاں ، حافظے کے بادشاہ ، علوم کے گنج گراں مایہ تھے ۔ مشہور دینی درس گاہ دارالعلوم دیو بند و ڈابھیل کے مدتوں شیخ الحدیث رہے ، ۳ صفر ۱۳۵۲ھ (۲۹ مئی ۱۹۳۳ء) کو حضرت مولانا انور شاہ صاحب نے وفات پائی (یاد رفتگاں ، ص ۸۶۹) ۔

۱ ۔ اقبال نامہ ، حصہ اول (مرتبہ شیخ عطاء اللہ ایم ۔ اے ، ناشر محمد اشرف ، ص ۳۳۲ ۔ ۳۳۴ ۔

۲ ۔ شاہ ولی اللہ : بن شاہ عبدالرحیم بن شیخ وجیہہ الدین کا نام قطب الدین احمد شاہ تھا ۔ وہ ۱۱۱۴ھ (۱۷۰۳ء) میں عالمگیر کے دور حکومت میں پیدا ہوئے ، اور پندرہ سال کی عمر میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۴۸ پر)

حضرت پیر سید مہر علی شاہ کے ملفوظات ، ''ملفوظات طیبہ'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں ، یہ ملفوظات اور ارشادات آن کے تبحر علمی ، وسعت نظر اور اصلاح معاشرے کی جد وجہد کے آئینہ دار ہیں ۔ انھوں نے اپنی تعلیمات میں اتباع سنت پر خاص طور پر زور دیا ہے ، فرمایا کہ اتباعِ رسول ؐ سے بڑھ کر ایک مسلمان کے لیے اور کوئی فخر نہیں ہو سکتا ۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

اپنے والد سے سلسلۂ نقشبندیہ میں بیعت ہو کر خرقۂ خلافت اور علمی فراغت کی سند حاصل کی ۔ سترہ سال کی عمر میں اپنے والد کی وفات کے بعد آن کی جگہ مدرسہ رحیمیہ کی مسند صدارت کو زینت بخشی ۔ ۱۱۴۳ھ (۱۷۳۰ء) میں حرمین شریفین حاضر ہوئے اور دو سال تک وہاں کے مختلف شیوخ سے ، جن میں شیخ ابی طاہر محمد کردی مدنی ، اور شیخ ابو طاہر مکی سے مختلف کتابیں پڑھیں ۔ ۱۱۴۵ھ (۳۳ - ۱۷۳۲ء) ہندوستان واپس تشریف لائے ۔ ۱۱۷۶ھ (۱۷۶۲ء) حضرت شاہ ولی اللہ نے دہلی میں وفات پائی ۔ آپ کے چاروں صاحبزادے مولانا شاہ عبدالعزیز ، مولانا رفیع الدین ، مولانا عبدالقادر اور مولانا عبدالغنی یہ سب کے سب اپنے والد محترم کے صیح جانشین اور علم و عمل کا روشن مینار تھے (نزہتہ الخواطر ، ج ۶ ، ص ۳۹۸ - رود کوثر ، ص ۵۱۸ ۔ تذکرہ علمائے ہند ، ص ۵۴۲ - ۵۴۳) ۔

شاعری :

کبھی کبھی فارسی اور پنجابی شعر بھی فرماتے تھے ۔ شاعری میں مہر تخلص کرتے تھے ، ہم آپ کے چند شعر یہاں تبرکاً نقل کرتے ہیں :

صبا ز طرۂ شب مہوشِ طنّاز
کشید نافۂ مشکین بروئے اہل نیاز
رہینِ ساقی چشمے کہ جرعہ بخشاند
ز جام چہرۂ ترکانِ مہوشانِ حجاز
بہ بزم بادہ فروشاں بہ نیم جو نہ خرند
متاع زاہدِ طمّاع چہ حج و صوم و نماز
مرا زپیرِ مغاں راز ہائے سربستہ است
فغاں ز واعظِ خود کجاست محرمِ راز

اگرچہ حسنِ تو از مہر غیر مستغنی مت
من آں نیم کہ از خویش آیم باز[1]

شعر و ناب میں جناب غلام نظام الدین مرولوی نے حضرت پیر مہر علی شاہ کے چند پنجابی اشعار دیتے ہوئے ، آن کے پنجابی کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ :

پیر صاحب کی زبان ہمارے معاصر پنجابی روزمرہ کے

---

۱ ۔ حضرت پیر سید مہر علی شاہ کے یہ تمام حالات تاریخ مشائخ چشت ۔ تالیف پروفیسر خلیق احمد نظامی ۔ ص ۲۱۳-۲۱۷ سے ماخوذ ہیں ۔

زیادہ قریب ہے ، اس لیے پیر صاحب کی کافیاں زود فہم اور زیادہ مانوس ہیں ۔ پیر صاحب کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے حقیقت اور مجاز کے درمیان ایک خوشگوار توازن قائم رکھا ، اس لیے ان کے ہاں عوامی مقبولیت کے درخشندہ امکانات ہیں لیکن افسوس ہے کہ اُن کی کافیوں کے شایانِ شان اشاعت پر چند برس کوئی توجہ نہیں دی گئی ۔

شعر ناب سے ہم اُن کے چند پنجابی اشعار تبرکاً یہاں نقل کرتے ہیں :

اَج سیک متراندی ودھیری اے
کیوں ولڑی اداس گھنیری اے
لوں لوں وچ شوق چنگیری اے

اَج نیناں لائیاں کیوں جھڑیاں

مکھ چند بدر شعشانی اے
متھے چمکے لاٹ نورانی اے
کالی زلف تے اکھ مستانی اے

مخمور اکھیں مد بھریاں

اِس صورت نوں جان آکھاں
جاناں کہ جانِ جہان آکھاں
سچ آکھاں تے رب دی شان آکھاں

جس شان توں شاناں سب بنیاں

سبحان الله ما اجملک
ما احسنک ما اکملک
کتھے مہر علی، کتھے تیری ثنا
گستاخ اکھیں کتھے جا اڑیاں

وفات:

حضرت پیر مہر علی شاہ ۲۹ صفر ۱۳۵۶ھ (۱۱ مئی ۱۹۳۷ء) کو بمقام گولڑہ (ضلع راولپنڈی) واصل الی اللہ ہوئے، اور اپنے والد محترم کے مزار کے پاس مدفون ہوئے

آپ کا مزار مبارک گولڑہ میں ریلوے اسٹیشن سے قریباً دو میل کے فاصلے پر ہے، ۲۹ صفر کو آپ کا سالانہ عرس بڑی دہوم سے منایا جاتا ہے

صاحبِ تصانیف تھے، آپ کی تصانیف میں تحقیق الحق فی کلمۃ الحق، الاصلاح الفتح لاعجاز المسیح معروف بہ سیفِ چشتیائی، شمس الہدایہ، اعلاء کلمۃ اللہ فی بیان وما اھل بہ بغیر اللہ، عجابہ ان کے علاوہ آپ کے مکتوبات طیبات اور ملفوظات مشہور ہیں[۲]۔

---

(۱) یہ تمام تفصیل شعر ناب (تالیف جناب غلام نظام الدین مرولوی)۔ مطبوعہ مکتبہ معظمیہ ۔ لاہور۔ ص ۔ ۱۶ تا ۱۶۲۔ (۲) انوارالاصفیاء، ص ۔ ۶۰۶ ۔ سے ماخوذ ہے۔

ضمیمہ

اقبال کے محبوب صوفیہ کا بڑا حصہ چھپ چکا تھا کہ ہمارے عزیز دوست جناب مدبر رضوی نے ہمیں حضرت حارث محاسبی کے حالات کی طرف توجہ دلائی ، اور شاعر مشرق علامہ اقبال کے ایک خط کا اقبال نامہ سے حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ علامہ حضرت حارث ابن اسد المحاسبی کی عظمت تصوف کے بڑے مداح و معرف تھے ۔ چنانچہ ان کے توجہ دلانے پر جب میں نے اس خط کو پڑھا جو ڈاکٹر ظفرالحسن کے نام ہے تو اپنی کوتاہی اور سہو پر افسوس ہوا ، میں اپنے قارئین سے معذرت خواہ ہوں کہ میرے سہو کے سبب یہ تذکرہ اپنی جگہ پر نہ آسکا ، لیکن حضرت حارث محاسبی کی عظمت بزرگانہ کا تقاضا یہ ہے کہ میں ان کے حالات کو بطور ضمیمہ شریک کروں ۔

و العذر عند کرام الناس مقبول

چنانچہ میں تصوف اسلامی کے گوہر گراں مایہ حضرت حارث بن اسد المحاسبی کے حالات کو بطور ضمیمہ شریک کر رہا ہوں ، کہ حضرت حارث بن اسد المحاسبی کے حالات کے بغیر علامہ اقبال کے محبوب صوفیہ کی جو بزم میں نے سجائی ہے ۔ وہ نامکمل رہی جاتی ہے ۔

حضرت حارث بن اسد محاسبی[7]

حالات :

حضرت حارث بن اسد محاسبی کا شمار طبقۂ اول کے صوفیہ میں ہوتا ہے آن کے علم و فضل معرفت ، و تصوف کے اکابر رجال مداح و معرف و معترف نظر آتے ہیں ، صاحب کو اکب دریہ نے حضرت محاسبی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا :

> تمیمی کہتے ہیں فقہ و حدیث اور کلام و تصوف میں وہ مسلمانوں کے امام ہیں[1] ۔

ابن خلکان نے آن کو حقیقت و معرفت کے واقف کار ، علم ظاہر و باطن کے جامع بتایا ہے ۔[2]

ابو القاسم قشیری نے تصوف میں آن کے بلندی مرتبہ کو بیان کرتے ہوئے حضرت عبد اللہ بن حنیف کا یہ قول نقل کیا ہے کہ :

> عبد اللہ بن حنیف فرماتے تھے کہ ہمارے شیوخ میں پانچ کی اقتدا کرو ، اور باقیوں کے احوال خود آن کے حوالے کرو (۱) حارث بن اسد محاسبی (۲) جنید بن محمد بغدادی

---

(۱) رسالہ معارف ، نمبر ۹ ، جلد ۱۰۰ دسمبر ۱۹۶۷ء ص ۴۰۵ مقالہ مولانا سعید احمد پالنپوری بحوالہ کو اکب الدریہ فی تذکرۃ الصوفیہ ، جلد ۱ - ص ۲۱۸

(۲) رسالہ معارف ، دسمبر ۱۹۶۷ء مضمون مولانا احمد سعید پالن پوری ، ص ۴۰۵ بحوالہ وفیات الاعیان ، جلد ۱ - ص ۳۴۰

(۳) ابو محمد ردیم (۴) ابو العباس بن عطا (۵) عمرو بن عثمان[1]

شیخ عبدالفتاح ابو غدہ (مقیم حلب) ان کے حالات کے ضمن میں ، آن کے اوصاف و محامد کے متعلق رقم طراز ہیں :

امام عارف ، علوم حکمت و معرفت میں رطب اللسان ، تقویٰ و تقدس ، علم و عمل ، معاملات و حالات میں عدیم النظیر ، زہد و عبادت ، پند و مواعظ میں بے مثال ، فقیہ و متکلم اور خطابت میں فرد تھے[2]

علامہ اقبال کا تاثر :

علامہ اقبال نے آن کی عظمت علمی ، اور شان تصوف سے متاثر ہو کر ڈاکٹر ظفر الحسن کو ایک خط میں ۱۳ دسمبر ۱۹۳۵ء کو لکھا کہ :

آپ کے شاگرد رشید محمد عمر الدین صاحب نے کچھ عرصہ گزرا مجھے الغزالی پر ایک چھوٹی سی کتاب ارسال فرمائی تھی ، آن سے کہیے کہ وہ مارگیرڈ سمتھ کی کتاب ("An Early Mystic of Baghdad") حارث ابن اسد المحاسبی کا جو چند ماہ قبل شائع ہوئی مطالعہ کریں آنھیں چاہیے کہ اس کتاب کا ایک ایک

---

(۱) رسالہ قشیریہ ص ۱۵

(۲) رسالہ معارف دسمبر- ۱۹۶۷ء ص ۵ ۳

(۲) اقبال نامہ ، جلد اول - ص ۶۸ - ۶۹

لفظ نہایت غور سے پڑھیں ، اس کتاب سے انھیں نہ
صرف غزالی کی تعلیمات کے سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی،
بلکہ غزالی کی مدد سے مشرق و مغرب کے یہودی
اور عیسائی تصوف پر محاسبی کے اثرات کا بھی معقول
اندازہ ہوسکے گا ۔ امید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا ۔

حضرت حارث محاسبی کی کنیت ابو عبداللہ ، تھی حارث
بن اسد بصرے میں پیدا ہوئے ، لیکن بغداد میں سکونت اختیار کی ،
اور وہیں وفات پائی علوم و فنون میں غیر معمولی تبحر حاصل کیا ،
آن کے اساتذہ میں یزید بن ہارون اور اس طبقے کے محدثین ہیں ،
آن کے شاگردوں میں ابو العباس بن مسروق ۔ احمد بن حسن
بن عبدالجبار، جنید بغدادی ، اسماعیل بن اسحاق سراج، ابوعلی حسین
بن خیران ، احمد بن قاسم بن نصر ، احمد بن عبداللہ سیمون
وغیرہ ہیں ۔

تحصیل علم کے بعد وہ تصنیف و تالیف میں مشغول ہوگئے ۔
آن کا موضوعِ تصنیف اخلاقیات ، زہد و تصوف ، ردِ بدعات
و عقائدِ باطلہ تھا ، ان کی تصانیف میں کتاب الرعایہ، کتاب التوہم ۔
رسالہ المسترشدین مشہور ہیں ۔ حضرت محاسبی کی تمام تصانیف
معیاری ہیں ۔ اور آن کی تصانیف آن کے بعد آنے والے مصنفین کے لیے
نشان راہ ہیں ۔

حضرت امام غزالی نے احیاء العلوم میں آن کی تالیفی و تصنیفی
زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے میں لکھا :

المحاسبی خیر الامۃ فی علم المعاملۃ ولہ السبق علی

جمیع الباحثین عن عیوب النفس و آفات الاعمال و اغوا
العبادات و کلاسه

(ترجمہ)

محاسبی علم المعاملہ میں خیرالامت ہیں ، نفسانی عیوب ،
نقائص اعمال اور عبادات میں جو خرابیاں پیدا ہوتی
ہیں ، اُن پر جن لوگوں نے لکھا ہے ان سب پر محاسبی
سبقت لے گئے ہیں -

حضرت امام غزالی کی تصانیف پر محاسبی کا بڑا اثر ہے ، اور
اپنی تصنیفات میں وہ اُن کے خوشہ چیں ہے - علامہ زاہد کوثری
نے لکھا کہ :

محاسبی کا امام غزالی پر بڑا اثر پڑا ہے
انہوں نے محاسبی کی کتاب الرعایا کو ،
اپنی کتاب احیاء العلوم میں چھپا لیا ہے !

حافظ ابو نعیم اصفہانی نے اُن کے متعلق اپنے تذکرے
حلیہ" الاولیا میں لکھا کہ :

جنید بغدادی فرماتے ہیں کہ حارث محاسبی میرے گھر
آتے ، اور مجھ سے فرماتے آؤ ذرا تفریح کو چلیں ، میں
عرض کرتا کہ وحدت و عزلت سے نکال کر تنہائی کا
امن و سکون ختم کر کے آپ مجھ کو آفات و بلیّات
میں پھنسانا ، راستوں کی سیر و تفریح میں منہمک اور

رسالہ معارف، دسمبر ۱۹٦۷ء ۳۰۸، بحوالہ مقدمہ رسالہ" المسترشدین-

شہوات و خواہشات میں مبتلا کر دینا چاہتے ہیں ۔
حضرت جنید سے فرماتے چلے بھی چلو ، گھبراؤ نہیں ۔ میں
اُن کو ساتھ لے کر روانہ ہو جاتا ، اور عجب بات یہ
دیکھتا کہ راستے میں کوئی ناپسندیدہ چیز حائل ہی
نہ ہوتی ، جب ہم جنگل میں پہنچ کر کسی جگہ بیٹھ
جاتے تو فرماتے مجھ سے سوالات کرو ، میں عرض کرتا
میرے ذہن میں پوچھنے کے لیے کوئی سوال ہی نہیں
ہے ، فرماتے جو بھی دل میں آئے پوچھو ، پھر خود
سوالات کی بوچھار کر دیتے ، میں وہی سوالات اُن سے
پوچھتا ، وہ اُن کے برجستہ جواب دیتے ، اس کے بعد
وہ گھر لوٹتے اور ایک کتاب تیار کرلیتے ۔[1]

ادب و بیان میں حضرت محاسبی کا پایہ بہت بلند ہے ، جس کا اندازہ اُن کی تصانیف کتاب الرعایہ ، کتاب التوہم اور رسالہ المسترشدین سے لگایا جا سکتا ہے ۔

حضرت محاسبی کی زیادہ تر وجہ شہرت اُن کی تصوف پر تصانیف ہیں ، وہ اپنی تصوف کی کتابوں میں قران حکیم ، احادیث نبوی ، اقوال صحابہ رض اور اعمال سلف صالحین سے استدلال کرتے ہیں ، صوفیہ کی شطحیات اور فلسفیانہ بحثوں سے بالکل کنارہ کش رہتے ہیں اُن کے تصوف کا مرکز علم و عمل کی اصلاح مراقبۂ خداوندی ، نفس کے رذائل و خبائث سے پاکی حاصل کرنا

---

۱ ۔ رسالہ معارف ، دسمبر ۱۹۶۷ء ص ۴۰۸ ، بحوالہ حلیۃ الاولیا ، جلد ۱۰ ، ص ۷۴ ۔

قربِ الٰہی کے حصول کے طریقے ، یہ وہ امور ہیں جن کے گرد ان کا تصوف گھومتا ہے ۔

اگرچہ ابو نصر سراج طوسی کے بیان کے مطابق حارث محاسبی کا مکان عمدہ تھا ، اور وہ عمدہ لباس پہنتے تھے ، لیکن زہد کا یہ عالم تھا کہ بقول ابنِ خلکان وفات کے وقت وہ ایک ایک پیسے کے محتاج تھے ۔

جنید بغدادی جو حضرت محاسبی کے شاگرد رشید ہیں وہ حضرت حارث کی زاہدانہ زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ : ایک روز میں اپنے مکان کے دروازے پر بیٹھا ہوا تھا کہ حارث محاسبی میرے سامنے سے گزرے ، میں نے ان کے چہرے سے شدید بھوک کے آثار محسوس کیے ۔ اور ان سے عرض کیا کہ چچا جان! اگر آپ غریب خانے پر تشریف لے جا کر ماحضر تناول فرمالیں تو میری خوش نصیبی ہوگی ، حضرت حارث نے فرمایا کیا کچھ کھلاؤ گے ؟ میں نے عرض کیا کہ آپ کی خدمت تو میری سعادت کا باعث ہے ۔ پھر ہم دونوں گھر میں آئے ۔ میں اپنے چچا کے گھر سے جہاں انواع و اقسام کے کھانے اور طرح طرح کے میوے ہر وقت رہتے تھے ، ان میں سے عمدہ کھانے اور پھل لے کر آیا حضرت حارث نے ایک لقمہ اٹھا کر منہہ میں رکھا ، مگر چباتے رہے ، نگل نہ سکے اچانک کھڑے ہوگئے اور اور بغیر کچھ کہے سنے روانہ ہوگئے ۔

دوسرے دن پھر مجھ سے ملاقات ہوئی ، میں نے ان سے عرض کیا چچا جان! کل آپ نے میری درخواست قبول کر کے میرا دل

جوش کرکے پھر ناراض کر دیا انھوں نے جواب دیا میاں صاحبزادے! اس وقت مجھے شدید بھوک لگی ہوئی تھی ۔ اور میں نے کوشش بھی کی کہ تمھارے لائے ہوئے کھانوں میں سے کچھ کھالوں ۔ مگر خدائے تعالیٰ سے میرا یہ عہد ہے کہ: اگر کھانا مشتبہ ہوتا ہے تو اس کی بو میری قوت شامہ فوراً محسوس کرتی ہے ، پھر میں اس کھانے کو ہرگز نہیں کھا سکتا ، چناں چہ وہ لقمہ بھی جو میں نے کھایا تھا ، میں نگل نہیں سکا اور تمھاری دہلز میں ڈال دیا تھا ۔[1]

قشیری نے اس واقعہ میں اتنا اضافہ اور کیا ہے کہ: پھر حضرت جنید نے آن سے عرض کیا کہ اچھا آج اور سہی ۔ حارث آمادہ ہوگئے ، حضرت جنید نے گھر میں جو سوکھی روٹی کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے ۔ وہ سامنے رکھ دیے ، انھوں نے وہ کھائے ، اور فرمایا کہ جب کسی فقیر کے سامنے کھانا پیش کرو تو وہ ایسا ہی ہونا چاہیے ۔

ابن خلکان کا بیان ہے کہ حارث جب کسی کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتے اور اس میں کسی قسم کا شبہ ہوتا تو ان کی انگلیوں کی ایک رگ پھڑکنے لگتی اور وہ فوراً اس سے ہاتھ کھینچ لیتے ۔[2]

حضرت حارث کے ارشادات و ملفوظات حکمت و موعظت کا ایک خزینہ تھے ، ہم ان میں سے چند ملفوظات یہاں تبرکاً نقل کرتے ہیں ۔ فرماتے ہیں :

---

۱ ۔ رسالہ معارف ۔ دسمبر ۱۹۶۷ء ، ۱۱ ۔

۲۔ رسالہ معارف ۔ دسمبر ۱۹۶۷ء ، ص ۱۰ ۔

۱ - ہر چیز کا ایک جوہر ہوتا ہے ، انسان کا جوہر اس کی عقل ہے ، اور عقل کا جوہر توفیق خداوندی ہے ۔

۲ - خُلقِ حسن کا مطلب اذیت کو برداشت کرنا ، غصہ کم کرنا ، خندہ پیشانی اور میٹھے بول ہیں ۔

۳ - جس نے نعمتِ خداوندی کا شکر ادا نہ کیا ، اس نے بربادی کو خود ہی دعوت دی ۔

۴ - ہر زاہد کا زہد اس کی معرفت کے اعتبار سے ہوتا ہے ، اور معرفت، عقل کے اور عقل قوتِ ایمانی کے متناسب ہوتی ہے ۔

۵ - ظالم نادم ہوتا ہے ، خواہ لوگ اس کی مدح سرائی کریں ، مظلوم خوش رہتا ہے ، خواہ لوگ اس کی مذمت کریں ۔ قانع مال دار ہوتا ہے ، خواہ بھوکا رہے ، اور لالچی فقیر ہوتا ہے ، خواہ وہ خزانوں اور دولت کا مالک ہو جائے ۔

۶ - جب کوئی انسان صلاح و تقویٰ سے آراستہ ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو کی صلاح کا ذریعہ بنا دیتے ہیں ، اور جب کوئی انسان گمراہی میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو خلق کی گمراہی کا ذریعہ بنا دیتے ہیں ۔

۷ - دنیا کا خیال رہتے ہوئے اس سے کنارہ کش رہنا ، زاہدوں کا طریقہ ہے اور دنیا کو بالکل نسیاً منسیاً کر دینا عارفین کا مقام ہے ۔

---

۱ - رسالہ معارف ، دسمبر ۱۹۶۷ء ص ۳۱۰ ۔

۲ - رسالہ معارف ، دسمبر ۱۹۶۷ء ص ۳۱۱ ، بحوالہ وفیات ، جلد ۱ ، ص ۳۴۸ ۔

حضرت محاسبی صاحبِ تصانیفِ کثیرہ ہیں ۔ بعض لوگوں کی روایت کے مطابق آن کی تصانیف کی تعداد دو سو تک پہنچتی ہے ۔ آن میں سے بعض کتابوں کے نام یہ ہیں ۔

(۱) کتاب الرعایہ لحقوق اللہ عز و جل

(۲) کتاب الوہم (۳) رسالہ مسترشدین

ان کی یہ تینوں کتابیں طبع ہو چکی ہیں ۔

غیر مطبوعہ تصانیف میں آداب النفوس ، شرح المعرفہ ، البعث و النشور ، المسائل فی اعمال القلوب و الجوارح ۔ المسائل فی الزہد وغیرہ ، کتاب فی الدماء ، کتاب التفکر والاعتبار ، رسالہ الوصایا ، رسالہ المراقبہ وغیرہ مشہور ہیں ۔

حضرت حارث محاسبی کے ناقدین میں حضرت امام احمد بن حنبل محدث ابو زرعہ اور ابن العربی مالکی ہیں ۔ ابن عربی محاسبی کے قدر شناس بھی ہیں ، اور ناقد بھی ، انھوں نے جو تنقید حضرت حارث پر کی ہے ، وہ معتدل بھی ہے ، اور مفید بھی ۔

حضرت حارث محاسبی نے ۲۴۳ھ (۵۸-۸۵۷ء) میں بغداد میں وفات پائی ۔ خطیب اور ابن السبکی نے امام ابو ثور سے روایت کی ہے کہ میں حارث کی وفات کے وقت آن کے قریب موجود تھا ۔ انھوں نے فرمایا دیکھنا اگر عالمِ سکرات میں مجھے اچھا منظر نظر آیا تو میں ہنسوں گا ، ورنہ میرے چہرے پر بُرے آثار ظاہر ہوں گے ، ابو ثور کہتے ہیں کہ وہ عالم سکرات میں ہنسے اور وفات پا گئے ۔

نفحات الانس میں ہے کہ حضرت حارث بن اسد محاسبی کی

کنیت ابو عبداللہ ہے ۔ آپ صوفیہ کے طبقہ اول سے تعلق رکھتے ہیں ، صاحبِ تصانیف ہیں ، بغدادیوں کے استاد ہیں ، آپ اصل میں بصرے کے رہنے والے تھے ، لیکن بغداد میں آباد ہوگئے تھے ۔ امام احمد ابن حنبل کے دو سال بعد ۲۴۳ھ (۸۵۷-۵۸ء) میں آپ کا وصال ہوا ۔[1]

---

۱ ۔ حضرت حارث بن اسد محاسبی کے یہ حالات مقالہ مولانا سعید احمد پالنپوری ، دارلعلوم اشرفیہ راندیر ، رسالہ معارف ماہ دسمبر ۱۹٦۷ء ص ۵۰۳ تا ۴۲۳ سے ماخوذ ہیں ۔

۲ ۔ نفحات الانس (اردو ترجمہ) ص ۵۷ ۔

اشاریہ :

- اشخاص
- مقامات
- کتب

اشخاص

(ب)

(چ)

(ص)

مقامات

(ڈ)

(ر)

(ز)

(س)

(گ)

(ی)

کتب

الف ممدودہ

الف مقصورہ

(ب)

(ق)

(ک)

(گ)

(ل)

(ن)

غلط نامہ

ہم اپنے قارئین سے معذرت خواہ ہیں کہ اس کتاب میں طباعت کی بعض غلطیاں رہ گئیں ہیں جن کا صحت نامہ صفحہ و سطر کے حوالے کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲	۲۲	جوہر	جوہر
۹	۱	الاولیا	×
۱۲	۱۲	مار	کار
۲۱	۱۰	صل	صلی
۲۲		×	و حنین
۲۸		ردد	رود
۳۲	۱۰	بزگ	بزرگ
۳۳	۷	ملسینون	ماسینون
۴۱	۸	ور	اور
۴۴	۷	یہاں	×
۴۶	۱۷	اویز	آویز
۴۷	۳	×	فرمایا
۵۳	۵	ہچویری	ہجویری

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۵۷	۲۰	بالاتحرام	بالالتزام
۵۸	۱۷	خواجہ نظاالدین	نظام‌الدین
۶۱	۱۳	ساز و ساماں	ساز و سامان
۶۲	۱۷	ابتری	اسیری
۶۳	۱۲	نوبب	نوبت
۸۳	۲۰	بھرتی	پھرتی
۸۷	۲۱	ٹھا	تھا
۹۰	۵	پس چہ ماید کرد	پس چہ باید کرد
۹۰	۶	کلیم سنائی متعلق کے	حکیم سنائی کے متعلق
۹۱	۱۲	بجو	بجُوی
۹۲	۵	نغمات الانس	نفحات الانس
۹۷	۴-۵-۷-۸	تصرف	تصوف
۱۰۰	۸	سلاحبقہ	سلاجقہ
۱۰۳	۱	عطر	عطّار
۱۰۵	۲۲	غواضد	عوّاضد
۱۰۶	۲۰	ضائع	صنائع
۱۱۱	۵	سربرمتی	سرپرستی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۱۱	۱۳	خرقعہٗ	خرقہٗ
۱۱۳	٦	سرعظت	موعظت
۱۲۸	۵	سرکشی	سرکش
۱۳۰	۵	ہیں	وہیں
۱۳۹	۸	صاحب مثنوی	صاحب المثنوی
۱۳۹	۵	مروز	فروز
۱۴۹	۹	اندلشہ	اندیشہ
۱۵۰	۳	روح رومی و پردہا	روح روسی پردہا
۱۵۳	٦	مدرسہٗ مقدسہ	مدرسہ مقدسیہ
۱۵۴	۲۰	کلیم سینائی	حکیم سنائی
۱۵۷	۲۴	ازاد	آزاد
۱٦٦	۹	اب	آپ
۱۷۰	۷	فرقہ سجادہٗ تسبیخ	خرقہٗ و سجادہ و تسبیح
۱۷۱	۱	موضوع سخق	موضوع سخن
۱۷۱	۱۸	افہام و تفہیم لیے	افہام و تفہیم کے لیے
۱۷۱	۱۹	تشبیہو	تشبیہوں
۱۷۲	۷	حاصلی	حاصل

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۷۲	۱۴	جائے	جائیے
۱۷۲	۱۶	بشنو نےاز چو حکایت می کند	بشنواز نے چوں حکایت می کند
۱۷۲	۱۷	مشتمل	مشتمل ہے
۱۷۳	۲۰	تاریخ ایران	تاریخ ادبیاتِ ایران
۱۷۵	۳	مظامین	مضامین
۱۷۶	۱۵	جو	چو
۲۰۸	۱۶	در صف عشا نشینم	درصفِ عشاق نشینیم
۲۱۰	۱۳	نسبتیں	نخستیں
۲۲۱	۳	بگویم	بیگویم
۲۲۵	۹	کبیرالالیا	کبیرالاولیا
۲۳۶	٦	والد کا نام سید علی اور نانا کا نام سید عرب تھا	والد کا نام سید احمد اور دادا کا سید علی اور نانا کا نام سید عرب تھا
۲۳۶	۸	٦۳۰ھ (۱۲۳۳ء)	٦۳٦ھ (۱۲۳۸ء)
۲۵۰	۴	حضرت محبوب	حضرت محبوب الٰہی
۲۵۰	۱۲	داہا	دلھا
۲٦۱	۱۷	نمی دار	نمی دارد
۲٦۹	۱٦	سعید حسن	سید حسین

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۶۹	۱۷	سعید	سیّدا !
۲۹۲	۲۰	لن قرانی	لن ترانی
۳۰۰	۳	علیہ الوحمہ	علیہ الرحمہ
۳۱۹	۷	لطف عنایت	لطف و عنایت
۳۱۹	۲۱	فنح شاہ	فتح شاہ
۳۳۰	۱۹	علیہ الصلواۃ السلام	علیہ الصلوٰۃ و السلام
۳۵۳	۶	لخطہ	لحظہ
۳۵۵	۱۷	ناقدبن	ناقدین
۳۵۷	۱۳	حیکم	حکیم
۳۶۱	۲۳	مقیرے	مقبرے
۳۶۷	۲۱	نغریدہ	لغزیدہ
۳۸۷	۱۴	مستند	مسند
۴۲۳	۱۳	ہیبت خاں کی	ہیبت خاں ان کی
۴۲۳	۲۳	رسٹم	رستم
۴۳۳	۱۴	صابر	صابریہ
۴۳۵	۵	لذنی	لدنّی
۴۳۷	۶	پودی	بودی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴۳۷	۷	انقطے	منقطعے
۴۴۰	۱۳	تمرہتند	تمرہند
۴۴۲	۳	باقی کلمہ سے تھا ولولہ حق	باقی کلمہ فقر سے تھا ولولہ حق
۴۴۲	۶	ایک مضمون جس میں انھوں نے لکھا ۔	ایک مضمون تحریر کیا، جس میں انھوں نے لکھا
۴۴۴	۱۵	خواخہ	خواجہ
۴۷۶	۸	ترتبس	تزبتش
۵۱۳	۱۴	اوبنسہ	اوپنسیہ
۵۳۵	۱۵	قاقی	قاضی
۵۳۹	۷	جمعیت الحلما	جمعیت العلما
۵۳۹	۲۰	مختر	مختصر
۵۴۰	۱۲	علمانہ	عالمانہ
۵۴۴	۱۷	ابن عربی نظریۂ وحدت الوحود پر	ابن عربی کے نظریۂ وحدت الوجود پر

اقبال

کے

محبوب صوفیہ

اعجاز الحق قدوسی

اقبال اکادمی پاکستان